اُجالوں کی بستی میں

فاخرہ جبیں



جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل 2012

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... پرنٹ لائن

قیمت .... 400 روپے

سول ایجنٹ:

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار کراچی

اُجالوں کی بستی میں

رات نجانے کیسی قیامت گود میں لے کر آئی تھی۔ سرِ شام ہی پورب سے اٹھنے والا گرد کا طوفان یک لخت ہی ماحول کو سیاہ چادر اوڑھا گیا تھا۔ شائیں۔۔۔ شائیں چلتی منہ زور ہوا۔۔۔ درختوں کی ٹوٹی ٹہنیاں، دھڑ دھڑ بجتے دروازے اور کھڑکیاں۔

ابا میاں گھر پر نہ تھے۔ منی خالہ فکر مند اور وہ خود خوفزدہ ان کی ساڑھی کا پلّو مٹھی میں دبوچے صحن اور برآمدے سے چیزیں سمیٹنے میں لگی رہی۔ پانی کا مٹکا، کھونٹی سے لٹکتی ابا میاں کی واسکٹ۔ ان کا منجن، برآمدے کے تخت پر پڑی چند ایک کتابیں جو منی خالہ نے پڑھتے پڑھتے یوں ہی رکھ چھوڑی تھیں۔ اور اسی دوران انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ دروازے پر دستک ہوتی رہی۔ مسلسل، لگا تار۔

وہ اس طوفان سے خوفزدہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے چھوٹے کمرے میں ایک ہی پلنگ پر بیٹھی کپکپاتی رہیں۔ دیواریں، چھتیں، لرز رہی تھیں، بند کھڑکیوں کے تختے بجنے لگے تھے۔ طاق میں جلتے دیے کی لو کئی بار لرزی، اور پھر کوئی سہارا نہ پا کر یک دم بجھ گئی۔ وہ آنکھیں بھینچ کر منی خالہ کے بازوؤں میں گھس گئی تھی۔ دروازے کی جھریوں سے گرد آلود ہوا دبے پاؤں اندر آئی اور ہولے ہولے پھنکارنے لگی تھی، ایسے میں دستک کی آواز کہاں سنائی دیتی۔

پھر معلوم نہیں؟ کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ کمرے میں حبس اور گھٹن کی فراوانی ہوگئی۔ بند کھڑکی پہ جلترنگ سی بجنے لگی، تب منی خالہ اٹھیں۔ چراغ روشن کیا۔ ادھ جلی دیا سلائی ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھی جب اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ بارش کی ہلکی سی پھوار سیدھی اس کے چہرے پر آ کر پڑی تھی۔

''بارش۔۔۔'' اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا جب منی خالہ زور سے چونکیں۔ خود وہ بھی محتاط ہوئی۔

دروازے پر دستک۔۔۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر منی خالہ ہاتھ میں پکڑی دیا سلائی جھٹک کر دروازے کی طرف بھاگیں۔

''کون۔۔۔؟ کون۔۔۔؟'' انہوں نے عجلت میں پکارا۔

آسمان سے زمین تک تنی پانی کی چادر میں بھیگتی منی خالہ کو دیکھتے ہوئے وہ چراغ ہاتھوں میں لیے برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔

تب ہی منی خالہ نے دروازے کی کنڈی گرائی۔ دھاڑ سے دروازہ کھلا اور بارش میں بری طرح بھیگے ابا میاں لڑکھڑا کر دہلیز پار کر آئے۔ اندر آتے ہی انہوں نے کیسی سختی سے منی خالہ کو دھکا دیا تھا۔ وہ پھسل کر گرتے گرتے بچیں۔

ابا میاں مغرب کی نماز پڑھ کر سیدھے گھر آئے تھے۔ آندھی طوفان میں ان کی نحیف سی دستک دیوار پار سنائی ہی نہ دے پائی۔ وہ آوازیں دے دے کر تھک گئے، یہاں تک کہ ان کا حلق خشک ہو گیا۔ اور ہوا بڑی بے رحمی اور سفاکی سے مٹھیاں بھر بھر راکھ، ریت اور نہ جانے کیا کیا ان کی آنکھوں میں بھرتی چلی گئی۔ بارش کی تیز، نوکیلی بوچھاڑ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کی دیوانگی، انتہاؤں کو پہنچ گئی تھی۔

گالیاں، کوسنے، بین، بددعائیں، سیاہ برستے آسمان تلے، دونوں ہاتھ سر پر رکھے وہ چیختے چلاتے رہے۔ دل میں چھپا غم، غصہ کیسی کیسی حالت میں باہر نہ نکلا تھا۔ منی خالہ انہیں سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہو گئیں۔ اور وہ برآمدے کی دیوار سے چپکی کانپتی رہی۔

دھنا دھن برستا مینہ۔۔۔ ابا میاں کی دردناک آہ پکار۔۔۔ اف۔۔۔ رات کس قدر خوف ناک اور بھیانک تھی۔ اس پر بھی چین نہ آیا تو ابا میاں کلہاڑا لے کر جامن کے درخت پر پل پڑے۔ اس درخت پر جو اِن کے جوان بیٹے نے اپنے ہاتھوں لگایا تھا۔ اور جس کے پتوں کی سرسراہٹ میں انہیں اپنا بیٹا سانس لیتا سنائی دیتا تھا۔

''یہ سارے دکھ اسی نے دیے ہیں مجھے۔۔۔ یہ دربدری، یہ پائمالی، یہ ٹھوکریں سب اسی کی دین، بے رحم، پاپی، دھوکے باز، میرا کچھ خیال نہ کیا۔ مجھ بوڑھے کمینے کو اس عمر میں ذلیل کروا رہا ہے۔'' وہ کلہاڑے پر کلہاڑا چلا رہے تھے۔

''جڑ سے کاٹ دوں گا۔ کوئی نشانی نہ رہنے دوں گا۔ سارے عذاب میرے لیے، ساری صعوبتیں میرے لیے۔'' انہوں نے تھک کر کلہاڑا دور پھینکا اور اسی تنے سے لپٹ کر رونے لگے۔

بجلی بہت زور سے چمکی تھی۔ ابا میاں کا مسخ ہوتا چہرہ اور زخم آلود ہاتھ۔۔۔ وہ بس ایک جھلک ہی دیکھ پائی، منی خالہ، ابا میاں کو جیسے تیسے سہارا دے کر کمرے کی طرف لا رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ ہاتھ میں پکڑا چراغ اوندھا ہو گیا۔ لو بجھ گئی۔ سارا تیل بہہ گیا۔ وہ دیوار سے لگ کر سسکنے لگی۔

ابا میاں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کسی چیز سے ٹکرائے۔ چیخ و پکار آہ و بکا کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ منی خالہ ماچس کی ڈبیا لیے کمرے کی طرف بھاگیں، طاق میں رکھا دیا جلایا۔ باورچی خانے میں آ کر دودھ گرم کیا۔ کمرے میں گئیں تو ابا میاں نڈھال سے کھیس میں دبکے بیٹھے تھے۔ خلاف توقع خاموشی سے پیالہ ہاتھ میں لیا اور غٹا غٹ دودھ چڑھا گئے۔ منی خالہ نے پیالہ واپس لینے کو ہاتھ بڑھایا ہی

تھا کہ انہوں نے کھینچ کر دیوار کی جڑ میں دے مارا۔

''دفعان ہو جاؤ یہاں سے، جانتا ہوں کتنے خدمت گزار ہو تم سب؟''

وہ سسکیاں دباتی چھوٹے کمرے میں آ گئیں۔

''منی خالہ۔۔۔!'' اپنے پلنگ کی طرف جاتے جاتے وہ اس کی آواز سن کر پلٹیں۔

''نور! تم جاگ رہی ہو۔ سو جاؤ اب، ابا میاں بھی سو رہے ہیں۔'' انہوں نے قریب آ کر اسے بازوؤں میں سمیٹا، ماتھے پہ پیار کیا اور پھر سونے کا کہتے ہوئے اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گئیں۔

وہ چند لمحے ان کی پشت کو گھورتی رہی۔ اور پھر گہری سانس لے کر دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

''بے چاری منی خالہ!'' اسے کمرے میں وقفے وقفے سے ابھرتی سسکیاں سن کر منی خالہ پر ترس آنے لگا۔

''کتنی پریشان رہی ہیں خالہ۔۔۔ اور ابا میاں، انہیں کسی چیز کی پروا ہی نہیں اور پروا تو ماموں عاطف نے بھی کسی کی نہیں کی۔ حالانکہ وہ جانتے تھے ان کا غلط فیصلہ منی خالہ کی پوری زندگی برباد کر سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور خود باہر جا بیٹھے۔ اس بات کا اندازہ کیے بغیر کہ ان کا یہ غلط فیصلہ پیچھے رہ جانے والوں پر کس کس انداز میں عذاب بن کر اترا ہو گا۔ اور ہونا تو یہ ہی تھا۔ منی خالہ کسی کی منکوحہ ہونے کے باوجود ابھی تک اسی گھر میں ہیں۔ ان کا گھر بسنے سے پہلے اجڑ گیا۔ نہ کنواری ہیں نہ بیاہی۔ زندگی روگ بن گئی۔ یہ وٹے سٹے کی شادیاں۔ اوہ میرے اللہ۔۔۔ کوئی مجرم ہو نہ ہو، سزا کاٹنی پڑتی ہے بالکل ایسے ہی، جیسے منی خالہ کاٹ رہی ہیں۔''

اس نے ہتھیلیاں کھڑکی سے باہر نکال دیں۔

بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا، اب صرف ہلکی ہلکی پھوار تھی۔ جو بہت دیر سے اور مسلسل برس رہی تھی۔ جامن کے چوڑے پتوں پر بلند سروں میں بجتا ساز اب مدھم ہو گیا تھا۔ ہوا کا جھونکا بڑی دلیری سے کھڑکی کے راستے اندر آیا تھا۔ وہ کپکپا سی گئی۔ رات کافی بیت گئی تھی، اور ٹھنڈ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ آہستہ سے بند کیے اور پھر چپکے سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ نیند اس کی آنکھوں سے ابھی بھی بہت دور تھی۔

☆☆☆

منی خالہ زور سے ہنسی تھیں اور ان کی ہنسی کی جھنکار بہت دیر تک آنگن میں بکھری خاموشی میں گونجتی رہی۔ بڑی دیر سے کرسی پہ اونگھتی نور ذرا سا چونکی، گود میں پڑا گھٹیا سا ریڈیو اٹھا کر پلنگ پہ پھینکا اور زوردار انگڑائی لے کر کھڑکی پہ جھک آئی۔ منی خالہ کلیوں کے جھنڈ کے پاس بیٹھی تھیں۔ اور اپنی بقیہ ماندہ مسکراہٹ کو ہونٹوں کے گوشوں میں دبائے کاسنی ساڑھی کی سلوٹوں میں بکھری کلیوں کو سمیٹ رہی تھیں۔ چند ایک کلیاں ان کے دھلے دھلائے سلجھے ہوئے نیم خشک بالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اور اسے یقین تھا اب سے کچھ دیر پہلے یہ ساری کلیاں وامق بھائی کے ہاتھوں کے پیالے میں بھری ہوں گی۔ زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔ جواب بڑے بے نیاز بنے آنگن میں اتری چڑیوں کو باجرہ ڈال رہے تھے۔

"آہم۔۔۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے ہولے سے کھنکاری۔ منی خالہ ذرا سا چونکیں اور وامق بھائی نے گھبرا کر ہاتھ میں پکڑا سارا باجرہ چڑیوں کی طرف اچھال دیا۔ وہ ڈر کے مارے پھر سے اڑیں اور جامن کی شاخوں میں دبک کر شور مچانے لگیں۔

نور کھڑکی بند کر کے باہر نکل آئی۔ چھوٹا سا صحن دھل کر نکھرا ہوا موتیے، چنبیلی کی کلیوں سے مہک رہا تھا۔

"آپ نے تو ساری چڑیاں اڑا دیں وامق بھائی۔"

"نہیں۔۔۔ ساری چڑیاں تو نہیں اڑائیں۔" انہوں نے کن انکھیوں سے منی خالہ کو دیکھتے ہوئے متبسم لہجے میں کہا۔ وہ بوکھلا کر اٹھ گئیں۔

"تم نے ناشتا کیا؟ نہیں نا۔۔۔ میں گرم کرتی ہوں۔" وہ اپنا مہکتا وجود لیے اس کے قریب سے گزرتی چلی گئیں۔

"اور سناؤ نور القمر، کیسی گزر رہی ہے؟" وامق بھائی جامن کے خشک پتے کو ہاتھوں سے مسل رہے تھے۔

ان کے چہرے کی سنجیدگی اسے تنبیہ کر رہی تھی۔

"راز یوں عیاں نہیں کرتے۔"

وہ اپنے کمزور پڑنے پر خفت محسوس کرتی آگے بڑھ گئی۔

"ابا میاں کی دیوانگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم انہیں کسی ڈاکٹر کو۔۔۔" منی خالہ کی آواز جاتے جاتے اس کے کانوں میں پڑی۔ وامق بھائی سے مشورہ کر رہی تھیں۔

وہ جل کر خاک ہو گئی۔

"ہونہہ۔۔۔ ڈاکٹر کو دکھائیں، جیسے مفت میں دیکھنے آئے گا۔ اور یہ دیوانگی کم ہونے والی نہیں، یہ تو بڑھے گی اور بڑھتی ہی جائے گی۔ ہزار بار کہا عاطف ماموں کو خط لکھیں، پیغام بھجوائیں۔ سارا کیا دھرا ان ہی کا ہے۔ اور بھگتنے کو ہم۔۔۔"

جانتی تھی عاطف ماموں کا کوئی اتا پتا نہیں پھر بھی دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔ کبھی کبھار یونہی زیادہ چڑتی تو منی خالہ سے ہی الجھنے لگتی۔ اور تھا بھی کون۔۔۔؟ وہ چپ چاپ اس کی الٹی سیدھی بکواس سن لیتیں۔ اور جب وہ بھی میسر نہ ہوتیں تب وہ خود سے جھگڑتی۔ اب بھی باورچی خانے میں پھسکڑا مارے بڑبڑاتی رہی۔

"ڈاکٹروں کی فوج تو تیار کھڑی ہوگی۔ کب منی خالہ بلائیں اور کب وہ بھاگے چلے آئے۔ ہونہہ۔۔۔" اس نے سر جھٹکا۔

اور جب یہ بات ابا میاں تک پہنچی تو گھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، ہاں، بلاؤ ڈاکٹر کو۔۔۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ دیوانہ ہوں، دماغ الٹ گیا ہے۔ کراؤ علاج، زنجیروں سے جکڑ دو۔۔۔ بجلی کے جھٹکے لگواؤ۔ پاگل خانے میں چھوڑ کر آؤ۔ جان چھڑاؤ مجھ سے۔ میں ہوں ہی اسی قابل، کیا اوقات ہے میری، کیا حیثیت؟ بال بکھرائے، کرتا پھاڑے گلی میں نکل جاؤں تو بستی والے پتھر مارنے لگیں۔ آؤ لوگو آؤ! پتھر مارو۔ سنگ برساؤ، اصغر علی مہتاب، سابق ہیڈ ماسٹر، ایم

اے عربی، پر کچلے ہوئے وجود کو اور روند ڈالو، آؤ لوگو آؤ۔۔۔"

اسے معلوم تھا یہ ہی سب ہوگا۔ سو دروازے کی کنڈی چڑھائے، کانوں پہ ہاتھ رکھے۔ تکیے میں منہ دیے دبکی رہی۔

منی خالہ مجرم بنی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ صرف ایک ہی بات تو کہی انہوں نے۔

"ابا میاں آپ کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ اگر ڈاکٹر کو دکھا لیں تو۔۔۔" اور یہ جملہ مکمل ہونے سے قبل ابا میاں مشتعل ہوا اٹھے تھے۔ وہ بے چاری تھر تھر کانپتی واضح کرتی رہیں۔

"نہیں ابا میاں! ہرگز نہیں۔ میں نے کب کہا۔۔۔؟ آپ میرے قابل محترم، آپ میرے ابا میاں، میرے اپنے ابا۔ خدارا یوں مت کیجیے۔" وہ خود کو نوچنے کھسوٹنے لگے تو منی خالہ غم کے مارے بلکتی ہوئی ان سے جا لپٹیں۔

"میرے ابا۔۔۔ میرے اچھے پیارے ابا، کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔؟ سنبھل جائیے مجھ پر ترس کھائیے۔ میرا خیال کیجیے۔ آپ کی وہی منی ہوں، لاڈلی، پیاری منی۔ دیکھیے میری طرف معاف کر دیجیے۔ میری توبہ جو آئندہ بھولے سے بھی ایسی بات کی۔ آپ بیٹھ جائیے۔"

کن دقتوں سے انہیں پرسکون کیا تھا۔ خود منی خالہ کا اپنا وجود ہچکیوں سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر بتر، ابا میاں بے دم ہو کر چارپائی پر گر گئے۔

"تم۔۔۔ تم میرے لیے سب سے بڑی مصیبت ہو۔ میری جان کا عذاب، مجھے مرنے بھی نہیں دیتیں۔ میرا جینا بھی حرام۔۔۔ تمہارا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ یوں جان نہیں چھوڑو گی۔" جب تک منی خالہ ان کے لیے پانی لے کر آتیں وہ بغیر چپل کے گھر سے نکل گئے تھے۔

منی خالہ ان کے پیچھے لپکیں، مگر وہ بہت دور چلے جا رہے تھے۔ ننگے پاؤں، خاک اڑاتے۔

منی خالہ وہیں دہلیز پہ بیٹھ کر روتی رہیں۔

"ہائے! یہ گردش دوراں، کوئی اس کی زد سے بچا بھی ہے کہ نہیں۔ ایسی شان والے میرے ابا میاں اور کہاں یہ حالت۔۔۔" دل کٹا جا رہا تھا۔

اصغر علی مہتاب کا نام سن کر لوگ احتراماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ کم قیمت مگر صاف ستھرا لباس، تہذیب، شائستگی، عادات و اطوار، رعب داب، زیرک نگاہی۔۔۔ کون سی خوبی تھی جو ان کی شخصیت میں جمع ہونے سے رہ پائی ہو۔ ہاں مگر، اپنی ذات کے فخر سے باہر نہ نکل سکے۔ تمام عمر اپنا سوچا، اپنا چاہا، اولاد پر توجہ نہ دی۔ اکلوتا بیٹا اور وہ بھی آوارہ۔ کم عمری کی شادی سے نالاں۔۔۔ چھ، آٹھ سال بھگتائی اور پھر تین حرف بیوی کے نام لکھ کر سب سے دور، پرائے دیس جا بیٹھا۔ وٹے سٹے کی شادی تھی۔ منی خالہ بسنے سے پہلے اجڑ گئیں۔ سسرال والے رخصتی پر تو خیر راضی ہی نہ تھے طلاق پر بھی آمادہ نہ ہوتے۔ جیتے جی مار کر اپنے کلیجے میں لگی آگ ٹھنڈی کرنے کا یہ ہی طریقہ تھا۔

وقت نے اصغر علی مہتاب کو کمزور پڑتے دیکھا تو اس نے اور بھی کاری وار کر دیے، بیوی کی موت کا دکھ، بڑی بیٹی کی بیوگی اور پھر دائمی جدائی کا صدمہ، منی خالہ کے نہ بسنے کا غم، اور بیٹے کی طوطا چشمی کا عذاب، سماجی تنہائی اور معاشی دھچکوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ دل و دماغ لڑتے لڑتے بالآخر تھک گئے ہار گئے۔ ایک ایک کر کے سارے ہتھیار پھینک دیے۔ ہمت، حوصلہ، بہادری سب چھن

گیا۔ اور پیچھے خالی کشکول سا بے کار و کھوکھلا وجود رہ گیا تھا۔ جس میں بے بسی، لاچاری اور بے چارگی کے سکوں کی کھنک کے سوا کچھ نہ تھا۔

خبر نہیں کس چیز کی تلاش تھی، ابا میاں کو، کیا کھوجتے رہتے تھے؟ بے قراری حد سے سوا تھی۔ چین و اطمینان جانے کہاں رخصت کیے بیٹھے تھے۔ گھڑی گھڑی اٹھ کر برآمدوں، کمروں مین ٹہلنے لگتے۔ راہداری ان کے بوڑھے قدموں کی مضطرب آواز سے گونجتی رہتی۔ اپنے کمرے میں ہوتے تو الماریوں، صندوقوں کو کھنگالتے رہتے۔ کبھی چت لیٹ جاتے تو کبھی نگاہیں فضا میں کچھ کھوجتی رہتیں۔ ہر دوسرے لمحے منی خالہ کو پکارتے، چائے کی فرمائش ہوتی۔ سارا دن پیالیاں بھر بھر چائے پیتے اور پھر رات کو کھری چارپائی پر بیٹھے بڑبڑاتے رہتے۔ کروٹیں بدلنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ چارپائی کی چرچراہٹ سے نور القمر کی نیند بار بار اکھڑ جاتی۔

''اف۔۔۔ یہ ابا میاں سو کیوں نہیں جاتے؟'' وہ گردن اٹھا کر انہیں دیکھتی پھر سونے کی کوشش کرنے لگتی۔

منی خالہ کی کھلی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی رہتیں۔ جب تک ابا میاں نہ سو جاتے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا آنا محال تھا۔ صبح کو نور کمرے میں گھس کر دن چڑھے تک اپنی نیند پوری کرتی رہتی۔ اور سودا سلف کو پوچھنے کے لیے آئے ہوئے وامق بھائی، منی خالہ کی خمار آلود سرخ آنکھوں کو دیکھ کر کلیاں مسل مسل کر پھینکتے رہتے۔

اور پھر ایک شام ابا میاں کی بے چینی و بے قراری کا یہ عقدہ بھی حل ہو ہی گیا۔ نور القمر نے بالٹیاں بھر بھر پانی صحن میں بہایا تھا۔ اور اب کلیوں کے جھنڈ کے آس پاس بکھری تازہ کلیاں چن رہی تھیں۔ خوشبو سے معطر اس بھیگی ہوئی شام میں جب شفق کے تمام رنگ گھر کے در و دیوار پہ اترے ہوئے تھے، منی خالہ سفید ساڑھی پہن کر باہر آئیں تو وہ انہیں ٹوکے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ سفید رنگ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ منی خالہ! آپ اس ساڑھی کو دھنک رنگوں میں کیوں نہیں رنگ لیتیں۔ سچ، آپ پر بہت جچیں گے یہ ساتوں رنگ۔''

منی خالہ جواب میں مسکرا کے رہ گئی تھیں۔ بتا ہی نہ سکیں کہ جب وہ سفید رنگ پہنتی ہیں تو کسی کی آنکھوں کی چمک چاندنی کی پھوار بن کر ان پر برسنے لگتی ہے۔ تن من بھگو ڈالتی ہے۔ اور جب جب ان کے وجود میں صحرا اگنے لگتا ہے وہ یہ سفید ساڑھی ضرور پہنتی ہیں۔

''مجھے ساڑھی بہت پسند ہے۔ لیکن اچھی صرف آپ پر لگتی ہے۔ میں پہنوں تو شاید عجوبہ لگنے لگوں۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اماں کے صندوق بھرے ہوئے تھے، نت نئی ساڑھیوں سے۔'' منی خالہ بتانے لگیں۔

''خود وہ ہمیشہ دو چار میں ہی گزارا کرتی رہیں۔ بنگال سے آئی تھیں۔ کبھی کوئی اور لباس میں نے ان کے وجود پہ سجا نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بعد سب کی سب ساڑھیاں میرے ہی کام آئیں۔''

انہوں نے دو چار بل دے کر بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا تھا۔ نور القمر نے اٹھ کر اس پہ کلیاں سجا دیں۔ گجرا بنا کر ان کے بازوؤں میں ڈالا۔ خود پہننے لگی تو اچھا نہ لگا یونہی چارپائی پہ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

تب ہی وامق بھائی دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئے۔

''کوئی سودا سلف منگوانا ہو تو۔۔۔'' ایک دیوار کا ہی فاصلہ تھا۔ بازار جانا ہوتا تو ادھر کا چکر ضرور لگاتے تھے۔

نور القمر نے مڑ کر دیکھا۔ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور دروازے میں رک گئے تھے۔

''اندر آ جائیے نا۔۔۔'' اس کے پکارنے پر وہ چونکے۔ پھر حسب عادت چند ایک کلیاں توڑنے لگے۔

''سنا ہے، جس گھر میں کلیاں ہوں وہاں سفید تتلی ضرور آتی ہے۔''

وہ پانی کا چھڑکاؤ کر رہی تھی کیاری میں۔ ان کی بات سن کر قدرے حیران ہوئی۔

''اچھا۔۔۔ لیکن ہمارے ہاں تو کبھی نہیں آئی، مطلب میں نے کبھی نہیں دیکھی سفید تتلی۔''

''کمال ہے تم نے نہیں دیکھی۔'' ان کا لہجہ شریر تھا۔ وہ پلٹ کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''ہاں تو اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟'' وہ اپنا مذاق اڑائے جانے پر قدرے ناراض سی ہو گئی۔

''نہیں تو۔۔۔ تم سے کس نے کہا میں ہنس رہا ہوں۔ اچھا جاؤ تھیلا لے کر آؤ۔ میں سبزی لا دیتا ہوں۔'' ان کی ہتھیلی بھر گئی تھی کلیوں سے۔

نور نے جاتے جاتے اپنے ہاتھوں میں جمع کلیاں بھی ان کی چوڑی ہتھیلی پہ انڈیل دیں۔

منی خالہ جامن کے درخت تلے کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ اور ان دونوں کی باتوں پر ابھی بھی ہولے ہولے مسکرا رہی تھیں۔

''کون سی سبزی منگوائیں خالہ!'' وہ باورچی خانے سے تھیلا لے کر لوٹی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ وامق بھائی موجود نہ تھے۔ اور منی خالہ اپنے وجود پہ بکھری کلیاں سمیٹ رہی تھیں۔

''وامق بھائی چلے گئے؟''

''ہاں۔۔۔ کہہ رہے تھے بازار میں بہت تھیلے ہیں۔''

''ارے تو میں کیا بے وقوف تھی۔ جو اس کو ڈھونڈنے میں ہلکان ہوتی رہی۔'' وہ چڑ کر بولی۔ منی خالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کپڑے کا تھیلا گول مول کر کے ایک طرف اچھالا اور کمرے میں آ کر ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

بیرونی دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ابا میاں اندر آ رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک قطعی اجنبی، انجانی صورت کو دیکھ کر وہ فوراً باہر نکلی۔

منی خالہ بے خبر بیٹھی کرسی جھلا رہی تھیں۔ بند آنکھیں، گلابی ہونٹوں پہ سجی مدھر مسکان، جوڑا ڈھلک کر کندھے پہ آ رہا تھا۔ گود میں دھری کلیوں کو اپنی پوروں سے چھوتے ہوئے وہ جانے کن خیالوں میں گم تھیں۔

ابا میاں اور اجنبی بالکل سر پر پہنچ گئے تھے اور وہ جوں کی توں انجان، بے خبر نور القمر نے آنے والے کی طرف دیکھا۔ جو ابا میاں کی موجودگی سے بے نیاز منی خالہ پہ نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ وہ لپک کر منی خالہ کی طرف بڑھی اور اگلے ہی پل انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور

پھر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سیاہ بال کھل کر بکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا پلّو سر پہ ڈالتے ہوئے ان کی نگاہ آنے والے پر پڑی تو ہاتھ وہیں ساکت رہ گیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اس کے چہرے پہ آ کر ٹھہر سی گئی تھیں۔

حیرت۔۔۔ شدید حیرت۔۔۔ ان کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔

''نور! کرسی لے کر آؤ۔'' ابا میاں پکارے۔

''بیٹھو میاں، تب تک یہیں بیٹھو۔'' ابا میاں بچھے جا رہے تھے۔

گہری بھرپور نظر منی خالہ پر سے ہٹا کر آنے والا وہیں چارپائی پہ ٹک گیا تھا۔

نور نے کرسی اٹھا کر چارپائی کے برابر رکھ دی۔ ابا میاں مہمان کو کرسی پہ بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ وہ انکار کر کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''نور! اپنی خالہ سے کہو، چائے تیار کر لے۔ وامق کو چائے کا سامان لینے بھیجا ہے۔ وہ آتا ہی ہوگا۔''

ابا میاں کے عقب میں کھڑی نور نے منی خالہ کو دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ساکت کھڑی تھیں۔ ان کی ساڑھی کا عکس چہرے پر اتنا گہرا تھا کہ بالکل سفید ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

''افوہ، ہزار بار کہا ہے سفید رنگ مت پہنا کریں۔'' اس نے جھنجھلا کر انہیں ہلایا۔

وہ چونک کر اس کی طرف پلٹیں اور پھر بات سنے بغیر وہاں سے چل دیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے لپکی۔

''ابا میاں نے چائے بنانے کو بولا ہے۔ سامان بھی وامق بھائی سے کہہ کر خود ہی منگوالیا، کوئی خاص مہمان لگتا ہے۔ آپ جانتی ہیں انہیں۔۔۔؟ آج سے پہلے تو کبھی انہیں نہیں دیکھا۔''

وہ مارے اشتیاق کے ان کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں آ گئی۔ منی خالہ پیڑھی پہ بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھیں۔ انہیں اس قدر سستی برتتے دیکھ کر اس نے خود ہی آگ جلا کر چائے کا پانی اوپر رکھ دیا۔

''افوہ۔۔۔ اس طرح سے کیوں بیٹھی ہیں؟ بتاتی کیوں نہیں، کون صاحب ہیں یہ؟ ابا میاں اتنے خوش۔ لگتا ہے اتنے دنوں سے ان ہی کا انتظار تھا۔ اب کیسے چین اور سکون سے بیٹھے ہیں۔'' وہ خود ہی بولتی رہی۔ منی خالہ نے پانی کا گلاس مانگا اور غٹاغٹ چڑھا گئیں۔ ابا میاں شاپر ان کے سامنے ڈال گئے۔ انواع اقسام چیزوں سے بھرا۔۔۔ خوشبودار بسکٹ، تازہ پیسٹریاں، خستہ پکوڑے۔۔۔''

اس کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ ''آج تو اپنی بھی عید ہوگئی۔''

بڑی سی ٹرے سجا کر مہمان خانے میں رکھ آئی۔ ابا میاں کو بتا دیا وہ مہمان کو لے کر وہیں چلے آئے۔ وہ باورچی خانے میں آ گئی۔ منی خالہ ابھی تک گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھیں وہ اپنے لیے بچا کر رکھی پیسٹری کھانے لگی، مزے مزے سے۔ منی خالہ کو بھی اصرار کیا مگر انہوں نے منہ پھیر کر انکار کر دیا۔

ذرا دیر بعد وہ ابا میاں کا پیغام لے آئی۔

''کہہ رہے ہیں اوپر کا کمرا صاف کرو۔ لگتا ہے، مہمان کچھ دن یہاں رہے گا۔ ہائے مگر یہ کون۔۔۔؟ کیا ہمارا کوئی رشتے دار؟ منی خالہ آپ ابا میاں سے پوچھ لیں۔'' اسے تجسس ہو رہا تھا۔ منی

خالہ نے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا پھر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''بھابھی کے بھیا ہیں یہ۔۔۔'' کسی کنوئیں میں سے آواز نکلی تھی ان کی۔

''ہائیں۔۔۔ کون سی بھابھی کے بھیا؟'' وہ سب فراموش کیے بیٹھی تھی۔ یک لخت چونکی۔

''آپ کی بھابھی کے بھیا۔۔۔؟ یعنی رفعت ممانی کے بھیا، اوہ، اوہ یعنی اطہر خالو۔۔۔ آپ کے میاں!'' وہ آنکھیں پھاڑے انہیں گھٹنوں پہ سر گراتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک عرصے سے بند ادھوری داستان کی کتاب دوبارہ کھل گئی تھی۔ گزشتہ اوراق پر جمی دھول کو ہٹانے یا گم گشتہ ابواب کو ڈھونڈنے کی کوشش کسی نے نہ کی تھی۔ اور ضرورت بھی کیا تھی؟

اس کہانی کا ایک آخری باب ہی تو رقم ہونا تھا۔ پھر کیا ضروری تھا کہ ابتدائی صفحات میں دفن مردہ تتلیوں کے بے رنگ پروں سے گواہی طلب کی جاتی۔ یا ساکن حروف پہ چپکے، خوشبو سے عاری، سیاہ پڑتے پھولوں کی بھربھری پتیوں سے پوچھا جاتا کہ۔

اس کہانی کے ادھورا چھوڑے جانے پر احساس زیاں کس کردار پر حاوی رہا۔

اجلی چاندی سے بھری راتوں پر آنسوؤں سے شکوے کس نے کاڑھے۔

گرمی کی لمبی دوپہروں میں من کے جنگل میں کون کوئل بن کر کوکا؟

برفاب رتوں میں منجمد ہوتے خوابوں کو گرمانے کے لیے کن آنکھوں نے اپنی نیند بے خوابی کے دہلتے الاؤ میں جھونک ڈالی؟

اور۔۔۔

مردہ ہوتے جذبات کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے حلق میں اپنے من کا قطرہ قطرہ لہو کس نے ٹپکایا۔

یہ سب سوال بے معنی تھے۔ بے جواز، غیر ضروری۔

اہم تھا تو صرف یہ کہ کہانی اختتام پذیر ہونے کو تھی۔ انتظار کی سولی پہ لٹکتے کردار اپنے انجام کو پہنچنے والے تھے۔

لیکن اس کہانی کے ادھورے پن سے جو ایک نئی کہانی جنم لے چکی تھی، وہ۔۔۔؟

''منی خالہ!'' نور القمر نے زور سے پکارا تھا۔ خود میں الجھی کھوئی منی خالہ جی جان سے لرز گئیں۔ وہ دھپ سے ان کے قریب آ بیٹھی۔

''اف۔۔۔ منی خالہ! اتنے پیارے ہیں اطہر خالو کہ بس کیا ہی کہیے۔۔۔ سفید کرتا پاجامہ اتنا جچتا ہے ان کے لمبے چوڑے قد پر۔ بولنے میں رکھ رکھاؤ میں، بلکہ ان کے تو دیکھنے میں بھی ایک ادا ہے۔ شہزادے لگتے ہیں پورے شہزادے۔۔۔''

انہوں نے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔ وہ بہت پرجوش نظر آ رہی تھی۔ ابا میاں اور وامق بھائی کے بعد وہ تیسرے مرد تھے جنہیں اس نے قریب سے دیکھا تھا۔ شام سے ان کی آؤ بھگت میں مصروف تھی۔ اوپر کا کمرا دھو کر صاف کیا۔ پلنگ نئے سرے سے کس کر اس پہ سب سے اچھی چادر بچھائی۔ پانی کا کولر، ٹائم پیس۔۔۔ رات کو پہننے کے لیے چپل ایک ایک چیز کا دھیان رکھا۔

رات کا کھانا بھی اسی نے پکایا۔ گوشت اور فرنی۔

منی خالہ نے کہہ دیا تھا۔ ''طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''صاف کہیں، خالو سے چھپ رہی ہیں۔'' وہ آتے جاتے انہیں چھیڑ رہی تھی۔

کھانا کھا کر خالو آرام کرنے اوپر چلے گئے۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا دل نہ چاہا کمرے میں سونے کو۔ پلنگ باہر بچھالیا۔ ذرا دیر بعد وہ نیچے آگئے۔ پیاس لگی تھی اور کمرے میں بہت اندھیرا۔ ابا میاں بگڑنے لگے۔

''چراغ کیوں نہیں جلایا اوپر۔۔۔''

غلطی نور کی تھی بھاگ کر دوسرے کمرے میں چھپ گئی۔

''گھر آئے مہمانوں کی یہ عزت ہے کہ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔''

ابا میاں کی گھن گرج، ایسے عالم میں نور باہر نکلتی۔ ناممکن تھا۔ منی خالہ نے اٹھ کر دیا جلایا اور لے کر اوپر چڑھ گئیں۔

''بجلی نہیں ہے گھر میں؟'' خالو پوچھ رہے تھے۔

''اندھیروں کے مسافر ہیں میاں! ہمیں روشنی اچھی نہیں لگتی۔ یہ ننھے منے چراغ ضرورت پوری کر دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی ہمیں چاہ نہیں۔''

ابا میاں کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ نور کچھ دیر بعد ڈرتے ڈرتے نکلی اور اپنے کمرے میں گھس گئی۔ تب ہی ٹھک سے دروازہ کھول کر منی خالہ اندر آگئیں۔ برہم سا انداز تھا۔ بالوں کی لٹیں چہرے پہ آرہی تھیں۔ کلائی سے ایک گجرا غائب، آتے ہی بیڈ پہ گر گئیں۔

''کیا ہوا؟'' وہ پریشان سی ان کی طرف بڑھی۔

''کچھ نہیں۔۔۔ نیند آرہی ہے۔'' ہموار لہجہ۔۔۔ پرسکون آواز۔۔۔

اس نے سکھ کا سانس لیا اور کھڑکی میں آبیٹھی۔ روز کا معمول تھا مگر منی خالہ پتا نہیں کیوں بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔ کروٹ پہ کروٹ بدلنے کے بعد وہ اپنے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔

''کیوں کھول رکھی ہے کھڑکی۔۔۔؟ کب بند کرو گی۔۔۔؟''

''کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔۔'' وہ دوبارہ لیٹ گئیں۔ پلو منہ پہ ڈال لیا۔

نور کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ اوپر خالو کے کمرے میں چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ دودھیا چاندنی، پورے چاند کا حسن، وہ بہت دیر تک کھڑکی میں بیٹھنے کے بعد لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد نیم غنودگی کے عالم میں اس نے بانسری کی آواز سنی۔ دل کو چھو لینے والی مدھم۔۔۔ غم زدہ سی لے۔

سر اٹھا کر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اوپر چھت کی چھوٹی سی دیوار سے ٹیک لگائے اطہر خالو کھڑے تھے۔ بانسری پر ان کی انگلیاں دھیرے دھیرے تھرک رہی تھیں۔ رات کے دوسرے پہر میں چلنے والی ہوا سے ان کا ملبوس دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ بہت بڑا سا، روشن چمکتا ہوا پورا چاند ان کے بہت نزدیک تھا تھال بھر بھر چاندنی ان پہ لٹا رہا تھا۔ نور نے گردن گھما کر دیکھا۔

''منی خالہ کتنی جلدی سو گئیں۔۔۔ ورنہ وہ بھی سنتیں، خالو بانسری کتنی اچھی بجاتے ہیں۔''

اس نے تکیے پہ سر رکھ دیا۔ یہ بانسری عاطف ماموں کی تھی۔ نجانے اوپر کمرے میں انہوں نے کہاں سے ڈھونڈ لی تھی۔

اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہونے لگی تھیں۔ مگر سونے سے ایک لمحہ پہلے تک اس کے کانوں میں بانسری کی آواز رس گھولتی رہی تھی۔ اس کے بے خبر ہوتے ہی منی خالہ کا پلنگ چرچرایا تھا۔ دھیرے سے اٹھ کر وہ کھڑکی تک آئیں اور آہستگی سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ پھر دیوار سے لگ کر ہولے ہولے سسکنے لگی تھیں۔

باہر رات بھیگ رہی تھی اور بانسری کی دردناک لے اس کہانی کے دو کرداروں کی المیہ داستان سناتی جا رہی تھی۔ یہ رات۔۔۔ آج کی رات۔۔۔ دو جانوں پر بہت بھاری تھی۔

☆☆☆

اور منی خالہ اس گھر سے رخصت ہو گئیں۔

وہ بھی اس طرح کہ ان کے جانے کے بعد نور القمر پاؤں پٹخ پٹخ کر روتی رہی۔

''اس گھر کا ہر کام ہی نرالا، ہر رسم انوکھی۔ ہر رواج بے ڈھنگا، لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں، بارات آتی ہے۔ بینڈ باجا بجتا ہے۔ ڈھول ڈھمکا ہوتا ہے۔ یہاں وہی بے رونقی ہی بے رونقی۔ ڈھولک کی تھاپ سننی بھی نصیب نہیں۔'' وہ بلند آواز میں بڑبڑاتی رہی۔ مگر وہاں تھا ہی کون جو اس کی سنتا۔

خالی ویران گھر اور وہ خود۔۔۔ نور القمر۔۔۔ کلیوں کے جھنڈ کے پاس بیٹھی اپنے آنسو خود ہی پونچھتی جا رہی تھی۔ وامق بھائی کی اماں نے خالہ کو رخصت کرنے کے بعد پلٹ کر نہ دیکھا۔ ابا میاں باہر سے ہی کہیں اور چل دیے۔ وہ تنہا بیٹھی گزری چند گھڑیوں کو سوچتی رہی۔

صبح سویرے ہی ابا میاں نے ''حکم نامہ'' جاری کر دیا تھا۔

''منی کا سوٹ کیس تیار کردو۔'' وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ منی خالہ کو بخار تھا۔ بے سدھ پڑی تھیں۔ کچھ کہنا چاہا مگر ابا میاں کی سرخ آنکھوں میں غصہ انگڑائیاں لینے لگا۔

''پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے بے وقوف لڑکی! اب مزید دیر مت کرو۔''

ایسا سخت لہجہ وہ کچھ بولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ روتی دھوتی سوٹ کیس تیار کرنے لگی۔ منی خالہ بند ہوتی آنکھوں سمیت غسل خانے میں جا چھپیں۔ وہ پیٹیوں، صندوقوں میں گھسی ساری اچھی اچھی چیزیں نکال کر ان کے سوٹ کیس میں بھرتی گئی، یہ چیزیں کسی زمانے میں ان کے جہیز کے لیے ہی بنی تھیں۔

منی خالہ نہا کر آئیں تو ان کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں گلابی اور رنگت سپید ہو رہی تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر سیاہ بارڈر والی سرخ ساڑھی نکال کر انہیں دی۔ سرخ چوڑیاں پہنائیں، پھر گجرا بنانے باہر آگئی۔ صحن میں خالو جامن تلے کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ ہلکا آسمانی کرتا، سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ گھنے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلاتے، کھڑے نقوش والے، سونی جاگی آنکھوں والے خالو کل سے بڑھ کر اچھے لگ رہے تھے۔

''کیسے بانکے سجیلے ہیں میرے خالو، چھیل چھبیلے۔ میں تو بانکے خالو کہا کروں گی۔ باقی سب کے لیے ہوں گے اطہر۔'' وہ منی خالہ کو بہلانے کا سامان کرتی رہی۔ گجرا پہنانے والی تھی کہ انہوں نے زور

سے ہاتھ جھٹک دیا۔ یوں جیسے کوئی سانپ ان کی کلائی سے لپٹا رہی ہو۔

''کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے دیکھا۔

''نہیں، مت پہناؤ۔۔۔'' انہوں نے گجرے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور اچھال دیے تھے۔ پھر اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ذرا سا لڑکھڑائیں، پھر سیاہ چپل پیروں میں ڈال لی۔

''کہہ دو۔۔ میں چلنے کو تیار ہوں۔'' وہ جو ہاتھ میں کاجل لیے بیٹھی تھی۔ ان کے تیوروں سے خوفزدہ ہو کر باہر بھاگی۔

''خالہ تیار ہیں۔'' ابا میاں اور خالو دونوں ایک ساتھ چونکے تھے، اس کی بات سن کر۔

''وامق سے کہہ کر آؤ، تانگہ لے آئے۔'' ابا میاں نجانے کس وجہ سے اتنا تھک گئے تھے کہ اب اٹھنے کی ہمت خود میں نہ پا رہے تھے۔ وہ اپنی سسکیاں دباتی باہر بھاگ آئی۔ وامق بھائی کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ سیدھی اندر آ گئی۔

''وہ کون سا ایسا دن تھا جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا، آپ نے میری پروا ہی نہیں کی ورنہ۔۔۔'' وامق بھائی نہ جانے کس بات پر خفا ہو رہے تھے۔

''وہ کسی کی امانت تھی۔''

''وہ بھولے بیٹھے تھے اسے، آپ کی ضد نے یہ دن دکھایا کہ اسے کسی فالتو سامان کی طرح۔۔۔''

وامق بھائی کی بلند ہوتی آواز سے سہم کر وہ بے اختیار انہیں پکار بیٹھی۔

''وامق بھائی!'' اس کے ساتھ ہی کمرے میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔

اس نے ابا میاں کا پیغام پہنچا دیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ نڈھال سے چارپائی پر گر گئے تھے۔

وہ کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ تب وہ یک دم اٹھے اور اٹھ کر باہر نکل گئے۔ ان کی اماں اسے ساتھ لگائے گھر آ گئیں۔

پھر تانگہ آنے اور منی خالہ کو رخصت کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ نور آخری وقت میں منی خالہ سے گلے لگ کر ملنا چاہتی تھی۔ مگر انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ وامق بھائی اسے کہیں نظر نہ آئے تھے۔ ان کی اماں آج منی خالہ پر بہت مہربان تھیں۔ ہزار دعاؤں سے انہیں نوازتی تانگے پر بٹھا آئیں۔

وہ دہلیز پہ کھڑی اس وقت تک انہیں تکتی رہیں جب تک تانگہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا۔ پھر پلٹ کر دیکھا، خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

جامن کی شاخوں میں دبکی چڑیاں اداس اور خاموش تھیں۔ کلیاں مرجھائی ہوئی، اسے اور کچھ نہیں سوجھا تو کلیوں کے جھنڈ کے پاس بیٹھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

''سنو نور القمر! تم اپنی ماں کے ساتھ مر کیوں نہ گئیں؟''

''ہائیں۔۔۔'' نیند میں اِدھر اُدھر ڈولتی نور نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ ابا میاں چھت پہ نظریں جمائے بڑے آرام سے کہہ رہے تھے۔

''ہاں ہاں مر جاتیں تو اچھا ہوتا۔۔۔ میرے لیے جینا آسان ہو جاتا۔ اب تو تم ایک مصیبت ہو

میرے لیے۔ جان کا عذاب۔۔۔ تمہاری ماں کا دکھ سہہ لیا تھا۔ تم پہ بھی فاتحہ پڑھ لیتے۔'' ان کے لیے گویا یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔

نور القمر روہانسی ہو گئی۔ برا ہوا جو کمرے میں اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہو کر یہاں ابا میاں کے کمرے میں آ بیٹھی۔

''اب ایسی باتیں سننے کو ملیں گی۔'' اس کا جی اچاٹ ہو گیا اس کمرے سے۔

''اور اتنے سال جی کر بھی تم نے کیا کمال کیا؟ الٹا فکریں ہی لاد دیں میرے کاندھوں پر۔'' اس کا دل چاہا پوچھے۔

''آپ نے کبھی میری طرف دیکھا تک نہیں۔ کپڑا، لتا، کھانا، پینا۔ ہر چیز کا خیال منی خالہ نے رکھا۔ پھر میں نے کون سی فکریں لاد دیں آپ کے کاندھوں پر، یہ نہیں کہ مرحومہ بیٹی کی نشانی سمجھ کر گلے سے لگا لیں، الٹا مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ چپکے سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگی۔

''یہ زندگی کچھ نہیں دیتی انسان کو۔ سوائے ذلت و رسوائی کے۔ یہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتی ہے اور پھر وہاں سے دھکا دے دیتی ہے۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ صرف موت کی آرزو کر سکتا ہے۔ اپنی بھی، اور اپنے پیاروں کی موت کی آرزو، اسی لیے کہتا ہوں تم بھی مر جاتیں۔ میرا بھلا ہو جاتا۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بول رہے تھے۔

''نہیں مری تو اب مر جاؤں گی۔۔۔ آپ کی یہ باتیں کتنے دن جینے دیں گی مجھے۔۔۔''

وہ اٹھ کر باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی مگر ابا میاں نے درمیان میں ہی ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا۔

''یہاں بیٹھو۔۔۔'' انہوں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کے لیے بھی جگہ بنائی۔

''خفا ہو مجھ سے۔۔۔؟'' وہ ان کے پاس بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے دونوں ہاتھ دیکھنے لگی۔ ابھی جو وہ کوئی چھری، چاقو گھونپ دیتے اس کے پیٹ میں تو وہ کیا کر لیتی۔

ابا میاں کو جانے کیسے خبر ہو گئی اس کے خدشوں کی، ذرا سا ہنس دیے۔

''ڈرتی ہو مجھ سے۔ پگلی نا ہو تو۔۔۔'' ابا میاں ہنس رہے تھے۔

''کہیں دوبارہ تو دورہ نہیں پڑنے والا۔۔۔'' وہ سہمی بیٹھی تھی۔ ابا میاں دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے اسے دیکھتے رہے پھر پیشانی چوم لی، اس کے لیے حیران کن لمحہ تھا۔

''یہ۔۔۔''

''ابا میاں نیند میں ہیں۔ یا بالکل ہی دماغ الٹ گیا ہے۔''

''تمہاری ماں بھی تمہارے جیسی ہی تھی۔ بدمزاج، نک چڑھی، نخریلی، اور تمہاری نانی کہا کرتی تھیں۔ اصغر علی مہتاب! آپ کے لاڈ پیار نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔''

''لو جی کبھی بات تو کی نہیں مجھ سے۔ اور بنا دیا نک چڑھی، نخریلی اور بدمزاج۔'' وہ چڑ گئی۔ ابا میاں اس کی بے چینی بھانپ گئے تھے۔

''نور القمر! میرے لیے صحن میں چارپائی بچھا دو۔ آج یہاں نیند نہیں آنے کی۔'' وہ اٹھ کر اپنے

جوتے تلاش کرنے لگے۔

''اب یہ ستائیں گے مجھے۔'' وہ بددلی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ ابا میاں کے لیے چار پائی بچھائی۔ بستر لگایا اور خود کمرے میں آ گئی۔

''منی خالہ کی جدائی نے تو چند دنوں میں بھلا چنگا کر دیا ابا میاں کو۔'' اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ پھر جلد ہی اسے نیند آ گئی۔ گہری اور پرسکون نیند۔

صبح آنکھ کھلتے ہی منی خالہ کے پلنگ کی طرف نگاہ اٹھی۔ حسب معمول خالی تھا۔ وہ گہری سانس لیتے اٹھ گئی۔ ابا میاں کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔ دیر ہو جاتی تو پھر الٹی سیدھی باتیں سننے کو ملتیں۔

''مر کیوں نہ گئیں؟ زندہ کیوں بچ گئیں؟''

''جیسے سارے معاملات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں۔''

رات والی باتیں یاد آ آ کر اسے جلاتی رہیں۔ ناشتا تیار کر کے باہر آئی۔ تو ابا میاں ابھی تک سو رہے تھے۔ اس نے جگانے کی غلطی کیے بغیر صفائی ستھرائی کا کام شروع کر لیا۔ اس سے بھی فارغ ہو گئی۔ دھوپ دیواروں پر اتر آئی تھی اور ابا میاں کی نیند تھی کہ ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ تنگ آ کر اس نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا، کروٹ کے بل لیٹے ابا میاں کا بے جان سا وجود اس کے جھنجھوڑنے پر سیدھا ہو گیا تھا۔

''انہیں کیا ہوا ہے؟'' اس نے حیران ہوتے ہوئے انہیں پکارا، ایک بار۔۔۔ دو بار۔۔۔ مگر دوسری طرف کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اپنی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جب بہت دیر تک ابا میاں نے پلکیں نہ جھپکیں تو ان کی ساکت پتلیوں سے خوفزدہ ہو کر وہ ننگے پاؤں چلاتے ہوئے وامق بھائی کے گھر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

''ابا میاں مر گئے۔'' اس نے ٹپاٹپ چند آنسو بہائے اور پھر گھٹنوں میں سر دیے کن انکھیوں سے آنے جانے والوں کو دیکھتی رہی۔

''ہائے اللہ! منی خالہ اتنا ڈھیروں ڈھیر روتے ہوئے کیسی پیاری لگ رہی ہیں۔'' اس نے چورے چھپے منی خالہ کو دیکھا، بے تحاشا رونے سے آنکھیں اور ناک سرخ ہو گئی تھی۔ سسکیاں، ہچکیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ اور آنسو ایک تواتر کے ساتھ بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔

''کاش مجھے بھی اتنا رونا آئے جتنا منی خالہ رو رہی تھیں۔'' اس کے دل میں شدید خواہش جاگی۔ مگر یہاں رونے دھونے کا تو سوال ہی کیا۔ عجب سکون اور اطمینان پھیل رہا تھا۔

''روز روز کی چخ چخ سے جان چھوٹی۔ خود بھی چین سے رہیں گے ہمیں بھی قرار آئے گا۔'' اس نے بڑی بے حسی سے سوچا۔

کبھی کبھار تو لگتا تھا دیوانگی کے عالم میں، ایک آدھ کو جان سے مار کر ہی چین لیں گے۔ اس حالت میں وہ ان سے دور دور ہی رہتی۔ رات کو ہلکا سا کھٹکا ہوتا تو سوتے سے جاگ جاتی تھی۔

سو خدشوں سے جان چھوٹی تھی۔ سو بے فکر بیٹھی تھی۔ آنے والے ہزار وسوسوں اور فکروں سے بے نیاز لاعلم۔

اور پھر اسی شام ابا میاں، کلمہ شہادت کی آوازوں میں گھرے گھرے سے رخصت ہو گئے۔ کوئی اپنا کاندھا دینے والا نہیں تھا۔ غیروں نے تھاما اور قبر میں اتار دیا۔ منی خالہ گھر میں دہائیاں دیتی رہ گئیں۔ ابا میاں کے کفن دفن کا انتظام مولوی صاحب نے ہی کیا ہے۔ اپنی زندگی میں ہی کچھ نہ کچھ روپے ان کے ہاں جمع کرواتے رہے تھے۔

''میں نہیں چاہتا کہ میری میت پر کفن کے لیے دو دو آنے خیرات کیے جائیں۔''

سو مولوی صاحب نے کفن دفن کا انتظام کیا۔ جو روپے بچے۔۔۔ پلاؤ، زردے کی دیگ پکوائی۔ آنے والوں نے جی بھر کے کھایا اور فاتحہ پڑھ کر گھروں کی راہ لی۔

وامق بھائی گھر میں نہیں آئے تھے۔ باہر مردوں کے بیٹھنے اور ان کے لیے ٹھنڈے پانی کا بندوبست کرتے رہے۔ بعد میں جھوٹے برتن اور دریاں سمیٹنے کی فکر میں لگ گئے۔ ان کی اماں، منی خالہ کو تسلی دلاسا دے کر گھر لوٹ گئیں۔ اور پیچھے منی خالہ کا ساکت وجود اور ان کے دردناک بین کی بازگشت اسے ہولاتی رہی۔

خالی، ڈھنڈار گھر میں اسے اپنا آپ اجنبی سا لگنے لگا تھا۔

جس وقت بانکے خالو گھر میں داخل ہوئے، منی خالہ ایک کونے میں دم سادھے بیٹھی تھیں۔ نور القمر بولائی بولائی سی سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ آنگن میں میلی چیکٹ دریوں پر جھوٹے چاول بکھرے تھے اور دو چار گلاس اوندھے پڑے تھے۔ بانکے خالو کمرے میں چلے گئے تھے۔ دیوار سے دیوار تک، فرش سے چھت تک، آنکھیں سکوڑ سکوڑ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر سارے گھر میں آزادانہ گھومنے لگے۔ باورچی خانہ، گول کمرا، ڈرائنگ روم ایک ایک چیز کو بغور دیکھا اور پھر باہر نکل آئے۔

''یہ گھر کس کے نام ہے؟'' وہ منی خالہ کے سر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

''معلوم نہیں۔۔۔''

''کاغذات کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں۔''

منی خالہ کی لاعلمی پر بانکے خالو کچھ بڑبڑائے تھے۔

نور القمر نے پانی کا گلاس منہ سے ہٹا کر انہیں دیکھا۔ مگر سمجھ نہ پائی۔

تب وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ابا میاں، اپنے ضروری کاغذات کہاں رکھتے تھے؟''

''آپ نے کچھ کھایا بھی ہے یا یونہی۔۔۔ نور القمر۔۔۔'' اس کے بولنے سے قبل منی خالہ نے اسے اشارہ کیا اور خود مہمان خانے کا دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وہ ٹرے رکھنے کے لیے گئی تو منی خالہ وہاں موجود نہ تھیں۔ وہ پانی کا جگ رکھ کر انہیں ڈھونڈتی ابا میاں کے کمرے میں چلی آئی۔ آہٹ پا کر کاغذات کی صندوقچی پر جھکی منی خالہ بری طرح گھبرا کر اس کی طرف پلٹیں۔ رنگ ایک لمحے کے لیے زرد ہوا مگر پھر اسے دیکھ کر گویا جان میں جان آئی تھی۔

''آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔ نورا! میں بس ابھی ایک منٹ میں آتی ہوں۔'' وہ ساڑھی کا پلو ارد گرد پھیلاتی کمرے سے باہر نکلیں پھر اسی وقت پلٹ کر عجلت میں سرگوشی کی۔

''اپنے خالو سے کچھ مت کہنا۔۔۔ کہ میں کہیں گئی ہوں۔ بس ایک منٹ میں آتی ہوں۔'' وہ بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلیں اور ذرا سی دیر میں کنڈی کھول کر باہر۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' اس نے حیران ہو کر دیکھا۔

صندوقچی یونہی کھلی پڑی تھی۔ اس نے تمام کاغذات سمیٹ کر اندر رکھے اور صندوقچی پلنگ کے نیچے کھسکا کر باہر نکل آئی۔

اگلے دن کا سورج نمودار ہوا تو وہ تینوں گھر سے رخصت ہونے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

رات منی خالہ نے وامق کی اماں کی کس قدر منت سماجت کی تھی۔

''خالہ! نورالقمر کو اپنے پاس رکھ لیں۔ جھاڑو پونچھا، صفائی کپڑے۔''

نور آنکھوں میں حیرت بھرے منی خالہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اور وامق کی اماں نے صاف صاف لفظوں میں ہی جواب دے دیا تھا۔

نہ کوئی رشتہ نہ تعلق۔۔۔ محض ہمسائیگی، جوان جہان لڑکی کی ذمہ داری وہ کیونکر اٹھاتیں۔ ان کے انکار سے منی خالہ کی جو حالت ہوئی تھی۔ نورالقمر ان کی طرف سے سخت بددل ہوئی۔

''کیا میں اتنی ارزاں ہوں۔۔۔ بوجھ۔۔۔ بیکار۔۔۔ منی خالہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتیں۔ کتنی بری ہوں میں۔ اور میں نے سوچا تھا اب میں اکیلی ہوں تو منی خالہ یہاں آجائیں گی میرے پاس۔ مگر یہ تو شادی کے بعد بدل ہی گئیں۔''

وہ انگلیاں چٹخاتے، لب کاٹتی رہی۔ اب ابا میاں یاد آرہے تھے۔

ساری رات منی خالہ سسکیاں بھرتی سامان سمیٹتی رہیں۔ وہ تکیے میں منہ دیے آڑی ترچھی اپنے پلنگ پہ لیٹی رہی۔ ساتھ تو کچھ بھی لے کر نہ جانا تھا۔ بس ایک سوٹ کیس میں پہننے اوڑھنے کے کپڑے رکھے اور باقی سب سامان کمروں میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔

بانکے خالو کا موڈ اچھا نہ تھا۔ صندوقچی کھنگالنے کے بعد سے انہوں نے کسی سے کلام نہ کیا تھا۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے۔ اپنی مرضی کا کوئی کاغذ انہیں نہ مل سکا تھا۔ نورالقمر ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی تو وہ چونک گئے۔

''یہ۔۔۔؟'' سوالیہ نگاہوں سے منی خالہ کو دیکھا۔

وہ ہکلا سی گئیں۔۔۔ نورالقمر کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''اگر آپ مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تو میں یہیں رہ لوں گی۔ اکیلی۔۔۔ تنہا۔'' وہ اپنی خالہ سے زیادہ بہادر اور نڈر لگ رہی تھی اس لمحے۔

بانکے خالو نے بغور اسے دیکھا۔ روٹھی روٹھی خفا سی، بچوں کی طرح ناراض ہو رہی تھی۔

''کیوں رہو گی ہمارے ہوتے ہوئے اکیلی۔۔۔ تنہا۔۔۔ ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا جو۔۔۔''

''اچھا چلیں اب۔۔۔ دیر۔۔۔'' منی خالہ بھاری سوٹ کیس اٹھا کر لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھیں۔

وامق بھیا باہر دروازے پہ کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ آگے بڑھ کر سوٹ کیس تھام لیا منی خالہ کی چال میں سستی سی آگئی تھی۔ چہرہ جھکائے دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں۔

نورالقمر جھٹ پٹ تانگے پہ چڑھ گئی اسے اگلی سیٹ پہ بیٹھنا پسند تھا۔ بانکے خالو اس کے برابر بیٹھ گئے۔ منی خالہ دروازے پہ بھاری تالا لگا کر پیچھے آ بیٹھیں۔

وامق بھیا نے ان کے پیروں کے قریب سوٹ کیس رکھا۔ اور ہتھیلی منی خالہ کے سامنے پھیلا دی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چابی وامق بھائی کی ہتھیلی پہ رکھ دی۔ ہاتھ ہٹنے سے قبل ہی وامق بھائی نے مٹھی بند کر لی تھی۔ منی خالہ نے گھبرا کر بانکے خالو کی طرف دیکھا۔ وہ متوجہ نہ تھے۔ اپنا ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے انہوں نے سر پہ سے پھسلتی چادر درست کی۔ اور نگاہیں اپنے پیروں پہ گاڑ دیں۔

کوچوان کا چابک ہوا میں لہرایا۔

بانکے خالو نے پلٹ کر وامق بھائی کو الوداعی سلام کہا اور پھر سیدھے ہو بیٹھے۔ تانگے کے بڑے بڑے پہیے سڑک کو پیچھے دھکیلنے لگے تھے۔

''اللہ کے سپرد۔۔۔'' وامق کی اماں نے دروازے میں کھڑے کھڑے دعا دی۔ وامق بھائی چند قدم ان کے پیچھے آئے اور پھر وہیں رک گئے۔ کچھ دور جا کر منی خالہ نے سر اٹھایا۔

وہ دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے، گھر کے سامنے لگے کیکر کے نیچے کھڑے تھے اور ننھے منے زرد مخملیں پھول ہلکی ہلکی ہوا میں ان کے چاروں اطراف گر رہے تھے۔ ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے اور منی خالہ کی نگاہیں فضا پہ لکھی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر مٹا رہی تھیں۔

شیشم کے درختوں میں گھری کولتار کی سڑک گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اگلے کئی روز تک، شام کے آخری پہر میں زندہ ہوتی رہی اور کوچوان کا چابک اداس فضا پر درد کی شکنیں داغتا رہا۔

☆☆☆

''اف۔۔۔ خالو آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔'' ریل گاڑی کی چھکا چھک سنتے ہوئے اس نے کوئی تیسری بار خالو کی تعریف کی تھی اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے منی خالہ کو دیکھا جو سر جھکائے اپنے سرخ ہونٹوں کو کاٹ کاٹ کر مزید سرخ کیے جا رہی تھیں۔ کھٹی میٹھی املی کا چٹخارہ لیتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خوب مزا لیا۔

وہ ان سے ناراض تھی۔ انہیں تنگ کرنے کے لیے فرمائشوں پہ فرمائشیں کیے جا رہی تھی۔ اور بانکے خالو ٹھہرے دل کے رئیس، بلاتردد اس کی مانے جا رہے تھے۔ نان کباب، شربت چائے، اور ذرا دیر پہلے اس کی لالچی نگاہوں کے تعاقب کے بعد انہوں نے بغیر اس کے کہے کھٹی میٹھی املی کے ڈھیروں پیکٹ لے کر اس کی گود میں ڈال دیے تھے۔

''ہونہہ! کہاں کی خالہ ہیں؟ بانکے خالو نہ ہوتے تو وہاں وامق بھائی کے گھر نوکرانی بنا کر چھوڑ آتیں۔ یا پھر اس خالی ڈھنڈار، ویران قبرستان میں گاڑ آتیں۔ شادی کروا کے خود کو کچھ سمجھنے لگی ہیں۔ ایسی بیگانگی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔''

''ہائے خالو! آپ کتنے اچھے ہیں۔'' وہ مزے سے ان کے کندھے پہ سر رکھے املیاں چوس رہی تھی۔

بانکے خالو کھلکھلا کر ہنس دیے۔ منی خالہ پہلو بدلنے لگیں۔

''کیسے جل بھن رہی ہیں۔ ساری راہ خالو نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔ ''منی کیا کھاؤ

گی۔۔۔؟'' میری بڑی قدر کرتے ہیں۔'' وہ جی جان سے خوش ہو رہی تھی۔

ریل کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تھی۔ ذرا دیر کے لیے نیچے اتر گئے تھے۔ منی خالہ نے بڑے صبر سے ان کے جانے کا انتظار کیا اور پھر جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ دھپ سے ان کے برابر آ گری۔

''کیا ننھی بچی کی طرح ان کے کاندھے سے لٹکی جا رہی ہو۔ تمیز سے یہاں بیٹھو اور اگر اب تمہاری زبان ہلی تو اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دوں گی۔'' کیسا قہر برس رہا تھا ان کی آنکھوں سے۔

''ہونہہ۔ آئیں بڑی کہیں سے۔۔۔'' ان کی سخت گرفت سے اپنی کلائی آزاد کرواتے ہوئے اس نے خونخوار نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر جھٹکے سے اپنا رخ موڑ لیا۔ منی خالہ سُن سی ہو گئیں۔

''کیا چوزوں کی طرح سہمی رہتی تھی گھر میں۔ خوفزدہ کبوتری، اور اب کیسی بے خوفی اتر آئی ہے اس کی آنکھوں میں، ڈر، لحاظ، مروت کہاں چھوڑ آئی سب کا سب۔۔۔؟'' وہ کھڑکی سے باہر گمشدہ چیزوں کو کھوجنے لگیں۔

نور القمر اپنی جگہ بیٹھی تلملا رہی تھی۔

''ساری عمر ابا میاں کی تلوار سر پر لٹکی رہی۔ ہم معصوم گائیں، بھیڑیں آگے آگے اور ابا میاں کا ڈنڈا پیچھے پیچھے۔۔۔''

''اونچی آواز میں مت بولو۔۔۔ ابا میاں ناراض ہوں گے۔''

''زور سے مت ہنسو۔۔۔ ابا میاں کو غصہ آ جائے گا۔''

''ریڈیو کی آواز آہستہ رکھو، ورنہ ابا میاں خفا۔۔۔''

''باہر مت نکلو۔۔۔ دوپٹہ ڈھنگ سے اوڑھو۔ چھت پہ نہیں جانا۔ رات دیر تک بتی نہیں جلانی۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ابا میاں۔۔۔ ابا میاں، ابا میاں ناراض۔۔۔''

ابا میاں کی ڈانٹ، ابا میاں کی جھاڑ، ابا میاں کی پھٹکار، اف۔۔۔ اف۔۔۔ اف۔۔۔''

''اف۔۔۔ جا سوئے ابا میاں قبر میں۔۔۔ جان چھوٹی خدا خدا کر کے۔

اب جیسے دل چاہے گا جئیں گے۔ زور سے بولیں گے۔ قہقہہ لگا کر ہنسیں گے۔ ابا میاں پڑے تلملاتے رہیں قبر میں ہماری بلا سے۔'' وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ارد گرد سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں گم۔

بانکے خالو نے چونک کر اس شاداب چہرے والی دیوانی سی لڑکی کو دیکھا۔ اور سر جھٹک کر مسکرا دیے۔

''اوزرہ گئیں ابا میاں کی جانشین۔۔۔'' اس نے پلٹ کر منی خالہ کو دیکھا۔

''تو ان سے میں نبٹ لوں گی۔'' زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے ہاتھ جھاڑے اور سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

اس ڈبے کے بیشتر مسافر آنکھیں بند کیے اونگھ رہے تھے۔

اضطراری انداز میں اپنے پرس میں کچھ تلاش کرتی منی خالہ نے سر اٹھا کر چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب مسافر اپنی اپنی جگہ محو تھے۔ نیم غنودگی میں نور القمر کا سر ان کے کندھے سے آ لگا تھا۔

انہوں نے ایک گہری نظر سیاہ چمکدار بالوں میں کھنچی سیدھی مانگ پر ڈالی اور پھر تھک کر اپنا سر سیٹ سے لگا دیا۔

نور القمر کی شوخ کھلکھلاتی ہنسی کے سنہری سکے اس کی سماعتوں پر ابھی تک گول گول گھوم رہے تھے۔

☆☆☆

''آ گئیں بہورانی! بھانجی کو بھی لے آئیں۔ بہت اچھا کیا۔ ہم تو یوں بھی ٹھیکے دار ہیں۔ یتیموں، مسکینوں کے، ایک پہلے پال رہے ہیں۔ دوسری کو اب پال لیں گے۔ اور پھر تمہارے خاندان میں تو رواج ہی بن گیا ہے۔ کچھ کو اللہ تعالیٰ نے یتیمی دے دی اور کچھ اپنے جیتے جی بچوں کو یتیم کر گئے۔ میں کہتی ہوں خاندان میں کچھ اور بن ماں، باپ کے ہیں تو انہیں بھی لے آؤ یہاں۔ میں تو یوں بھی گھر کے باہر تختی نصب کروا رہی ہوں۔ پناہ گاہ یتیماں، دار مسکیناں۔۔۔''

کسی نے سر کے عین وسط میں تلوار گھونپی تھی جو اسے پاؤں کے انگوٹھے تک کاٹتی چلی گئی تھی۔ ایک بار نہیں۔۔۔ دو بار۔۔۔ سہ بار۔۔۔ چار بار۔

پلکوں پہ پہاڑ آن گرے تھے۔ اس نے بدقت تمام نگاہ اٹھائی۔

کہنے والی نے مکروہ ہنسی تاک کر اس کی مردہ آنکھوں میں اچھالی، اپنی ہتھیلی میں سے سونف نکال کر پھانکی اور تکیے پہ نیم دراز جگالی کرنے لگی تھی۔

اسے لگا وہ لق و دق صحرا میں جلتی ریت پر ننگے بدن پڑی ہے اور دہکتا سورج بڑی فیاضی سے اسے آگ کا لباس پہنا رہا تھا۔

کوئی ہے جو میرے حلق میں چند بوندیں پانی کی ٹپکا دے۔۔۔'' اس نے مدد طلب نگاہوں سے کسی مہربان کو کھوجا۔

بانکے خالو کسی کمرے کے جالی دار دروازے کے پیچھے کھو گئے تھے۔ اور منی خالہ۔۔۔ انہوں نے آتے ہی سیاہ چادر اتار کر ساڑھی کا پلو کمر میں اڑسا تھا اور صحن میں بکھری چیزیں سمیٹنے لگی تھیں۔ یوں جیسے انہیں معلوم ہو کہ یہ سب انہیں ہی کرنا ہے۔ چہرے کی اصل رنگت اور ہونٹوں کی لالی تو اس گھر میں داخل ہوتے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اور اب وہ بھاگ بھاگ کر چیزیں اٹھا رہی تھیں۔

''یہ گلاس۔۔۔ وہ جوتا۔۔۔ بکھرے کھلونے، گدلے پانی کا ٹب، صابن کا جھاگ۔۔۔ وہ شڑاپ شڑاپ جھاڑو چلانے لگیں۔

''کیا یہ وہی منی خالہ ہیں جو ابھی میرے ساتھ ٹرین کا بہت لمبا سفر طے کر کے آئی ہیں؟''

اٹھارہ گھنٹے کے سفر کی تکان اس کی پنڈلیوں میں کینچوے کی طرح رینگ رہی تھی۔

منی خالہ کی بھٹکتی ہوئی نگاہ یونہی اس پہ جا پڑی تھی۔ انہوں نے کن انکھیوں سے تخت پہ پڑے وجود کو اونگھتے دیکھا تو دبے پاؤں اس کی طرف آ گئیں۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے ایک کمرے میں لے آئی تھیں جہاں ان کے جہیز کا تھوڑا بہت سامان گرد سے اٹا ہوا تھا۔ وہ پلنگ کی پٹی پہ ٹک گئی۔ ان دونوں کے بیچ موجود چند لمحے، مکار چپ نے بڑی عیاری سے ہڑپ کر لیے تھے۔ تب ہی دروازہ کھول کر ایک نوعمر لڑکا اندر آیا۔

”چھوٹی امی۔۔۔ بڑی امی کہتی ہیں۔ اپنی پوٹلی، بستر تو صحن سے اٹھالیں۔ کیا گند مچایا ہوا ہے۔“
منی خالہ سٹپٹا کر باہر نکل گئیں۔
نورالقمر نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تالو سے چپکی زبان بمشکل چھڑائی اور زیر لب دو لفظ دوہرائے۔
”چھوٹی امی، بڑی امی!“ کیسا تھرا کر رکھ دینے والا انکشاف تھا۔
اس نے سینے کو زور سے مسل کر اپنا اٹکا ہوا سانس باہر نکالنے کی کوشش کی۔
کمرے میں آکسیجن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہوا کو اندر کھینچنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔
”آہ۔۔“ وہ اٹھ کر کمرے میں موجود واحد کھڑکی کی طرف بھاگی۔
ایک جھٹکے سے کھڑکی کے دونوں پٹ باہر کی جانب کھول دیے۔
”ہاہ۔۔ آ۔۔“ وہ چوکھٹ پہ جھکی لمبے لمبے سانس کھینچنے لگی۔ اس کی گردن دو نادیدہ ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اگلے پل وہ چوکھٹ پہ پیر جمائے کھڑکی سے باہر تھی۔ اجڑا ویران چھوٹا سا باغ تھا۔ زرد مسلی ہوئی مردہ گھاس، وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔ اس کے اطراف میں ہر چیز ساکت تھی۔ لمبے لمبے درخت، درختوں کے پتے۔۔ ڈالیاں، اور ان ڈالیوں پہ بیٹھے چڑیاں، طوطے، سب ساکت، آسمان ساکت، زمین منجمد، ہوا ٹھہری ہوئی۔ اور اس کا اپنا دل، کسی ایک سہمی ہوئی دھڑکن کے بعد سے لے کر اب تک بے حس حرکت، اس کا دل چاہا وہ چیخے۔ اتنی زور سے کہ فضا کا سکوت چھن سے ٹوٹ جائے۔
کچھ اور بس میں نہ رہا تو وہ سہ پہر کے ان لمحوں میں اجڑے، ویران باغ کی زرد مسلی ہوئی مردہ گھاس پہ گھٹنوں میں سر دیے باآواز رونے لگی تھی۔

☆☆☆

مغرب کی اذان ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا، جب وہ منی خالہ کے پیچھے پیچھے بہت بڑی بڑی سیڑھیوں کو ایک ایک کر کے اپنے قدموں سے دھکیلتی اوپر آئی۔ منی خالہ نے کمرے کا بوسیدہ دروازہ کھول کر سامان ایک کونے میں رکھ دیا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے در و دیوار پر نظر ڈالی تو نگاہیں بے اختیار ہی بھٹک کر منی خالہ کے چہرے پہ جا ٹکیں وہ نظریں چرا کر خواہ مخواہ ہی کھنکھارنے لگیں۔
”بلب۔۔۔ بلب نہیں ہے اس کمرے میں۔۔۔ لیکن خیر ہمیں تو بڑا عرصہ ہوا اتنی روشنی کی عادت بھی نہیں رہی۔۔۔ ابا میاں کے کمرے سے چراغ اٹھا لائی تھی نشانی کے طور پر۔ سوٹ کیس کھولو تو نکال کر دے دینا۔ میں تیل ڈلوا لوں گی۔“
”ابا میاں کی ہر نشانی تو ان کے کمرے میں سنبھال کر رکھ آئی تھیں آپ۔۔۔ چراغ یوں اٹھا لائیں کہ آپ کو پہلے سے ہر چیز کی خبر تھی۔“ اس نے سوچا ضرور مگر کہہ نہ سکی۔ منی خالہ ساڑھی کے پلو سے زور زور سے آنکھیں مسل رہی تھیں۔
”کیا ہوا۔۔؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔
”کچھ نہیں۔۔۔ گرد سی آنکھوں میں بھر گئی ہے۔ شاید سفر کی وجہ سے۔۔۔“ وہ عجلت میں باہر کی طرف بڑھیں۔ دروازے کے قریب ٹھوکر سی لگی تھی۔

نورالقمر اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھی تھی۔ وہ خود ہی سنبھل گئیں۔
”رات کو کھانا میں یہیں لاؤں گی۔ تم نیچے مت۔۔۔“ نجانے کیسی گرد گھس گئی تھی ان کی آنکھوں میں، نکلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ وہ خود البتہ تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی تھیں۔۔۔ وہ دم سادھے، فرش پہ نظریں ٹکائے کھڑی رہی۔
کئی لمحے گزر گئے، تب سیڑھیوں پہ ایڑی والے جوتے کی ٹھک ٹھک ابھری، اس کی سماعتیں کچھ دیر تک سیڑھیاں اترتی چاپ کا تعاقب کرتی رہیں اور جب آواز بہت مدھم ہو گئی تب اس نے سر اٹھایا اور اس کمرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں اسے اب رہنا تھا۔
دو شہتیروں پہ ڈالا گیا یہ کمرا لمبائی، چوڑائی میں بالکل برابر تھا۔ بہت سارا کاٹھ کباڑ یہاں جمع تھا۔ ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، دو چار کرسیاں۔۔۔ زنگ لگا پیڈسٹل فین، فوم کے گدے، لوہے کے ٹوٹے پھوٹے ٹرنک، ردی اخبارات، کاپیاں، بغیر آئینے کی سنگھار میز، اور اس دولت بے بہا کو نجانے کن مشکلوں سے ایک طرف ہٹا کر منی خالہ نے اس کے لیے ایک گوشہ صاف کیا تھا۔
ڈیڑھ، دو چارپائیوں کے برابر خالی جگہ، نہ کوئی پلنگ نہ چارپائی، سیمنٹ ادھڑا اونچا نیچا فرش۔۔۔
”منی خالہ نے یقیناً بہت محنت کی ہے۔۔۔“ ٹوٹے پھوٹے فرش پہ پوچا لگنے کے نشان نظر آ رہے تھے۔ وہ مرے مرے سے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ ایک یہ کمرا تھا، اور چھت کے آخری سرے پہ ایک اور کمرا، دروازے پہ تالا لگا ہوا تھا۔ چھت کی بیرونی دیوار کے ساتھ نیم کا بہت بڑا سا درخت جڑا ہوا تھا۔ جس کے سرسبز پتوں سے زرد زرد نمولیاں جھانک رہی تھیں۔ گھر کی طرف دیوار میں سیمنٹ کی جالیاں لگی تھیں۔ اس نے کندھوں تک آتی دیوار پر ہاتھ جما کر نیچے جھانکا۔ شطرنج کی بساط جیسا سیاہ، سفید ٹائلوں سے بنا صحن مختلف افراد کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں رکھا ٹیلی ویژن بار بار تصویریں بدل رہا تھا۔ وہ بس ایک نظر ڈال کر پیچھے ہٹ گئی۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ وہ واپس اسی کمرے میں آ گئی۔ تھکن زدہ جسم نرم گرم بستر کا متقاضی تھا۔ اس نے ایک نظر کھردرے فرش پر ڈالی اور سوٹ کیس پر پڑا بستر بچھانے لگی۔
ایک موٹا کھیس اور اس پر بچھی چادر بھی اگرچہ فرش کی سختی کو ختم نہ کر پائی تھی۔ مگر اس کا جسم اور ذہن دونوں اتنے تھک چکے تھے کہ پھر وہ اس چیز کو زیادہ دیر تک محسوس نہ کر پائی تھی۔ اور اپنے عین اوپر کھڑکی میں لگی جالی سے باہر پھیلتی تاریکی کو دیکھتے دیکھتے نیند کی وادیوں میں جا اتری تھی۔
نجانے کتنی دیر سوئی تھی وہ۔ لیکن اس وقت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جب منی خالہ موم بتی ہاتھ میں لیے اس کے سر پہ کھڑی تھیں۔
”اٹھ جاؤ نورا! کھانا کھا لو۔“
چند لمحے یونہی انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ کسلمندی سے اٹھی تو لبوں سے بے اختیار ہی آہ نکل گئی۔ اونچے نیچے فرش پہ سونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اور اسے اپنی پشت پہ جا بجا گھاؤ لگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
منی خالہ ٹرے اس کے پاس رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔
”آپ نے کھا لیا؟“

''ہوں۔۔۔'' وہ پگھلتی ہوئی موم بتی پر نگاہ گاڑھے بیٹھی تھی۔

اس نے پہلا لقمہ توڑتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔ دن کے اجالے کی نسبت اس نیم تاریکی میں ان سے بات کرنا آسان لگا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے قدرے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

''منی خالہ! آپ کو پہلے سے پتا تھا کہ۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔''

''یہاں آکر معلوم ہوا۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ سواگت اسی نے کیا تھا'' وہ جلتے ہوئے موم کے قطرے اپنی ہتھیلی پہ ٹپکانے لگی تھیں۔

''آپ نے۔۔۔ آپ نے ابا میاں کو نہیں بتایا تھا؟''

''وہ لاعلم کب تھے؟''

''کیا۔۔۔؟'' لقمہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

''اس کے باوجود انہوں نے۔۔۔؟''

''ہاں اس کے باوجود۔۔۔''

''ہائے ابا میاں! قبر میں نہ پڑے ہوتے تو یہ موٹی موٹی گالیاں دیتی آپ کو۔۔۔ میری نازک سی منی خالہ۔۔۔'' اس نے بھرے دل کے ساتھ ٹرے پیچھے کھسکا دی۔

''کتنے بچے ہیں ان کے؟''

''تین۔۔۔ تینوں بیٹے ہیں''

وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

منی خالہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا یوں جیسے پوچھ رہی ہوں۔

''بس یا کچھ اور۔۔۔''

لیکن اسے واقعی چپ لگ گئی تھی۔ اگر کوئی سوال ذہن و دل میں تھا بھی تو اب دم توڑ چکا تھا۔

''کھانا جلدی کھالو۔۔۔ مجھے جانا ہے۔''

''بس کھا چکی۔۔۔ آپ جائیے۔۔۔'' اس نے بجھے دل کے ساتھ ٹرے اٹھا کر ان کے ہاتھوں میں دے دی۔

''موم بتی، یہاں چھوڑ جاؤں؟''

''ضرورت نہیں۔۔۔'' وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

منی خالہ کے جاتے ہی کمرا اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک ساکت وصامت لیٹی رہی پھر اٹھ بیٹھی۔ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں سانس گھٹنے لگا تھا وہ ننگے پیر ہی باہر نکل آئی۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نیم کے پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ ماحول کی خاموشی میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔ اس نے سیمنٹ کی جالیوں سے پرے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں بھی مکمل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔

''پتا نہیں وقت کیا ہوا ہے؟'' وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''اب معلوم نہیں کب نیند آئے گی؟'' وہ جلد ہی اکتا گئی۔ اٹھ کر سامنے والے کمرے پر لگے تالے کو ہلا جلا کر دیکھا۔

''اس میں اللہ جانے کون سے خزانے دفن ہیں۔'' تالا کافی مضبوط تھا۔ وہ مایوس ہو کر چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکرانے لگی۔

تب ہی اسے محسوس ہوا، کہیں کوئی آہٹ ہوئی ہے۔۔۔ وہ چونک سی گئی۔ قدم روک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''شاید کوئی سیڑھیوں سے اوپر آرہا ہے۔'' بھاری قدموں کی آواز سیڑھیوں پہ ابھری تو وہ بگٹٹ بھاگ کر کمرے میں گھس گئی۔ دروازہ بند کیا اور دم سادھے اپنے بستر پر جا بیٹھی۔

''رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کسی نے نیچے سے مجھے ٹہلتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور اب ڈانٹ پھٹکار۔۔۔'' اس کا دل ڈولنے لگا۔

قدموں کی چاپ نزدیک آرہی تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر سر گھٹنوں میں دے دیا۔ اب دروازہ کھلا کہ اب۔۔۔

''پیا نام کا دیا۔۔۔'' دروازے کے عین سامنے گنگناہٹ ابھری۔

''جلا ہے ساری رات۔۔۔''

کوئی کمرے کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا۔

''ہائیں۔۔۔ یہ کون۔۔۔؟''

اس نے گھٹنوں کے بل ہو کر جالی دار کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ایک سایہ سا بڑی بے نیازی سے چلتا ہوا اس مقفل کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے دروازہ کھلتے اور اس کمرے کو بلب کی زرد روشنی سے منور ہوتے دیکھا تھا۔ چوپٹ کھلے دروازے سے کمرے کا یہ بے حد روشن منظر اسے بہت بھایا تھا۔ اپنے کمرے کی تاریکی میں بیٹھ کر وہ اس روشنی کو اگلے کئی لمحوں تک دیکھنا چاہتی تھی، مگر وہ دراز قامت نوجوان دروازے کے فریم میں نمودار ہوا اور اگلے ہی پل دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اسے قدرے مایوسی ہوئی، کچھ دیر تک وہ یونہی جالی پر انگلیاں پھیرتی اس دروازے سے باہر آتی روشنی کی ان لکیروں کو دیکھتی رہی جو باہر صحن میں جابجا بکھری ہوئی تھیں۔ پھر تھک ہار کر سیدھی ہو گئی۔

''پتا نہیں میرے نصیب میں روشنی کیوں نہیں ہے؟'' اس نے لیٹتے ہوئے دل گرفتگی سے سوچا، اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

''اُف میرے اللہ! کس دوزخ میں کٹی ہے ساری رات۔۔۔ ایک اندھیری قبر تھی، جس کے حبس اور سناٹے نے ہر لمحے بے چین کیے رکھا۔ اور کاٹھ کباڑ اس میں سے نجانے کتنے سانپ بچھو نکل نکل کر میری طرف آتے رہے۔ جسم تو یوں لگتا ہے رات بھر میں ساری نرمی کھو بیٹھا ہے۔ منی خالہ کیا ایک چارپائی نہیں مل سکتی؟'' کس قدر بے چارگی سے پوچھا تھا اس نے، اور نجانے کیسے منی خالہ کے ہاتھ سے گرما گرم چائے چھلکی اور ان کے ہاتھ کو جلاتی چلی گئی۔

ایک سسکاری بھرتے ہوئے انہوں نے فوراً پیالی زمین پر رکھی اور ساڑھی کا پلو اپنے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"زیادہ جل گیا؟" ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبالب بھرتے دیکھا تو فوراً ان کا ہاتھ تھام کر دیکھنے لگی۔ ہلکی ہلکی سرخی ہاتھوں پر پھیلنے لگی تھی۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا تو حیران رہ گئی۔

"منی خالہ! آپ اتنی سی تکلیف پر رو رہی ہیں۔"

"اتنی سی تکلیف تو نہیں نور! تکلیف بہت زیادہ ہے۔ بہت درد ہو رہا ہے۔" ان کا زاروقطار رونا اسے پریشان کر گیا تھا۔

"تو آپ اس پر کچھ لگا لیں نا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں کچھ لگاتی ہوں۔۔۔" وہ اپنا ہاتھ دبوچے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

"کتنی احمق ہوں میں اور بے وقوف بھی۔ بھلا یہ سب منی خالہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ میرے لیے اس سے بہتر کچھ کر سکتیں تو کیا میں یہاں۔۔۔؟ لیکن ان کا اپنا کمرا بھی تو ہے نا۔۔۔؟ چاہیں تو مجھے وہاں لے جائیں۔ بانکے خالو تو اپنی پہلی بیوی کے پاس ہی ہوتے ہیں۔"

قہوے سے ملتی جلتی چائے میں دو پاپے ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ جو سوچ سکتی تھی اس نے سوچ لیا۔ پاپے فقط دو کھائے اور پلیٹ خالی۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ وہ چڑ کر اٹھی۔ بغیر آئینے کی سنگھار میز تک گئی۔ بمشکل اس کی دراز کھولی، چائے اس میں انڈیلی اور پلیٹ اٹھا کر باہر آ گئی۔

"منی خالہ سے بات کرتی ہوں جا کر، نہ مانیں تو بانکے خالو سے کہوں گی۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکتے۔ لیکن ان کی اماں بڑی چیز ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی ان ہی کے دباؤ میں ہوں۔۔۔" وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ صحن بالکل خالی تھا اور کمروں کے جالی دار دروازے بند۔۔۔

"کہاں جا سوئی ساری مخلوق۔۔۔" وہ ادھر ادھر جھانکتی ہوئی خالہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ باورچی خانہ بھی نجانے کدھر تھا؟

"یہ نہ ہو دھوکے میں کسی اور کے کمرے میں جا گھسوں۔" دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تب ہی کسی نے عجلت میں اندر سے دروازہ کھولا۔ پٹاخ سے آ کر منہ پہ لگا۔ ناک اور پیشانی سے گویا آگ سی نکلی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو ہٹی، اس سے قبل کہ گرتی، بانکے خالو نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر بڑے سبھاؤ سے اسے سنبھالا دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے برتن نیچے گر کے چور ہو گئے تھے۔ وہ ناک اور پیشانی کو سہلاتی، آنکھوں میں نمی لیے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بانکے خالو ہونٹوں پہ مہربان سی مسکراہٹ سجائے معذرت کے دو لفظ کہتے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ وہ اپنی ناک کو سہلاتے ٹوٹے برتنوں پر مجرمانہ سی نگاہ گاڑھے کھڑی تھی۔ جب دائیں طرف کا دروازہ کھلا اس نے رخ موڑ کر دیکھا۔

"یہ عورت یقیناً۔۔۔" وہ ایک لمحے میں اسے پہچان گئی تھی۔

اس کا قد لمبا تھا اور جسم فربہی مائل، گہرے سرخ رنگ کا لباس اس کی گوری رنگت پہ خوب سج رہا تھا۔ سبز کناری والا سرخ رنگ کا چنا ہوا دوپٹہ تھا۔ گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک نے چہرے کو اچھی

خاصی رونق بخشی تھی۔ اس کی شخصیت اتنی بارعب تھی کہ وہ خوامخواہ ہی گھبرا سی گئی تھی۔

"کیا کر رہی ہو یہاں؟" لہجے میں تمکنت تھی۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں، میں۔۔۔ وہ منی خالہ۔۔۔"

"ہاں تمہاری خالہ۔۔۔" وہ ذرا سا ہنسی۔ سرخ ہونٹوں سے جھانکتے موتی جیسے دانتوں کی چمک نے اس کے چہرے کو روشن سا کر دیا تھا۔

"ہوں گی یہیں کہیں، یا شاید اماں کے کمرے میں۔۔۔" بڑا لاپرواسا انداز تھا بتانے کا۔

"تم نور ہو نا۔۔۔؟ نور القمر۔۔۔؟" اس کی بھوری آنکھوں میں بہت عجیب سا تاثر تھا، نور کو وہ عورت اپنے حواسوں پر چھاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ فقط اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اطہر نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔۔۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم واقعی "اتنی" خوبصورت ہو۔" دو قدم آگے بڑھ کر اس نے اپنی پوروں سے اس کے چہرے کو ہلکا سا چھوا تھا، ان خوشبودار پوروں کے سرد لمس نے اس کے جسم میں سنسناہٹیں سی دوڑا دی تھیں۔ ذرا سا جھجک کر وہ بے اختیار ہی دو قدم پیچھے ہٹی مگر اگلے ہی پل ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ بے ساختہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ جواب میں وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔

"کانچ چبھ گیا نا پیروں میں، ہاں یونہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم اپنے آپ کو زخمی کرنے کے لیے خود ہی اپنی راہ میں کرچیاں بکھیر لیتے ہیں۔ ہاں ہوتا ہے، یونہی ہوتا ہے۔" وہ اپنے ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بھرتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ لیکن اس کی جاندار ہنسی نور القمر کے آس پاس بکھری کرچیوں کرچیوں کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔

"کون تھی یہ۔۔۔؟ ساحرہ، جادوگرنی، چھل پیری۔" اس نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا۔ سرمئی خاموشی میں لپٹے در و دیوار آسیب زدہ معلوم ہو رہے تھے۔ بمشکل تھوک نگلتے ہوئے وہ پلٹی، پیر تلے چپچپاہٹ کا احساس ہوا مگر وہ بغیر رکے پنجوں کے بل دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ایڑی میں لگے آدھ انچ لمبے زخم سے رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کپڑے کی بندھی ہوئی پٹی زخم کے اوپر چپک سی گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیر تھامے وہ بہت دیر سے منی خالہ کی منتظر تھی۔ آنتیں بھوک کے مارے سکڑنے لگی تھیں۔ پہلا پہلا دن اور اس پر یہ سزا۔۔۔ چند دن بعد نجانے کیا حشر ہونا تھا؟

"اللہ جانے کن گناہوں کی سزا ہے؟ دو پاپوں اور سڑی ہوئی چائے کی ایک پیالی پہ سارا دن بتانا پڑ گیا۔ ہائے کیسے بھوکوں کے گھر میں مرے ہیں آ کر۔۔۔"

اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے وہ بس کوسنے ہی دے سکتی تھی۔ پھر قدرے لنگڑا کر چلتے ہوئے دروازے تک گئی۔ سیڑھیوں سے نیچے جھانکا۔ پھر سیمنٹ کی جالیوں سے پیشانی ٹکا دی۔ سارا صحن بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک بار دل چاہا نیچے چلی جائے۔

"چلی تو جاؤں، مگر وہ چھل پیری، جانے کیا پڑھ کر پھونکتی ہے زبان ہی نہیں ہلتی اس کے سامنے، ادھر سے آنکھیں ایسی، جیسے سانپ سے انسان بنی ہو۔ پلکیں بھی نہیں جھپکتی، ہنستی ہے تو جسم میں کپکپی سی ہونے لگتی ہے۔ منی خالہ تو بری پھنسیں۔"

وہ پھر سے آ کر کال کوٹھڑی میں بیٹھ گئی۔ سورج سوا نیزے پہ آ کے ڈھلنے لگا تھا۔
نقاہت کے مارے بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ لیٹ گئی اور پھر پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی۔
جاگی تو اس وقت جب کوئی سایہ اس کے قریب کھڑا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ منہ کھولے تکتی رہی پھر پہچانتے ہی منہ موڑ لیا۔
''پیر پہ پٹی بندھی ہے؟ کیا ہوا؟ اور یہ تم اس وقت سو کیوں رہی ہو؟ اندھیرا ہو گیا اور تم نے شمع تک نہیں جلائی۔ کل رکھ کر تو گئی تھی یہاں۔۔۔'' وہ مطلوبہ جگہ ٹٹولنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ لہرایا اور شمع جلا کر بجھ گیا۔ کھڑکی کی دہلیز پہ شمع ٹکا کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔
کسی ایک سوال کا جواب بھی نہ دیا۔ منی خالہ تھکی ماندی نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگیں۔
''دوپہر کو کچھ کھایا؟ نہیں نا؟ مجھے پہلے سے خبر تھی۔ یہاں تھا ہی کون جو۔۔۔؟ تمہارے خالو کو کہیں جانا تھا، ساتھ میں مجھے بھی لے گئے۔ رہ رہ کر تمہارا خیال آتا رہا۔ وہاں بھی جی نہیں لگا۔ اب آتے ہی کھانا پکایا۔ تمہاری طرف بھاگی ہوں۔'' انہوں نے ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے رکھی۔
وہ خاموشی سے موم بتی کی سرخ زبان کو لپ لپ کر کے اندھیرا نگلتے دیکھتی رہی۔
''تو محترمہ خود عیش کرتی رہیں۔ یہاں میری جان پہ جو بھی آفت، قیامت آئے، ان کی بلا سے۔۔۔'' صبح سے بھوکی نہ ہوتی تو شاید ٹرے اٹھا کر دیوار پر دے مارتی۔
''کھاؤ نا، میں بھی تمہارے ساتھ کھاتی ہوں، لیکن وہ تمہارے خالو۔۔۔ ابھی آ جائیں گے۔ کھانا کھانے میں وہاں نہ ہوں تو۔۔۔'' وہ انگلیاں چٹخا رہی تھیں۔
''ہاں جب آپ یہاں نہیں تھیں تب تو جیسے وہ کھانا ہی نہیں کھاتے تھے۔ نوالے بنا بنا کر منہ میں ڈالتی ہوں گی اس چوچو کے۔'' وہ سارے جہان سے خفا ہوئی بیٹھی تھی۔ دانتوں تلے زبان دبائے ٹرے اپنی طرف کھسکا لی۔
''تم سے کہا تھا دیے میں تیل ڈلوا لو، رات گئے بہت اندھیرا ہو جاتا ہو گا نا۔''
''جانے دیجیے، یہاں اندھے کنوئیں میں بیٹھ کر بانگ درا لکھنی ہے کسی نے جو روشنی کی ضرورت ہو۔ اور پہلے کون سی آسائشیں دے ڈالیں جواب ذرا سی روشنی کے لیے اتنا تردد ہو رہا ہے۔ ایک چارپائی تک تو۔۔۔''
''تم نے بتایا نہیں، پیر پہ کیا ہوا؟'' منی خالہ اسے بولنے کے لیے مجبور کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ بے زار و لاچار۔۔۔ بولنے کو دل ہی کہاں چاہ رہا تھا۔ تنگ آ کر انہیں یاد دلایا۔۔۔
''بانکے خالو، آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔''
''اوہ۔۔ ہاں۔۔۔'' بھولی ہوئی بات نے ڈنک مارا تھا۔ وہ پھرتی سے اٹھیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر کو لپکیں۔
''کیسی عجیب سی ہو گئی ہیں منی خالہ۔۔۔ بہانے باز، جھوٹی اور پرائی بھی۔ بات کرتے ہوئے نظریں چراتی رہتی ہیں۔ اب معلوم نہیں واقعی کہیں گئی تھیں یا مجھے ہی کھانا دینا بھول گئیں۔ افوہ یہ یہاں آ کر تو انسان بدل ہی جاتا ہے۔ وہ، وہ نہیں رہیں۔ میں، میں نہیں رہی۔ اور بانکے خالو، وہ تو اسٹیشن پہ اترتے ہی شاید کہیں کھو گئے تھے۔ عجب جادونگری ہے یہ۔۔۔'' اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پانی پیا۔

برتن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے۔ ہوا کا ذرا سا جھونکا آیا تھا۔ موم بتی کی لو لرزنے لگی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی آڑ بنا کر اسے بجھنے سے بچایا اور باہر جھانکنے کی کوشش کی۔
تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مگر اسے معلوم تھا سامنے کے دروازے پہ ابھی بھی بڑا سا قفل پڑا ہے۔ صبح اس کے اٹھنے سے قبل ہی اس کمرے کا مکین اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ معلوم نہیں کون تھا اور کون نہیں۔
موم بتی بجھنے کے قریب تھی، اور اس کا دل بھی۔۔۔ ایسا کالا سیاہ اندھیرا اترتا تھا اس کمرے میں کہ حد نہیں۔
''ہائے روشنی ذرا سی بھی ہو، اچھی تو لگتی ہے نا۔۔۔'' وہ سوٹ کیس کی طرف آ گئی۔ کھولا اور ٹٹول ٹٹول کر چراغ ڈھونڈنے لگی۔ تب ہی کوئی چیز کھڑکھڑائی، نکال کر روشنی میں دیکھا۔ وہی کھٹی میٹھی املیاں، بانکے خالو نے سفر میں لے کر دی تھیں۔ کچھ کھا چکی تھی کچھ رکھ کر بھول گئی تھی۔ اب کتنی خوشی ہو رہی تھی انہیں دیکھ کر۔ نکال کر اپنے بستر پر چلی آئی۔ چراغ سنبھال کر اپنے سرہانے رکھا۔ موم بتی کی لو آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس نے بے دردی سے ہتھیلی اوپر رکھی اور زور سے مسل ڈالی۔ بڑی جلن ہوئی، مگر یہاں پروا کسے تھی۔ تب ہی کمرے سے باہر قدموں کی آہٹ ہوئی، ذرا دیر بعد تالا کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے اچک کر دیکھا۔ کمرا روشنی سے بھر گیا تھا۔ لمحے میں ایک تیر سا گڑ گیا تھا سینے میں۔
''کس طمطراق سے روشنی پھیلتی ہے ہر طرف۔ یوں جیسے کمرے میں سورج طلوع ہو رہا ہو۔ اور یہاں اس تین بائی پانچ فٹ کی قبر میں یہ چراغ جلے گا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر چراغ اٹھایا۔
''کیا وقعت ہے اس کی، اور کیا حیثیت، لوگ چکا چوند روشنیوں میں جیتے ہیں اور میرے لیے یہ جلتی مرتی روشنی والا بڈھا چراغ، دیواروں پر سائے بنیں گے۔ بن بن کر مجھے ڈرائیں گے۔ یہ کاٹھ کباڑ نجانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ہونہہ، بھاڑ میں جائے ایسی روشنی۔ جہنم میں جلیں یہ دیے۔'' اس نے چراغ کو ہاتھ میں تولا اور زور سے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر پہ دے مارا۔ زوردار آواز پیدا ہوئی۔ اگلا لمحہ پھر خاموشی کا تھا۔
''ہونہہ، ابا میاں کی نشانی، گلتی رہے اس انبار تلے۔'' اس نے ایک ساتھ ابا میاں اور منی خالہ کا بدلہ چکایا، اور پھر گھور اندھیرے میں بیٹھ کر کھٹی میٹھی املیاں چوستے ہوئے اس نے سارے خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیے تھے۔

☆☆☆

زرد رو سنہری کرنیں سامنے کی دیوار پر اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ سورج ابھی کچھ دیر پہلے نکلا تھا۔ لیکن وہ بہت دیر سے جاگ رہی تھی۔ شاید اس وقت سے جب کوئی چپل گھسیٹتا اس کمرے کے سامنے سے گزرا اور پھر دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔
رات بھر کمرے کے حبس میں بے قرار ہو کر کروٹیں بدلنے کے بعد ایک وہی ذرا سا وقت ہوتا تھا۔ جب مزے کی نیند آ جاتی تھی مگر آج جی اچاٹ ہو چکا تھا۔ سو چادر اتار کر باہر نکل آئی۔ صبح کی اولین ساعتوں کی ٹھنڈی، خوشبودار ہوا نے اس کے گالوں کو نرمی سے سہلایا۔ تو ساری کلفت دور ہو گئی۔ جگ سے پانی لے کر دو چار چھپا کے منہ پہ مارے اور ٹہلنے لگی۔ کبھی نیم کی شاخوں سے جھولی، کبھی دیوار سے

لٹکی۔اور کبھی سیمنٹ کی جالیوں میں ناک گھسا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صحن میں جھانکنے لگی۔

باہر گلی میں رفتہ رفتہ چہل پہل کا آغاز ہوا اور پھر رونق بڑھتی چلی گئی۔ دودھ والوں کی آمدورفت، سبزی، پھل فروشوں کی پکار، سائیکلوں کی ٹنانن، موٹر سائیکل، رکشوں کی پھٹا پھٹ، بچوں کی نرم، ہنستی کھلکھلاتی آوازیں۔۔۔اور ان سب کے ساتھ صبح کے ناشتوں کی خوشبودار سی مہک، پراٹھوں، پوریوں، آملیٹ اور لسی کی مہک۔ چائے کی خوشبو اور دھوئیں کی میٹھی سی کڑواہٹ، جو اس کے حلق میں گھس کر معدے کو بے چین کر گئی تھی۔

رات کے برتن ہاتھوں میں لیے وہ سیدھی نیچے اترتی چلی گئی۔ آخری سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی منی خالہ کی ساس پہ نظر جا پڑی جو اپنا تخت طاؤس سنبھالے قدموں کی آہٹ پر اب اسی کی طرف متوجہ تھیں جس لمحے اس نے آخری قدم سیڑھی سے نیچے اتارا عین اسی لمحے منی خالہ باورچی خانے کے دروازے سے برآمد ہوئی تھیں۔

''ہائے ہائے بھادوں ختم ہونے کو آیا۔ پر یہ آسمان گِدھوں، چیلوں سے خالی نہ ہوا، کم بخت منحوس شکلوں والی مخلوق، ادھر دن چڑھا ادھر سر پہ منڈلانے لگی۔ ڈھنگ سے کھانا بھی نصیب میں نہیں۔'' کیسی کراری، پھٹے ڈھول جیسی آواز تھی ان کی، منی خالہ گولی کی سی تیز رفتار سے ان کی طرف بھاگیں۔ وہ منہ کھولے ناسمجھی کے عالم میں خالی آسمان کو تکنے لگی۔ تب ہی کسی نے برتن اس کے ہاتھ سے اچک لیے۔ وہ بری طرح چونکی۔

☆☆☆

نہائے دھوئے عرصہ گزر گیا۔ سفر کا میل کچیل بھی ساتھ لیے پھرتی تھی۔ کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھائے، ورنہ وہ تو ڈر کے مارے کم ہی ادھر کا رخ کرتی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا، چنگیز خان کو ناشتے میں محو دیکھا تو بھاگ کر کپڑوں کا دوسرا جوڑا اٹھا لائی۔ خوب رگڑ رگڑ کر نہائی۔ کپڑے بدلے اور برسی ہوئی بدلی کی طرح ہلکی پھلکی ہو کر نکھری نکھری سی باہر نکل آئی۔ میلے کپڑے گول مول کر کے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔ جسے بھاگ کر منی خالہ نے جھپٹ لیا۔ ان کی افراتفری سمجھ سے باہر تھی۔

''اوں ہوں۔ خوشبودار صابن کیا ہاتھ میں آ گیا۔ آپے سے باہر ہی ہو گئیں۔ جھاگ وجھاگ ہو گیا سارا غسل خانہ۔۔۔اے بہو۔۔۔ایک دو جھاڑو لگاؤ یہاں۔۔۔'' کیا تحکمانہ انداز تھا اور پھر جو کہا تھا۔ نور کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ دونوں باتوں میں سے کس پر حیران ہو، وہ کیا کوئی گنوار، جاہل لڑکی تھی جسے نہانے کے طور طریقے نہ آتے تھے۔ وہ ٹکر ٹکر منی خالہ کو دیکھنے لگی جو جھاڑو لے کر غسل خانے کو بھاگی جا رہی تھیں۔

وہ خود جو ہاتھ دھوئے بغیر ہی واپس پلٹ آئی تھیں۔

اب تیکھے انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔

''کب تک مینار پاکستان بن کر کھڑی رہو گی۔ وہاں برآمدے میں دیکھو۔ بچے کھا رہے تھے۔ کچھ بچ وچ گیا ہو تو تم بھی۔۔۔''

''جی۔۔۔'' وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''اب کھڑی منہ کیا تک رہی ہو؟ کیا میں نہیں جانتی کن بھیک منگوں کی اولاد ہو تم؟ باپ مر

گیا تو دودھیال والے دو دن روٹی نہ کھلا سکے۔ اماں سمیت نانا کے سر ڈال گئے۔ وہ کھاؤں کھاؤں کرتی بنا علاج کے مر کھپ گئی۔ اور وہ بڈھے میاں، اصغر علی مہتاب ایک کو تو ہمارے سر منڈھنا ہی تھا۔ جاتے جاتے دوسری کو بھی ہمارے ہی کھاتے میں ڈال گئے۔ کم تو وہ بھی نہیں، چوبیس سال سے ہمارے سینے پہ مونگ دل رہا ہے۔ ہمارا ہی حوصلہ ہے جو سہہ لیا۔ ورنہ میری بیٹی کس کس چیز کے لیے نہ ترستی تھی۔ آج بھی سوچتی ہوں تو کلیجہ۔۔۔''

وہ زمین میں گڑی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کیسے منی خالہ نے اسے کھینچا اور سیڑھیوں تک لائیں۔ وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ دبے دبے لفظوں میں، سرگوشیوں میں، مگر وہ سن ہی نہ پائی تھی۔ بس سیڑھیوں کا راستہ، نجات کا راستہ تھا۔ اس نے قدم رکھا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

''گز بھر لمبی زبان، اللہ کرے کٹ جائے، کیڑے پڑیں، گونگی ہو جائیں۔ غاں غاں کرتی پھریں۔ کوئی سننے کو، سمجھنے والا نہ ہو۔۔۔کیسی کیسی باتیں سنائیں مجھے، نہ لحاظ، نہ پاس داری، میرے دودھیال والوں نے میری اماں کو اپنے پاس نہ رکھا تو انہیں کیا تکلیف۔۔۔؟ اور پھر رکھتا بھی کون؟'' نوعمر چچا ہی تو تھے۔ ذمہ داریوں سے گھبرا کر اماں کو ابا میاں کے پاس چھوڑ گئے۔ اور اگر میری اماں علاج کے بغیر مریں تو بھی ان کا کیا گیا۔ اور بیٹی کا رونا نجانے کیوں بے وقت رو رہی تھیں۔ کیا میں نہیں جانتی ان کے اللّے تللّے فرمائشوں نے ماحول کو کس درجہ عاجز کیا ہوا تھا۔ دو چار دن سے زیادہ ٹکتی ہی کب تھیں ہمارے ہاں۔ جب دیکھو یہاں آنے کو تیار۔ اور مر مرا گئیں، تو وہ بھی ہمارا قصور۔۔۔ہونہہ۔۔۔ابھی تو میکے میں جان دی تھی۔ سسرال میں مرتیں تو شاید اب تک ان کے کیے گیے مقدمے ہی بھگت رہے ہوتے، یا اللہ۔'' اس نے تھک ہار کر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

''ابھی تو چند ہی دن گزرے ہیں، دو پاپوں اور ایک سوکھی روٹی کے بدلے ایسی ذلت۔ میں وہیں ابا میاں کے گھر میں کیوں نہ رہ گئی؟''

اس کے لبوں سے بے اختیار ہی ''آہ'' نکل رہی تھی۔

''بے چاری منی خالہ جب ہی تو ایسی ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ یہاں لانے سے گریزاں۔۔۔'' وہ پنڈولم کی طرح جھولنے لگی۔ دروازے پہ ہلکی سی آہٹ ہوئی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر خود بخود ہی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

منی خالہ اس کے قریب آ بیٹھیں۔ چوکڑی مار کر۔۔۔یوں جیسے بہت فرصت سے ہوں اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

دبیز دھند کے اس پار نور القمر نے ان کے ہونٹوں کو ذرا کو ذرا سا پھیلتے دیکھا۔

''کیا منی خالہ مسکرا رہی ہیں؟'' اس نے زور سے پلکیں جھپکیں۔ دو آنسو لڑھک کر گالوں پہ ٹھہر گئے۔ سامنے بکھری ہوئی تھی وہی مسکراہٹ جو موتیا کے پھولوں کو دھاگے میں پروتے ہوئے ان کے شاداب چہرے پہ بکھر جایا کرتی تھی۔

جاندار۔۔بھرپور۔۔۔زندگی کی عکاس مسکراہٹ۔

اس کی منی خالہ بیٹھی تھیں۔ بالکل اپنی منی خالہ۔ وہ بے اختیار ہی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ روتی جارہی تھی۔ منی خالہ اسے بانہوں میں سمیٹے مسکراتی رہیں۔

''کوئی دکھ بانٹ لینے والا ہو تو دکھ سہنا کتنا آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی آپ کے آنسو سارے چن کر بدلے میں ہنسی دے دے تو دل میں کسک نہیں رہتی۔'' وہ بھی اگلا پچھلا غبار نکال کر سیدھی ہوئی تو بہت مطمئن تھی۔ گھنے سیاہ بال پشت پہ بوجھ لگ رہے تھے۔ انہیں دو چار بل دے کر جوڑا بنالیا۔ اور چہرے پہ آئی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے منی خالہ کی طرف دیکھا۔ وہ ناشتا اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

''چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔'' ساتھ ہی انہوں نے اطلاع دی۔

''کوئی بات نہیں۔'' سارا قصور اپنا تھا، اس لیے اعتراض نہیں کیا۔

''میں اب چلوں۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔'' جھکا ہوا سر اثبات میں ہلا دیا، منی خالہ اٹھ کر باہر نکل گئیں اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

''اف۔۔۔ ہماری قسمت میں پھر یہ ہی۔۔۔'' اس نے دانت پیسے۔

''یہ دونوں پاپے آنکھوں پہ باندھ لوں۔ اس سڑی ہوئی چائے کو پگھلا ہوا سیسہ سمجھ کر اپنے کانوں میں انڈیل لوں تو اس گھر میں رہنا کتنا آسان ہو جائے گا میرے لیے۔''

☆☆☆

سورج سوا نیزے پر تھا اور مارے بھوک کے اس کے پیٹ میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ ادھر اُدھر کے چکر لگا کر وہ بے چارگی سے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

''کیونکر گزارا پاؤں گی یہاں، اتنے بہت سے دن، یا اللہ کیا اب کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہو گا۔'' دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو دباتے ہوئے وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس گھر میں دوپہر کا کھانا نہیں پکتا تھا۔ یہ بات اسے منی خالہ نے نہیں بتائی تھی بلکہ منی خالہ نے تو اسے اور بھی بہت کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر اب کچھ باتیں وہ بغیر کہے سنے ہی جاننے لگی تھی۔

باورچی خانے کا سب انتظام منی خالہ کی ساس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک ایک چیز پہ لگے تالے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ دوپہر کو کھانے کی ضرورت اس لیے محسوس نہ ہوتی تھی کہ افراد خانہ ان ''لوازمات'' سے پیٹ پوجا کر لیتے تھے جو ان کے کمروں میں ہمہ وقت موجود ہوتے تھے۔ رہی سہی کسر باہر سے آنے والا کھانا پوری کر دیتا تھا۔ اب یہ تو ان دونوں کی بدقسمتی تھی کہ وہ ''افراد خانہ'' میں شمار نہ ہوتی تھیں۔

''منی خالہ! آپ تو شاید ہوا، پانی پر ہی گزارہ کر لیں لیکن اگر یہ صورت حال رہی تو مجھ پہ بہت جلد فاتحہ پڑھ لیں گی آپ۔۔۔''

وہ نڈھال سی ہو کر چت لیٹ گئی۔ ذرا سی غنودگی طاری ہوئی اور پلاؤ، زردے کی بھری ہوئی پلیٹیں سامنے آ کر ناچنے لگیں، اس نے نان قورمے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا جب ہاتھ پانی کے گلاس کو جا لگا۔ چھناکے کی آواز ابھری اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھی۔ دروازہ کھول کر منی خالہ اندر آ رہی تھیں۔ اس نے بڑی امید سے انہیں دیکھا۔

ساڑھی کے پلو سے ان کا ہاتھ برآمد ہوا اور ایک شاپر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولیں۔

''یہ لو۔۔۔ وقت بے وقت کے لیے سنبھال رکھنا، یہاں چیز منگانی بہت مشکل ہے۔'' وہ دروازے کی طرف پلٹیں پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔

''دروازہ کھلا کیوں رکھتی ہو نور! کنڈی لگا کے رکھا کرو۔''

اس نے شاپر کھولتے ہوئے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ باہر نکل گئیں۔ شاپر کھول کر ندیدوں کی طرح دیکھا۔ چند باقر خانیاں تھیں۔ کچھ کریم رول ایک ڈبل روٹی، اس نے دل ہی دل میں منی خالہ کو ڈھیروں دعائیں دیں۔

ایک باقر خانی، ایک کریم رول کھا کر دو گلاس پانی پیا اور باقی سب سوٹ کیس میں چھپا کر نیچے آ گئی۔ منی خالہ کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ نیچے حسب توقع سکوت طاری تھا۔ جالی دار بند دروازوں کے پیچھے پراسراری تاریکی اور سناٹا۔ اسے ہر دروازے سے دو چار آنکھیں خود کو گھورتی محسوس ہوئیں تو بھاگ کر منی خالہ کے کمرے میں گھس گئی۔ آہٹ پر انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اپنی ساڑھی استری کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ گیس سے چلنے والی استری کی ہلکی سی شوں شوں کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہ ابھر رہی تھی۔ اس نے نیم تاریک کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اور پھر منی خالہ کو دیکھنے لگی۔ بے حد گھنے، سیال لمبے بال پشت پہ بکھرے تھے۔ جن کی نوکوں میں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ گویا ابھی ابھی نہا کر نکلی تھیں۔ سیاہ رنگ کی سوتی ساڑھی میں ان کا اجلا نکھرا چاند سا مکھڑا دمک رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہی ان کے پاس نزدیک چلی آئی۔

''کہیں جا رہی ہیں؟''

''ہاں۔۔۔'' بہت مختصر جواب تھا۔ قدرے کھوئی کھوئی، الجھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے بغور ان کا چہرہ دیکھا۔ پلکوں کی جڑوں میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔ گلابی ہونٹوں پہ وقفوں وقفوں سے کپکپاہٹ سی اتر آئی۔

''ٹک۔۔۔'' کی آواز سے انہوں نے استری کا بٹن گھمایا اور بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ بھی ذرا سا چونکتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔ بالوں کو جھٹک کر تولیے سے ہلکا ہلکا دبا کر خشک کرنے تک وہ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی تھی، منی خالہ بھی اسے یوں بھولیں جیسے کمرے میں اس کی موجودگی سے ناواقف ہوں۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ساڑھی کا پلّو ہٹایا تو وہ پلٹ کر دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

دروازے کے اس پار وسیع صحن میں پھیلی خاموشی میں ایک پیاسی چڑیا کی چوں چوں نے کتنے ہی ننھے منے چھید بنا ڈالے تھے۔ سائے لمبے ہو رہے تھے اور دھوپ پیلی پڑ چکی تھی۔ بس ذرا سی دیر تھی۔ اور پھر یہاں وہاں تک ہر رنگ نارنجی رنگ کی سرخی میں ڈوب جانا تھا۔

''آ جاؤ نور!'' منی خالہ کی مدھم پکار پر وہ پلٹی، منی خالہ لباس تبدیل کر چکی تھیں۔ انہیں سنگھار میز کے سامنے بیٹھتے دیکھ کر اس نے بتی جلا دی۔ دودھیا روشنی میں ان کا نازک سراپا ایک دم نمایاں تھا۔

''رہنے دیا ہوتا نور۔۔۔'' ستی ہوئی آواز میں انہوں نے ٹوکا۔

''اندھیرے میں تیار کیسے ہوں گی؟'' وہ لکڑی کا کنگھا اٹھا کر ان کے بال سلجھانے لگی۔

''جانا کہاں پر ہے؟''

"تمہارے خالو کے دوستوں نے دعوت کی ہے۔" وہ سنگھار میز پہ بکھری چیزوں میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔

"ارے۔۔۔تو کیا مردوں کی محفل میں۔۔۔" اس کا ہاتھ ایک دم رک گیا۔

"افوہ، ان کی بیگمات بھی تو ہوں گی نا ساتھ۔"

"پھر بھی، یوں بن سج کر مردوں کے سامنے جانا ہمارے خاندان کی ریت تو نہیں، کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟" انہیں چیزوں کی اٹھا پٹخ کرتے دیکھ کر اس نے اپنی بات درمیان میں ہی چھوڑ دی۔

"آئینہ تھا یہاں پر۔"

"یہ سامنے ہی تو رکھا ہے۔" اس نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے آئینہ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیا۔

"چٹیا بنائیں گی یا جوڑا۔۔۔" بالوں کو خوب اچھی طرح سلجھا کر اس نے پوچھا۔

"بس یونہی کھلے رہنے دو۔۔۔" وہ لپ اسٹک لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں کی لرزش سے بار بار خراب ہو رہی تھی۔

"وہ کیوں بھلا؟ اتنے سارے غیر مردوں کی نگاہ پڑے گی۔۔۔" ان کا ہی پڑھایا ہوا سبق تھا جو وہ دہرا بیٹھی۔

"ٹھک۔۔۔" سے کوئی چیز گری۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پیروں کے پاس پڑی لپ اسٹک کو دیکھا اور پھر جھک کر اٹھالی۔

"اوہو۔۔۔ یہ تو ٹوٹ گئی منی خالہ۔۔۔" اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے بچی کھچی لپ اسٹک ان کی طرف بڑھائی، جسے اس کے ہاتھوں سے لے کر انہوں نے سنگھار میز پر پٹخ دیا تھا۔

"تم جاؤ نور! میں خود ہی تیار ہو جاؤں گی۔ یوں بھی تمہارے خالو آنے والے ہیں۔" بے دردی سے ہونٹ چباتے، تیزی سے پلکیں جھپکتے وہ اسے جانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

اس کا دل چاہا کہہ دے "بانکے خالو مجھ سے پردہ تو نہیں کرتے۔" مگر منی خالہ یوں غیریت برت رہی تھیں تو پھر وہ بھلا کیوں رکتی۔ دروازے کی طرف جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ وہ گہرے نیلے بارڈر والی فیروزی ساڑھی کے ساتھ پہننے کے لیے نیلے اور فیروزی موتیوں کا بھاری ہار سنگھار میز کی دراز سے نکال رہی تھیں۔ اور یہ ہار نکالتے ہوئے دو بار ان کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پہ گرا تھا۔

"یہ منی خالہ کو ہوا کیا ہے؟" وہ ان کے غیر معمولی رویے کو سوچتی چھت پہ آ گئی تھی۔

سرمئی شام پہ یکلخت ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ ردی اخباروں میں سے ڈھونڈ نکالے رسالے میں کھوئی نور نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سیاہ بادل کھڑکی پہ جھکے چلے آ رہے تھے۔ نٹ کھٹ، شریر ہوا کھڑکی کے راستے اندر آئی اور کمرے میں چک پھیریاں کھاتی دروازے سے باہر نکل گئی۔

"ہائیں۔۔۔ اتنے سیاہ بادل۔۔۔ کب آئے، کب چھائے۔۔۔؟ خبر ہی نہ ہوئی۔"

وہ گھبرا کر جھٹ پٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی بارش آ جاتی تو پہلی بوچھاڑ میں ہی بستر گیلا، اس نے رسالہ تکیے کے نیچے رکھا اور لمحوں میں بستر گول۔ خود دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اف۔۔۔ ہوا کیسی جھوم جھوم کے چل رہی تھی۔ رسیلی گھٹا برس جانے کو تیار، نیم کا درخت اپنے آپ میں مست، وہ دونوں بازو

پھیلائے گول گول گھومنے لگی۔

"ہائے آج تو چھاجوں چھاج مینہ برسے، ہر طرف جل تھل ہو جائے۔ اور میں مورنی بن کر آنگن میں خوب ناچوں، مست، مگن، سرشار، تن من بھگو ڈالوں، بے خود ہو جاؤں۔"

آسمان جھکا آ رہا تھا اس پہ، وہ کیوں کر نہ آپے سے باہر ہوتی۔ ایسی آزادی اس سے پہلے کب نصیب ہوئی تھی۔ وہ چھت پہ اکیلی تھی۔ تنہا، اپنی مرضی کی مالک جو دل چاہا کرتی، جب ہی تو ساری چھت پہ بھاگی پھر رہی تھی۔ کبھی دو کونوں سے پکڑ کر دوپٹہ اڑاتی۔ کبھی نیم کی ٹہنیوں سے جھولی۔ کبھی آسمان پہ قلابازیاں کھاتے پرندوں کو پکڑنے کی کوشش کی۔ خوب قلقاریاں مارنے کو جی چاہ رہا تھا۔

"دیکھو۔۔۔ منی خالہ آ گئی ہوں تو انہیں بھی بلا لاؤں۔ دونوں مل کر خوب مزہ لیں گے۔" وہ دیوانی ہوتی دیوار پہ جھک گئی۔ صحن خالی خالی تھا۔ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

"شکر ہے گھر والوں کا اوپر آنا جانا نہیں، ورنہ تو ایسا اچھا موسم غارت ہی ہو جاتا۔" اسے ابا میاں کی یاد آ گئی جن کی دیوانگی اس موسم میں عروج پہ پہنچ جایا کرتی تھی۔ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہو کے رہتا۔ وہ ڈری سہمی کسی کمرے میں دبکی رہتی۔

آج نہ کوئی ڈر تھا، نہ خوف۔۔۔ پھوار پڑنے لگی تھی۔ بادلوں کے سبب وقت سے پہلے رات ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دیوار سے نیچے جھانکا۔ برآمدے میں ستون سے ٹیک لگا کر کھڑے بانکے خالو نے اسے چونکا دیا۔

"بانکے خالو تو یہ رہے۔ گویا منی خالہ بھی آ گئیں۔" وہ پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی، ہوا میں لہراتا دوپٹہ سمیٹ کر بھاگتے بھاگتے اوڑھا۔ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترنے کے بعد صحن میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ گئی تھی۔

برآمدے میں جلے بلب کی روشنی یہاں صحن تک آ رہی تھی۔ گیلے فرش پہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی وہ منی خالہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب ستون کی دوسری جانب کھڑے بانکے خالو یک لخت ہی گھوم کر اس کے سامنے آ گئے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ باریک پھوار حریری پردے کی طرح ان دونوں کے بیچ تن گئی تھی۔

بانکے خالو کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بہت ہولے سے سج گئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بارش کی کن من میں ان کی آواز کی گھمبیرتا اسے خاص طور پر محسوس ہوئی تھی۔

"منی خالہ کے پاس۔۔۔ آ گئی ہیں نا۔۔۔ کمرے میں ہوں گی یا۔۔۔؟" اس نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ باورچی خانے میں اندھیرا تھا۔

"وہ تو ابھی نہیں آئیں۔۔۔" بانکے خالو نے اطلاع دی۔

"نہیں آئیں۔۔۔" اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ "مگر آپ تو۔۔۔"

"وہ میرے ساتھ تو نہیں گئی تھی۔" خالو دو قدم آگے بڑھ آئے تھے۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو کبھی اکیلی باہر نہیں گئیں۔ اور پھر اس وقت تو خالو رات ہو گئی ہے۔ اور دعوت بھی آپ کے دوستوں نے کی تھی۔ پھر آپ کیوں ان کے ساتھ نہیں گئے؟" وہ ایک دم ہی فکر

مند ہو گئی تھی۔

''ارے۔۔۔ارے۔۔۔اتنی پریشانی۔۔۔'' وہ بے اختیار ہی ہنس دیے۔ ''بہت محبت کرتی ہو اپنی خالہ سے؟''

وہ چپ چاپ ان کا منہ دیکھے گئی۔ تب ہی ان کے عقب سے ایک چہرہ نمودار ہوا تھا۔

''کیوں خوامخواہ تنگ کر رہے ہو اسے۔ چندا! تمہارے خالو کی طبیعت خراب تھی، اس لیے یہ رہ گئے۔ اپنی خالہ کے لیے فکرمند نہ ہو۔ وہ اپنے ہی لوگوں میں ہے۔ موسم خراب تھا اس لیے نہیں لوٹ سکی۔ اس نے فون کر دیا تھا۔'' وہی نرم، میٹھا، مدہم، ساحر لہجہ۔۔۔

وہ چپ کھڑی رہ گئی۔

''ساری کی ساری بھیگ گئی ہو، آؤ یہاں بیٹھو۔'' اس کے ہنسنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ ہاتھ بڑھا کر نور کو اپنی طرف کھینچا تو وہ بے بس ہو گئی۔ برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی تو اس نے کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔

بازار کا کھانا تھا۔ تندوری روٹی، آلو کا سالن، منی خالہ گھر پہ نہیں تھیں۔ بعد میں کون کھانا لیے پیچھے پیچھے آتا اس نے پلیٹ اپنی طرف کھینچی، مگر نہ جانے کیوں، کھانے کو جی نہ چاہا۔ آدھی، پون روٹی گزارے کے لیے کھائی اور برتن ڈھاپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

بانکے خالو ابھی تک ستون سے لگے کھڑے تھے۔ بارش تیز ہو گئی تھی، ہوا ہر بار ان پر کچھ نہ کچھ پانی گراتی۔ ذرا ذرا سا بھیگ گئے تھے۔ بارش کے باریک قطرے بلب کی روشنی میں ان کے بالوں پر دمک رہے تھے۔ ان کے برابر آتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا سنجیدہ چہرہ بیک وقت اپنا بھی لگ رہا تھا۔ اور بہت پرایا بھی۔

''خالو! آپ جا کر انہیں لے آتے تو اچھا تھا۔۔۔'' نجانے کیوں لہجے میں لجاجت سی اتر آئی تھی۔ سینے پہ ہاتھ باندھے، ترچھی نگاہوں سے اسے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں۔۔۔ بارش رک جائے تو جاتا ہوں۔'' لہجہ تسلی آمیز تھا۔

وہ بارش سے بچنے کے لیے دیوار کے ساتھ لگے لگے اوپر آ گئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو دروازہ بھیڑتے ہوئے ہاتھ خود بخود کنڈی کی طرف اٹھ گئے۔ منی خالہ گھر پر نہ تھیں۔ اس احساس نے اسے گویا سڑک پہ لا کھڑا کیا تھا۔ کنڈی لگا کر اپنے مطلوبہ جگہ کی طرف بڑھی تو پہلا قدم ہی چھپاک سے پانی میں پڑا۔ جالی دار کھڑکی سے آنے والا سارا پانی یہیں پر تو جمع ہونا تھا۔ اس نے پیر واپس کھینچ لیا۔ اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ اندازاً آگے بڑھی اور لکڑی کے اس صندق پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ [illegible] کھانے کے برتن وغیرہ رکھنے کے لیے منی خالہ نے کھینچ کھانچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔

باہر بادل دیوانہ وار برس رہے تھے دھواں دار بارش بالکل ویسی، جیسی وہ چاہ رہی تھی۔ لیکن کچھ دیر پہلے، اب تو دل چاہ رہا تھا ایک اشارہ کرے اور بارش غائب۔۔۔ دوسرے اشارے سے بادل چھٹ جائیں۔ بانکے خالو بھاگ کر خالہ کو لے آئیں۔ یا پھر منی خالہ ہی اڑ کر یہاں تک آ پہنچیں۔

بجلی زور سے کڑکی تھی۔ اس نے سہم کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے۔ دل ہی دل میں ''جل تو

جلال تو'' کا ورد کرنے لگی۔

''اس موسم کی خوشی مجھے کبھی راس نہیں آئی۔'' اس کا دل بھر آیا۔

''بے چاری منی خالہ! دن کی روشنی میں گھر سے نہ نکلنے والی رات کو گھر سے باہر ہیں وہ بھی ایسے خراب موسم میں۔ پرائے لوگوں کے بیچ۔۔۔ دل تو اندر سے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا ہو گا۔ اور اس پریشانی میں بھی رہ رہ کر میرا خیال آتا ہو گا کہ کہیں بھوکی نہ بیٹھی رہوں۔ اور اب، بارش ساری رات نہ رکی تو؟''

وہ بے چین ہو کر کھڑکی تک آئی تیز بوچھاڑ نے لمحوں میں بھگو ڈالا تھا۔ وہ بغیر پروا کیے جالی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ نیچے صحن میں پرنالے سے گرتے پانی نے اچھا خاصا شور مچا رکھا تھا۔ ٹھوکریں مارتی ہوا برستے پانی سے مقابلہ پہ اتری خاصی خونخوار ہوئی جا رہی تھی۔ بارش رکنے کا کوئی امکان نظر نہ آیا تو وہ تھک کر دوبارہ صندوق پہ آ بیٹھی۔

''اگر خالو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی انہیں جانے کی۔ ہونہہ۔۔۔'' وہ خوامخواہ جھنجھلا رہی تھی۔ وہم، خدشے، ڈر اور یہ خوفناک سا موسم، کیا کچھ نہیں ڈرا رہا تھا اسے۔

''کیا خبر؟ اس پچھل پیری نے زور و زبردستی ہی بھجوا دیا ہو۔ منی خالہ کا وجود اس گھر میں کہاں برداشت ہوتا ہو گا ان سے۔'' گیلے کپڑوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں ٹٹول کر سوٹ کیس کھولا۔ دھلے ہوئے کپڑے نکال کر بدلے۔ بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا اسے سونے کی فکر ہوئی۔ پانی کیسے نکالوں؟ بستر کہاں بچھاؤں؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتی رہی۔ پھر تھک کر دوبارہ صندوق پہ جا بیٹھی۔

بہت سا وقت بیت گیا۔ بارش رکتے رکتے بالآخر رک ہی گئی وہ کنڈی کھول کر باہر نکلی، پہلا کام صحن میں جھانکنے کا کیا۔ برآمدے کا بلب روشن تھا۔ لیکن کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر کمرے میں آ گئی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے بہت سا وقت بتا دیا۔ پانی نکالنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

''ذرا سی روشنی ہوتی تو۔۔۔''

''روز کہتی ہوں دیے میں تیل ڈلوا لو۔۔۔'' ایک بازگشت کی خاموشی میں گونجی۔

وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ابا میاں کا گلا سڑا چراغ یاد آیا تھا۔ پھر سے صندوق سنبھالا، دیوار سے ٹیک لگائی اور سر کندھے پر گرا دیا۔ نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ بادل ایک دوسرے سے ہاتھ چھڑائے یہاں وہاں بھاگ رہے تھے۔ چاند کبھی کبھی اپنی چھب دکھلا کر غائب ہو جاتا۔ رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی۔ وہ ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے تھک سی گئی تھی۔ جب رات کے سناٹے میں قدموں کی مخصوص چاپ دھیرے دھیرے اوپر آنے لگی۔

خوب ہوئی تیری اے عشق پذیرائی
تا حشر مقدر میں لکھ دی گئی رسوائی

دھیمے سُروں میں گاتا وہ دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ سرسراتی ہوا کے ساتھ غمناک اور دلگیر آواز کمرے کے اندھیرے میں چک پھیریاں سی کھانے لگی تھی۔

اے دوست! مجھے تُو نے وہ چیز عطا کی ہے
سوغات شب ہجراں اور عالم تنہائی

نورالقمر کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ دل تو پہلے سے بھرا ہوا تھا۔ اب آنکھ بھی بھر آئی، دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ آنسو بہانے لگی تھی۔ آج دروازے پہ لگا تالا کھلنے میں نہ آرہا تھا۔

سوغات شب ہجراں اور عالم تنہائی

''کون ہے یہ آوارہ نکما۔۔۔ رات گئے واپس آتا ہے اور صبح کے اُجالے سے پہلے چلا جاتا ہے۔''

اے دوست مجھے تو نے۔۔۔

عجب بے چینی سی بے چینی تھی۔ وہ وہیں گول مول ہو کر لیٹ گئی۔

سوغات شب ہجراں اور

''ہاہ۔۔۔ عالم تنہائی۔ کیوں دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے۔ یہ بدبخت۔۔۔ آج اس کا دل بھی کمرے میں نہیں لگ رہا کیا؟'' وہ اٹھی اور پانی میں پیر دھوتی اپنی بلی جیسی آنکھوں سے باہر جھانکنے لگی۔ رات کے اس پہر چلتی ہوا سے اس کا ملبوس ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اور وہ عالم بے خودی میں گنگناتے ہوئے سیمنٹ کی جالیوں سے ٹیک لگائے اندھیرے چاند کو تک رہا تھا۔ اس کی نمناک آواز پرسکوت فضا میں ہلکی ہلکی لہریں سی ڈال رہی تھی یوں جیسے رات گئے سمندر کی پرسکون لہریں ساحل کی ہموار ریت پر اپنا ہلکا سا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔

اے دوست! مجھے تو نے وہ چیز عطا کی ہے
سوغات شب ہجراں اور عالم تنہائی

نیم کی شاخوں میں دبکے کسی پرندے نے پر پھیلا کر انگڑائی لی تو پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ لمحہ بھر کے لیے چونکا اور پھر صحن میں بکھری نیم جان سی چاندنی کو اپنے پیروں تلے روندتا کمرے میں چلا گیا۔

وہ کچھ دیر خالی، گیلے کمرے کو تکتی رہی اور پھر اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ بدن سے ٹکرانے والی ہوا نمی سے بھرپور اور ٹھنڈک سے لبریز تھی۔ وہ دہلیز پہ ٹک گئی۔

کیا خوب ہوئی تیری اے عشق پذیرائی
تا حشر مقدر میں لکھ دی گئی رسوائی

بے ارادہ ہی وہ زیرلب دہرانے لگی۔ پھر یک لخت خاموش ہوگئی۔ اسے منی خالہ بے طرح یاد آ گئی تھیں۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا اور وہ چھت پہ یہاں سے وہاں تک چکراتی باؤلی ہوگئی تھی، رات ساری آنکھوں میں کاٹی تھی۔ سونے کی جگہ نہ تھی، بمشکل وقت گزارا۔ رات جس اذیت میں کٹی تھی۔ دن کا آغاز اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ انداز میں ہوا تھا۔

''تمہاری خالہ نہیں لوٹیں ابھی تک۔'' جس لمحے اپنی تنی ہوئی مغرور بھنوئیں اچکائے خالو کی بیگم نے اسے اطلاع دی تھی اسے لمحے وہ نور کو دنیا کی منحوس ترین عورت لگی تھی۔

کسی قدر گھبرا کر اس نے خالو کی طرف دیکھا تھا۔

لب بھینچے سنجیدہ چہرہ لیے وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے۔

پیشانی سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اور نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

''خالو! آپ گئے نہیں انہیں لینے؟''

''گئے تھے، اور کیوں نہ جاتے بھلا، رات نجانے کس طرح کانٹوں پر بسر کی تھی اور صبح پتا چلا محترمہ رات ہی ان کے کسی دوست کے ساتھ گھر جانے کے لیے نکل گئی تھیں۔''

کھچ۔۔۔ کھچ۔۔۔ تیز دھار چھریاں اس کے بدن میں گھستی چلی گئیں۔

''نہیں۔۔۔ نہیں خالو! یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں انہیں خوب جانتی ہوں وہ بلا جواز بلا ضرورت کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ اور رات گئے کسی غیر کے ساتھ نہیں ناممکن، آپ جائیں خالو، دوبارہ معلوم کریں۔'' ٹھوس لہجے کے ساتھ آن واحد میں اس نے ان کی بات کو مسترد کر دیا تھا۔

خالو سے زیادہ ان کی بیگم کو ناگوار گزرا تھا۔

''وہ تو نکلی ہیں سیر سپاٹے پر، سارا شہر گھوم پھر کر آئیں گی۔ یہ بے چارے کہاں گلی، کوچوں میں خوار ہوتے پھریں گے۔''

''آپ میری خالہ کے متعلق اس طرح بات مت کریں۔'' اس کی آواز بے اختیار ہی بلند ہوگئی۔

''انہیں کوئی شوق نہیں اس طرح سڑکوں، پارکوں میں چکرائے پھرنے کا۔ وہ اللہ جانے کس مصیبت میں ہوں گی اور آپ ہیں کہ۔۔۔'' خالو نے سلگتی نگاہوں سے اسے دیکھا تو مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

''نور! تم اوپر جاؤ۔'' خالو کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ان سے کچھ کہنے کی کوشش میں وہ چند لمحے کھڑی رہی، مگر پچھل پیری کے پراندے کے گھنگھرو ایک مخصوص تال سے بجنے لگے تھے۔ اس کی طنزیہ مسکراہٹ سے ذہن ایسا منتشر ہوا کہ وہ بس کچھ بھی کہے بغیر اوپر بھاگ آئی تھی۔

''ہونہہ، یہ کوئی نہ سمجھے کہ ان کے آسرے پہ پڑی کوئی مجبور و لاچار لڑکی ہوں۔ شام ہونے تک خالہ گھر میں نہ ہوئیں تو دہائی مچادوں گی۔ ڈھنڈورا پیٹ دوں گی، سارے شہر میں۔'' غصے کے عالم میں بڑبڑاتی رہی ورنہ درحقیقت وہ کیا کرسکتی تھی۔ اس کا بھی خوب علم تھا۔

''ہائے! کیا خبر ان لوگوں نے ہی دھکے دے کر نکال باہر کیا ہو۔'' دل بیٹھنے لگا تو وہ خود اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں۔۔۔ بھلا ایسا کیوں کریں گے یہ۔ اور پھر خالہ خود ہی تو تیار ہو رہی تھیں جانے کے لیے۔'' چھت پہ ٹہلتے ہوئے خود کو دلاسا دیا۔

''مگر ذرا بھی تو فکر نہیں ان لوگوں کو۔ پریشان ہوتے تو ان کی تلاش میں ہلکان ہوئے پھرتے۔ یہاں تو چین ہی چین ہے۔ ہاں بھئی کسی کا کیا جائے گا۔ سارا نقصان میرا، پچھل پیری کی تو جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن میرا ان کے سوا اس دنیا میں کون ہے۔'' بیرونی دیوار سے لگی وہ آنسو بہانے لگی۔

''راہ رستوں کا علم ہوتا تو اب تک انہیں کھوجنے کے لیے سارا شہر چھان آتی۔''

دانتوں سے ناخن کاٹتے کاٹتے پوریں زخمی کرلیں۔ عالم پریشانی میں ہی دھوپ ڈھل گئی۔

صبح سے کچھ کھایا پیا نہ تھا، ایک کریم رول پانی کے ساتھ نگلا اور نیچے آگئی۔ ''کچھ خبر تو لوں۔''

نیچے چنگیز خان نے اسے دیکھتے ہی ہتھیار تیز کرلیے۔

''کیا خدائی فوجدار بھرتی کیے ہیں ہم نے۔ ایک عالم میں مٹرگشت کرتے پھرتے ہیں اور کوئی

پوچھنے والا نہیں۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ غسل خانے میں بند ہو چکی تھیں۔

چہار اطراف پھیلی ویرانی اور بے رونقی پہ نظر کرتی وہ آگے بڑھی۔ کس کو پکارے۔ کس سے سوال جواب کرے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ تب ہی عقب میں غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ وہ گھبرا کر خالہ کے کمرے کے برابر بنی راہداری میں گھس گئی۔ اور تیز تیز چلتی دوسری طرف آ گئی۔ یہاں اجڑے باغ میں آ کر یاد آیا وہ ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکی تھی۔

باغ میں کل رات بارش کے آثار ابھی موجود تھے۔ بے ثمر درختوں کے سبز پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرے ہوئے تھے۔ بارش کے پانی کی باسی مہک درختوں کی جڑوں سے پھوٹ رہی تھی۔ اور بہت سا پانی زمین میں جذب ہونے کے بعد جگہ جگہ پھسلن سی ہو گئی۔ وہ بچتی بچاتی آگے بڑھ آئی۔ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد پیاسی زمین سیراب ہوئی تھی کہ خشک گھاس میں سے کہیں کہیں سبزہ سر اٹھا رہا تھا۔ وہ گھومتی گھامتی کوئل کی کوک سنتی منی خالہ کے کمرے کی بند کھڑکی کے سامنے سے گزری تو ٹھٹک کر رک گئی۔

کھڑکی سے آتی جھنجھناہٹ کی ہلکی سی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''یہاں کون ہوگا؟'' وہ کیاری پھلانگ کر کھڑکی کے عین سامنے پہنچی ہی تھی کہ اچانک کھٹ کی آواز کے ساتھ کھڑکی کھل گئی تھی۔ اس غیر متوقع صورت حال پر وہ بھونچکا رہ گئی تھی اور یا نکے خالو بھی۔ جواب کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے اپنی جگہ ساکت و صامت رہ گئے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ بمشکل اپنے منجمد وجود کو حرکت میں لاتی، کھڑکی کے دونوں پٹ اسی تیزی سے بند ہو گئے تھے، وہ اگلے کئی لمحوں تک سانس نہ لے سکی تھی۔

''وہ کیا سمجھے ہوں گے، میں یہاں کیا کر رہی تھی؟'' اس نے انگلیاں چٹخائیں، ہاتھ میں ٹھنڈک سی اتر آئی تھی۔ مرے مرے قدم اٹھاتی راہداری کی طرف چل دی۔

وہ ڈر رہی تھی، معلوم نہیں خالو اس کی یہاں موجودگی پر کتنے خفا ہوں گے۔ برآمدے میں آنے سے پہلے گردن لمبی کر کے جھانکا، برآمدہ صحن، سب خالی کسی بھی وجود سے عاری اور پاک، اس نے دبے پاؤں برآمدہ پار کیا اور پھر بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

☆☆☆

منی خالہ کو دیکھے ہوئے صدیاں بیت گئی تھیں اور آئندہ نہ جانے کتنے برس انہیں دیکھنے کی آرزو کرتے ہوئے بیت جانے تھے۔ گزرنے والے چوبیس گھنٹے، چوبیس گھنٹے نہیں چوبیس صدیاں تھیں جو مایوسی کی سیاہ چادر اوڑھا کر اسے نڈھال کر گئی تھیں۔ دیوار کے بڑھتے ہوئے سائے میں دیر سے گھٹنوں پر چہرہ ٹکا کر بیٹھے ہوئے اس نے اپنے رخسار پہ سرخ نشان ڈال لیے تھے۔ ڈھلتی ہوئی شام سے قبل کی ساری گرمی اور تپش اس کے وجود نے بڑی آسانی سے جذب کر کے دل کے کسی کونے میں ڈال دی تھی، جو اب بھی دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔

''ہائے کیا اب میں کبھی منی خالہ کو نہیں دیکھ پاؤں گی۔'' دور آسمان کنارے اندھیرے نے اس کی ساری آس، امیدوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

منی خالہ کہیں کھو گئی تھیں۔ اس بڑے شہر کی بارونق سڑکوں نے انہیں نگل لیا تھا یا وہ خود کسی اور دیس

جا نکلی تھیں۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔

نور القمر تو بس اتنا جانتی تھی کہ روح دھیرے دھیرے اس کے بدن کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔

''اور اگر منی خالہ مجھے نہ ملیں تو میں بہت جلد مر جاؤں گی۔ آج رات یا شاید آج رات سے بھی پہلے۔۔۔'' اس نے بمشکل اپنے منجمد وجود کو حرکت دی اور سیمنٹ کی جالیوں میں انگلیاں پھنسا کر نیچے جھانکنے لگی۔

تخت کا دایاں کونا، برآمدے میں پڑی واشنگ مشین کی جھلک، جالی کا ادھ کھلا دروازہ، ستون کے پاس پڑے کھلے تسموں والے جوگر۔۔۔ اور اسی ستون کے عقب سے کوئی آنچل لہرایا تھا۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے نیلاہٹیں سی بھر گیا تھا۔

وہ چونکی۔

ساڑھی۔۔۔ نیلی ساڑھی کا سفید موتیوں بھرا پلو۔۔۔ اس کے سوئے سوئے حواس پہ بجلی چمکی اور پھر اس کے پورے وجود میں سما گئی۔

''منی خالہ!'' اس کی پکار جیسے چپ کی قید سے ہاتھ چھڑا کر بھاگی تھی۔

''منی خالہ! میری منی خالہ!'' وہ لبالب بھری آنکھوں سمیت اندھا دھند اٹھ بھاگی۔ وہ بڑی بڑی سیڑھیاں جانے کس عجلت میں پھلانگ کر وہ نیچے اتری تو منی خالہ برآمدے میں کھڑی منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''منی خالہ!'' وہ لپک کر ان سے لپٹی تو پھپھک کر رو دی تھی۔

کسی کڑی جدائی کاٹی تھی اس نے، اپنے حوصلے اور برداشت سے کہیں بڑھ کر اور اب انہیں بازوؤں میں یوں بھینچے کھڑی تھی، گویا ان کے وجود میں سما جانا چاہتی ہو۔

''ارے پگلی! یوں کیوں رو رہی ہو تم؟'' لب بھینچے کسی انتہائی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے انہوں نے بمشکل خود کو اس کے بازوؤں سے آزاد کرایا۔

''آؤ میرے ساتھ۔۔۔'' وہ اسے لیے سست روی سے چلتے ہوئے کمرے میں آ گئی تھیں۔

''کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ کچھ اندازہ ہے آپ کو، میں کتنی پریشان تھی؟''

بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے شکوہ کیا تو وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگیں۔ سوجی سوجی آنکھیں، بکھرے الجھے بال، ملگجے سے کپڑے۔

بغور اسے دیکھتے ہوئے وہ انگلیوں سے اس کے بال سنوارنے لگیں۔

''ہاں، مجھے اندازہ تھا۔ لیکن تم میرے اندازے سے بڑھ کر پریشان لگ رہی ہو۔''

''صرف پریشان، ارے میں تو مر جاتی اگر آج آپ نہ آتیں تو۔۔۔'' وہ دوپٹے سے مسلسل اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

''کیوں اتنا کمزور بنا رہی ہو خود کو۔۔۔؟ یہ زندگی بہت بڑے بڑے امتحان لیتی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کیونکر جی پاؤ گی؟ اور پھر ہمارا ساتھ ہمیشہ کا تو نہیں نا۔۔۔'' وہ ہتھیلیوں پہ نگاہ گاڑھے بجھے بجھے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

نور نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''ایسا کیوں کہا ہے خالہ نے۔''

''سب سہارے عارضی ہوتے ہیں نور۔۔۔ کبھی نہ کبھی ہاتھ سے چھوٹ جانے والے۔ کمزور بنا دینے والے۔ تم ان سہاروں کی عادی مت بنو۔ تم ہمیشہ میری اوٹ لے کر اس زندگی کو دیکھتی رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں بہادر اور جرات مند دیکھنا چاہتی ہوں۔'' ان کے حسرت آمیز لہجے میں نمی سی گھل گئی تھی۔ نور ان کی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں میں ایسی الجھی کہ سب سوال جواب بھول بیٹھی۔

''میں اتنی کمزور تو نہیں خالہ! کہ آپ یوں فکرمند ہو جائیں۔ وہ تو بس آپ بغیر بتائے یوں اچانک غائب ہو گئیں تو میں پریشان ہو گئی۔ پھر باقی سب لوگ باتیں بھی تو عجیب عجیب کرنے لگے تھے۔''

''سب لوگ۔۔۔؟'' ان کی سوالیہ نظریں اٹھیں تو اس نے قدرے سوچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں صرف وہی چچل پیری، لیکن خالو نے بھی تو نہیں ٹوکا۔ جب میں بولی تو کہنے لگے۔

''اوپر جاؤ۔۔۔'' شاید بہت الجھے ہوئے تھے اس وقت۔ بتا رہے تھے کہ آپ ان کے کسی دوست کے ساتھ گھر آنے کے لیے نکلی تھیں؟''

''ہاں۔۔۔ ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ راستے میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ہسپتال لے جانا پڑا۔ بہت پریشانی میں وقت کٹا۔ رات گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ادھر اس کی حالت سنبھلی، ادھر میں گھر پہنچ گئی۔''

''خالہ! آپ یوں تنہا مت جایا کریں کہیں بھی۔ خوامخواہ خالو کا دل برا ہو جائے گا۔ آپ کی طرف سے۔'' وہ بہت کچھ کہنا، سنانا چاہ رہی تھی مگر خالہ کی اتری اتری صورت اور تھکن زدہ لہجہ نے اسے روک دیا تھا۔

باہر ہلکی سی کھٹر پٹر ہوئی تھی۔ منی خالہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بہت وقت ہو گیا، میں کھانا بنا لوں۔''

''میں آپ کی مدد کراؤں۔'' وہ بھی ان کے پیچھے لپکی۔

''نہیں تم جاؤ اوپر، میں رات کو آؤں گی، پھر باتیں کریں گے۔'' وہ اسے ٹالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

نور نے جاتے جاتے یونہی سرسری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ منی خالہ کی غیر موجودگی میں سارا کمرا گرد آلود ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں سے جھاڑن لیا اور کمرے کی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر اوپر آ گئی۔

اور رات گئے سچ مچ منی خالہ آ گئیں لیکن اس وقت جب وہ ان کے آنے کی امید چھوڑ بیٹھی تھی۔

سوکھی روٹی اور مونگ کی دال بھی آج اس نے کس مزے سے کھائی تھی۔۔۔ کہ لانے والی منی خالہ تھیں۔

ایک دن کی جدائی نے منی خالہ کو اس کے لیے کیا سے کیا بنا ڈالا تھا اور پھر بہتی چاندنی کے سکوت میں چلتے پھرتے وہ بہت دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی، اِدھر اُدھر کی۔۔۔ اوٹ پٹانگ باتیں۔۔۔ کبھی پچھلے گھر کا تذکرہ۔۔۔ کبھی وامق بھائی کی یاد۔۔۔ منی خالہ چلتے چلتے ٹھہر کر بہت خاموشی سے اسے سننے لگتیں۔

''منی خالہ! جب ہم یہاں آئے تھے تو کلیوں کا جھنڈ سفید ہوا پڑا تھا، سارا گھر مہکا کرتا تھا، یہ پھولی

پھولی موٹی سی کلیاں۔۔۔ اب تو سب سوکھ گئی ہوں گی نا؟'' وہ افسردگی سے پوچھنے لگی۔

''ہاں لیکن گھر تو ابھی بھی مہکتا ہو گا۔''

گالوں پر اترتی خوشگوار سی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے وہ رک گئی۔

''خشک پھولوں سے خوشبو آتی رہتی ہے خالہ۔''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ چند لمحے انتظار کرتی رہی پھر ان کی خاموشی سے اکتا کر دیوار پار جھانکنے لگی۔ نیچے گلی میں اندھیرا، کسی کبڑے بھکاری کی طرح گھروں کے بند دروازوں پر دستک دیتا پھرتا تھا۔ کسی گھر سے کمسن بچے کے رونے کی آواز یکلخت ہی ابھری تو ان دونوں کو چونکا گئی۔

''خوشبو صرف پھولوں کی ہی نہیں ہوتی نور!'' منی خالہ کی آواز رات گئے دریا کے پانی پر ڈولتی کشتی کی طرح ہلکورے لیتی اس تک پہنچی تھی۔

''خوشبو یادوں کی بھی ہوتی ہے۔۔۔ احساس کی بھی۔۔۔ سرگوشیوں کی بھی۔۔۔'' بیتتے ہوئے لمحے نے انہیں ابھی ابھی آزاری بخشی تھی۔ نور یونہی کھڑے کھڑے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''خوشبو دہلیز پر سوتی جاگتی آہٹوں کی بھی ہوتی ہے۔۔۔ آنگن میں بکھری اداسی کی بھی۔۔۔ کمروں میں اونگھتے انتظار کی۔۔۔ چراغوں کی بجھی ہوئی لو کی بھی۔۔۔ اور ایسی خوشبو آتی ہی رہتی ہے۔ گھروں اور دلوں کو آباد رکھتی ہے۔ وہ گھر بھی ابھی تک مہک رہا ہے۔۔۔ مہکتا ہی رہے گا۔۔۔ یہ خوشبو اس گھر کی بنیادوں میں بسی ہوئی ہے، آتی ہی رہے گی۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔ ہر آن۔۔۔ ہر گھڑی۔۔۔''

ان کی آواز ڈوب رہی تھی۔ نور گھبرا کر ان کی طرف پلٹی۔ وہ دیوار سے لگی بیٹھی تھیں۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے، سر جھکا رکھا تھا۔۔۔ وہ فوراً ان کے پاس آ بیٹھی، دھیمی آواز میں انہیں پکارا۔۔۔ پھر آہستگی سے ان کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ وہ رو رہی تھیں یا نہیں۔ اندھیرے میں اسے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ تاہم نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ اسے اپنی سسکیاں دباتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا، گھر یاد آ رہا ہے۔ اوہ! کیا ابا میاں۔۔۔؟'' وہ بے قرار ہو کر خود ہی سوال جواب کرنے لگی۔ انہوں نے بس اثبات میں سر ہلایا اور اٹھنے لگی۔

''چلتی ہوں اب، دروازہ کھلا نہ ملا تو پھر دیواریں پھلانگتا پھرے گا۔''

''کون، کس کی بات کر رہی ہیں؟'' وہ منی خالہ کے کچھ دیر پہلے کے رویے میں الجھی ہوئی تھی، فوری طور پر سمجھ نہ پائی۔

''ایاز کی۔''

''ایاز۔۔۔'' اس کی نگاہیں دروازے پر لگے تالے پر اٹھ گئیں۔ یہ وقت تو اسی کے آنے کا تھا۔

''وہی جو اس کمرے میں۔۔۔''

''ہاں۔'' انہوں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔ ''جانتی ہو، کون ہے وہ؟''

''نہیں، مجھے کیا خبر۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے جبکہ دل میں شدید خواہش ہوئی تھی جاننے کی۔

''بھائی صاحب کا بیٹا۔'' بڑے آرام سے انہوں نے انکشاف کیا۔

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھے گئی۔

”عا۔۔۔عاطف ماموں کا بیٹا۔۔۔اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ وہ یک دم ان کے سامنے آ گئی۔

”مجھے کیا معلوم تھا، تم اتنی بے خبر ہو۔“

”ریڈیو پر نشر ہوئی تھی یہ خبر یا مسجد میں اعلان کرایا تھا جو مجھے خبر ہوتی۔ آپ کو معلوم ہے یہاں آپ کے سوا اور کوئی نہیں مجھے خبریں پہنچانے والا۔“ وہ جل کر بولی۔ اتنی بڑی بات خالہ اب بتا رہی تھیں۔ گویا اس کی تو کوئی اہمیت ہی نہ تھی ان کے نزدیک۔

”چلو اب تو پتا چل گیا نا، اب سو جاؤ اور دروازہ بند کر لینا اندر سے۔“ وہ اسے ہدایت دیتی چل دیں۔ یہ سر جھٹک کر کمرے میں آ گئی۔

”اتنا نزدیکی رشتہ۔۔۔اور میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔“ اسے اپنی عقل پر غصہ آیا پھر سوچنے لگی۔

”ایسا آوارہ، نکما بیٹا، عاطف ماموں کا۔۔۔رات گئے گھر آتا ہے۔۔۔جانے کہاں کہاں کی فلمی ہیرو کی طرح گانے گانے والا۔۔۔آوارہ مزاج۔۔۔نالائق۔۔۔دن میں کبھی گھر میں دکھائی نہیں دیا۔ ایسے رنگ ڈھنگ شریفوں کے تو نہیں ہوتے۔ ہاں بھئی! نہ ماں سر پہ نہ باپ۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔۔۔ چچ۔۔۔چچ۔۔۔پتا نہیں یہ ابا میاں کا خاندان بھی کس کی بددعا کے زیر اثر رہا ہے۔“

عاطف ماموں تو جانے کہاں جا چھپے تھے، مر گئے یا جیے جاتے ہیں کسی کو پتا نہیں۔ ابا میاں کے خاندان کے آخری سپوت کے یہ لچھن دیکھ کر اسے واقعی بہت افسوس ہوا۔

☆☆☆

کاتک کا مہینہ شروع ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے لیکن رات کے آخری پہر چلنے والی خنک ہوائیں ابھی سے اس کی آمد کا پتا دے رہی تھیں۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی چادر کے نیچے اس کا وجود سکڑتا جاتا۔ تنگ آ کر وہ خالہ سے کہہ بیٹھی۔

”کچھ دن اور گزریں گے اور میں ان کپڑوں میں ٹھٹھرنے لگوں گی۔ چلیں، اپنے گھر چلتے ہیں۔“

منی خالہ کا ہاتھ ذرا سا کانپا اور سوئی کپڑے میں سے نکل کر انگلی کی نرم پور میں جا گھسی۔ لب بھینچ کر انہوں نے سوئی واپس کھینچی اور خون کے ننھے سے قطرے کو غور سے دیکھنے لگیں۔

نورا اپنی باتوں میں مگن تھی۔

”گرم کپڑوں کی کاٹ چھانٹ کا موسم ہے، سارے کے سارے لے آتے ہیں۔ یاد ہے نا وہ میرا پرانا سویٹر۔۔۔کہنی سے ادھڑ رہا تھا۔ اسے بھی دوبارہ بنائیں گی نا آپ؟ پھر کچھ دن وہاں آرام سے رہ کر آئیں گے۔ دوپہر کی گرم گرم روٹی اور تازہ شوربے والا سالن۔ واہ کیا عیاشی ہو گی۔۔۔یہ سوکھی باقر خوانیوں سے تو جی اوب گیا اور پھر پلنگ پر خوب کروٹیں بدل بدل کر سوئیں گے۔ اف ایسے مزے۔۔۔ آتے وقت میں صندوق میں بند اپنی ساری گڑیاں نکال لاؤں گی۔ سیلن کی باسی مہک سے بھری بوڑھی، بیمار گڑیاں۔۔۔کسی کے بال جھڑ گئے ہوں گے، کسی کا منہ پوپلا لیکن پھر بھی لے آؤں گی۔ تنہائی بانٹ لیں گی اور کیا چاہیے۔“

وہ بولتی رہی، بولتی رہی۔۔۔منی خالہ اپنی ساڑھی کی مرمت چھوڑ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

وہ اپنا دل بہلانے کو یونہی ادھر اُدھر کی ہانکنے لگتی تھی۔ دن رات کی تنہائی اسے عجیب و غریب

روپے بخش رہی تھی۔ پہلے تو چوبیس گھنٹے منی خالہ کا ساتھ ہوتا تھا، ہزاروں کہتی۔۔۔ہزاروں سنتی۔۔۔اور اب چوبیس گھنٹوں میں سے چند گنے چنے گھنٹے تھے جنہیں کبھی تو وہ ہنس بول کر گزار لیتی، کبھی گم سم چپ چاپ بیٹھی رہتی اور کبھی یوں خود کلامی کے سے انداز میں باتیں کرتی کہ منی خالہ کو اپنا وجود غیر ضروری سا لگنے لگتا۔

وہ بولتے بولتے تھک سی گئی۔ تب اس نے خالہ کی طرف دیکھا، نجانے کیا سوچ رہی تھیں کہ ہاتھ میں پکڑی سوئی بھی کپڑے میں ہی رہ گئی تھی۔ وہ چڑ کر ان کے پاس سے اٹھی اور اوپر آ گئی۔ ابھی دوپہر کا وقت تھا اور اس سوتے جاگتے بوریت بھرے دن کا انجام اس رات پر ہوا تھا، جو بہت خوشگوار تھی اور اس کی نرم سی ٹھنڈک کبھی کبھار جسم کو گدگدا سی جاتی تھی۔ وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر بیٹھی تھی۔ موم بتی بجھنے کے بعد بھی جلے ہوئے موم کی ہلکی سی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چہل قدمی کے لیے باہر جانے کی غرض سے دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اٹھی کہ اس وقت واقعی ان کپڑوں میں ٹھنڈ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ چپل پہنتے ہوئے باہر مخصوص قدموں کی مانوس سی چاپ ابھری تو وہ لمحہ بھر کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے رک سی گئی۔

”اتنا قریبی رشتہ۔۔۔درجہ بہ درجہ بڑھتا ہوا اپنائیت کا احساس بھی۔۔۔اس کے باوجود یہ جھجک۔۔۔اُفوہ۔۔۔“ اسے غصہ آیا خود پر۔

پہلے تو وہ اجنبی تھا۔ نہ جان نہ پہچان۔۔۔چھپتی پھرا کرتی مگر اب تو وہ عاطف ماموں کا بیٹا تھا، وہی عاطف ماموں جن کی گود میں وہ کھیلا کرتی تھی۔ ایاز کو دیکھ کر بے اختیار انہیں یاد کرتی۔۔۔اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر۔۔۔

قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ گم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔۔۔وہ کھڑکی سے آ لگی۔۔۔باہر ٹھنڈی ہوا کا لطف لیا جا رہا تھا۔ چاندنی کی شرارت۔۔۔ہوا کی اٹھکھیلیاں۔۔۔نیم کی شاخوں میں اٹکے بڑے سے چاند سے گفتگو۔۔۔گنگناہٹ جاری۔۔۔

کل رات میں تنہا تھا میرے دھیان میں تم تھے

اس کی آواز بہت نرم اور میٹھی تھی۔۔۔سنتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔۔۔وہ جالی سے سر ٹکائے دیر تلک کھڑی رہی۔۔۔پھر بستر پر لیٹ گئی۔۔۔دیوار کے اس پار اور اس پار تنہائی کا ایک سا عالم تھا۔

تحریر میں تم تھے میرے وجدان میں تم تھے

وہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے پلکیں جھپکتی رہی، آج اس تاریکی میں مدھم مدھم سی روشنی جانے کہاں سے پھیل رہی تھی۔ وہ اس روشنی میں کسی سائے کو اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس کرنے لگی۔ نرم آواز گرم جذبات سے لو دینے لگتی تھی۔

گو اجنبی دستک تھی مگر میں نے درِ جاں

یہ سوچ کے کھولا تھا کہ امکان میں تم تھے

اس کا ہاتھ کسی مضبوط ہاتھ کی اپنائیت بھری گرفت نے تھاما تو پلکیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ ہونٹوں پر مدھم مسکان اور وجود کے گرد ایک بہت ہی خوب صورت احساس کا حصار۔۔۔آج وہ ایک انوکھی نیند سونے جا رہی تھی۔

☆☆☆

بہت دور کسی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔۔۔مسلسل۔۔۔متواتر۔۔۔لگاتار گہری نیند میں اس دستک کی آواز اسے لاشعور سے شعور تک کھینچنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے کانوں نے سنا مگر نیند میں ڈوبا، سویا ہوا ذہن مسلسل اسے تھپک رہا تھا۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ دستک نزدیک آتی گئی۔۔۔نزدیک۔۔۔ اور نزدیک اتنی کہ اس کے کمرے کے دروازے پہ آکر ٹھہر گئی تھی۔

ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ٹھک۔۔۔ اس نے جھٹلانا چاہا مگر آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ ٹھک۔۔۔ٹھک۔۔۔دستک اسی کے دروازے پہ ہو رہی تھی، وقفے وقفے سے۔ یوں جیسے کوئی بہت آرام سے کھڑا محض تفریحاً دروازہ بجا رہا ہو۔

حواس کے مکمل بیدار ہوتے ہی وہ چادر جھٹک کر اٹھ بیٹھی، آنکھوں میں ادھوری نیند کی کڑواہٹ بھری تھی۔ معلوم نہیں کیا وقت ہوا تھا مگر اسے لگا وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سوئی تھی۔

''کون۔۔۔کون ہے؟'' وہ عجلت میں دروازے کی طرف بڑھی، مگر کنڈی کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا تھا۔

باہر سے کوئی آواز آرہی تھی۔

اس نے سننے کی کوشش کی۔

''نوری۔۔۔دروازہ کھولو۔۔۔نوری۔۔۔'' ہلکی سی سرگوشی۔۔۔بھنچی ہوئی آواز۔۔۔وہ ایک دم ڈر گئی۔ پہلے تو یہی خیال کیا تھا کہ منی خالہ ہوں گی۔ وہ اکثر رات گئے آیا کرتی تھیں مگر یہ آواز قطعی اجنبی۔۔۔نامانوس۔۔۔

''کون ہے؟'' اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

جواباً وہی سرگوشی ابھری، وہ دروازے سے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ٹانگوں میں لرزش سی اتری تو وہ بھاگ کر اپنے بستر پر آگئی۔ کھڑکی کے اس پار پھیلی تاریکی اور خاموشی بتا رہی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔

دستک ایک بار پھر ہوئی تھی۔

اسے اس ٹھنڈ میں بھی پسینہ آگیا تھا۔

''کون ہے باہر۔۔۔کون ہے؟'' باوجود کوشش کے وہ چلا نہ سکی۔ روہانسی آواز بمشکل اس کے حلق سے نکلی تھی۔ چند ثانیے دوسری طرف سے کوئی آواز نہ ابھری تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔ عین اسی لمحے کھڑکی کے دوسری جانب سے سرگوشی ابھری تھی۔

''نوری! دروازہ۔۔۔'' اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ سیاہ بلند قامت سایہ کھڑکی کی جالی سے اس پر جھکا آرہا تھا، خوف، پوری قوت سے اس پر حملہ آور ہوا تو زوردار چیخ خود بخود اس کے حلق سے نکلی تھی اور پھر وہ خود کو روکنے کی معمولی سی کوشش بھی نہ کر پائی تھی۔ مسلسل چیختے ہوئے وہ برق رفتاری سے کھڑکی سے دور بھاگی تو نجانے کہاں کہاں، کس کس چیز سے ٹکرائی، کوئی آفت قیامت تھی جو رات کے اس پہر اس پر نازل ہوئی تھی۔ سایہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا تھا مگر اسے لگ رہا تھا وہ جالی کے اندر سے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر کھینچ لے گا یا پھر بند دروازے کی جھریوں سے زبردستی اندر آگھسے گا۔

اپنی ہی بے ہنگم چیخوں کے درمیان اس نے دروازہ دھڑ دھڑانے اور بہت سے قدموں کے بھاگنے دوڑنے کی آواز سنی تھی۔

''نور! نور دروازہ کھولو۔۔۔نور!'' بہت ساری آوازوں میں وہ بس ایک ہی آواز تھی جو اس کی زائل ہوتی توانائیوں کو واپس کھینچ لائی تھی۔ دروازے کی کنڈی گرا کر وہ بے دم ہو کر منی خالہ کے بازوؤں میں جا گری تھی۔

''یہاں کوئی تھا، منی خالہ! یہاں کوئی تھا۔ دروازے پر پھر ادھر کھڑکی میں۔'' رو رو کر ہلکان ہوتے ہوئے اس نے بمشکل بتایا۔

''دروازے پر دستک دیتا رہا۔ پتا نہیں کون تھا خالہ!'' ڈر کے مارے اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ ''کون؟ کون تھا اور کیا کچھ کہہ رہا تھا۔'' بس بانکے خالو کی دھاڑ تھی جو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کیے جا رہی تھی۔

''تمہاری اتنی جرأت غلیظ انسان! تم نے کیا سوچ کر یہ حرکت کی ہے۔''

وہ کس پر چلا رہے تھے، نور دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بس آنکھیں میچے، مٹھیاں بھینچے روئے چلی جا رہی تھی۔ منی خالہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر نیچے لے آئی تھیں۔ ان کا کمرا پہلے سے روشن تھا، پلنگ پر بٹھا کر وہ بغیر کچھ کہے اس کے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ انتہائی مضطرب اور پریشان۔۔۔ وہ اسے دلاسا دینے کی ہمت بھی خود میں نہ پا رہی تھیں، باہر صحن میں ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا تھا۔ بانکے خالو ایاز کو گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے تھے۔

''تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' بانکے خالو چلا رہے تھے۔

''ارے، ہے ناگندا خون۔ اپنے ہی خاندان کی عزت۔۔۔'' ان کی ماں کی پاٹ دار آواز۔۔۔ نور، منی خالہ کے سینے میں منہ چھپانے لگی تھی۔ کیسا خوف اتر آیا تھا ذہن و دل پر اور منی خالہ کو جانے کیا ہوا کہ خود سے لپٹی نور کو ایک جھٹکے سے پرے ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''جھوٹ ہے، سب بکواس ہے۔۔۔یہ الزام ہے مجھ پر۔'' ایاز کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

نور نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے منی خالہ کو پکارا۔ وہ کمرے سے باہر جا رہی تھیں۔ نور کے لیے ان چند لمحوں کی تنہائی بھی عذاب تھی، وہ فوراً اٹھ کر ان کے پیچھے لپکی۔۔۔منی خالہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس تک جا پہنچی تھیں۔

''آپ میرا یقین کریں، میں تو صرف چیخوں کی آواز سن کر۔''

وہ فوراً منی خالہ کے سامنے صفائی پیش کرنے لگا تھا، مگر اگلے ہی پل منی خالہ کے زناٹے دار تھپڑ نے اسے گنگ کر دیا تھا۔

اندھا دھند دروازہ کھولتے ہوئے نورالقمر صحن میں پھیلتے سناٹے کو صرف محسوس کر سکی تھی، اسی لمحے اس نے اپنے وجود کو بے جان ہوتے محسوس کیا تو وہیں دروازے کے قریب فرش پر بیٹھ کر منی خالہ کو پکارتی رہ گئی تھی۔ اس کی ڈوبتی ہوئی آواز منی خالہ تک بہت دیر میں پہنچی تھی اور جس لمحے وہ پلٹ کر اس تک آئیں، وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

آناً فاناً وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ ایاز کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا گیا تھا اور نکالنے والی بھی کون۔۔۔ منی خالہ۔۔۔

''اتنا حوصلہ کہاں سے آیا ہو گا۔۔۔ سگا بھتیجا، گمشدہ بھائی کی واحد نشانی۔۔۔ اپنے ہاتھوں کھو دی۔۔۔ اس کائنات کا اژدھام پہلے باپ کو ہڑپ کر گیا تھا، اب بیٹے کو بھی نگل لے گا۔۔۔ پہلی غلطی تو قابل معافی ہوتی ہے منی خالہ! اب آپ اپنے زندہ رشتوں کی موت کا سوگ کیونکر منائیں گی۔''

آج تین دن بعد بخار ٹوٹا تھا اس کا۔ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تھی اور اب وہ چپ چاپ تکیے پر سر ڈالے لیٹی ہوئی تھی۔ جانتی تھی، ذرا ہلے گی اور منی خالہ چونکی ہو کر اٹھ بیٹھیں گی۔ ہزار خاطر کریں گی اس کی۔۔۔ ''دوا کھالو، پھل لے لو، سر دبا دوں۔'' اور نجانے کیا کیا۔ خود بھی کئی گھنٹوں کی نیند اس کے پیچھے خراب کریں گی اور اسے بھی عاجز کریں گی جبکہ وہ ابھی صرف سوچنا چاہ رہی تھی، وہ سب جو کچھ ہوا تھا۔ معلوم نہیں، اس میں کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔ شاید وہ کبھی اتنی بے چینی محسوس نہ کرتی مگر وہ ایک آواز جو رات کے اس پہر بھی چاند کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی، وہ اسے ان نتائج سے مطمئن نہ ہونے دے رہی تھی۔

اے دوست! مجھے تو نے دو چیز عطا کی ہے
سوغاتِ شبِ ہجراں اور عالمِ تنہائی

''کیا اس کا جرم اتنا بڑا تھا کہ اسے یوں در بدر کیا جاتا لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ آدھی رات کے وقت مجھے خوفزدہ کرنے کی یہ بھیانک حرکت کیا تھی، کوئی شرارت، بھونڈا انداز یا حقیقتاً مجھے نقصان پہنچانے کی خواہش۔۔۔ اور اس لمحے خوف کے مارے میرا دل بند ہو جاتا تو۔۔۔''

وہ سوچتے سوچتے ہلکان سی ہونے لگی تھی۔ نیند بھی نہ آ رہی تھی۔۔۔ کہ کچھ اور وقت ہی کٹ جاتا۔۔۔ تنگ آ کر منی خالہ کو جگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر قدرے چونکتے ہوئے رک گئی۔

''یہ کیا ہوا؟'' اس کی نظریں منی خالہ کی دودھیا گردن پر لگے زخم پر جم کر رہ گئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت باریک چیز گوشت کو کاٹتے ہوئے ڈیڑھ دو انچ لمبا زخم ڈال گئی ہو۔

''کب آئی یہ چوٹ۔۔۔ خالہ نے ذکر ہی نہیں کیا۔'' زخم پر کھرنڈ آ گیا تھا مگر پھر بھی اسے تشویش ہوئی۔ منی خالہ دوسری جانب رخ کیے لیٹی تھیں، اس نے ان کی لمبی بل دار چوٹی سرکاتے ہوئے قدرے جھک کر اس زخم کو دیکھنا چاہا مگر منی خالہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

''کیا۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔'' وہ پریشان ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

''کچھ نہیں، میں تو یہ زخم دیکھ رہی تھی آپ کی گردن پر۔۔۔ کیا ہوا تھا؟'' منی خالہ کا ہاتھ بے اختیار زخم کو چھو گیا۔

''ہاں یہ۔۔۔ معمولی سا زخم ہے۔۔۔ پتا نہیں کب لگا۔۔۔ تم یہ بتاؤ، کتنی دیر سے جاگ رہی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا، وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگیں۔

''ابھی کچھ دیر پہلے آنکھ کھلی ہے، بھوک لگ رہی تھی۔''

''پہلے کیوں نہیں جگا دیا مجھے۔'' وہ جلدی سے پلنگ سے نیچے اتر گئیں اور سیب اٹھا کر اس کے پاس آ گئیں۔

تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے منی خالہ کو سیب کاٹتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار ہی بانکے خالو کا دھیان آ گیا۔ پچھلے دنوں میں انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ دودھ، پھل، دوائیں۔۔۔ کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی۔ شاید وہ اس شرمندگی کا ازالہ کرنا چاہ رہے تھے جو ایاز کی وجہ سے انہیں نور کے سامنے اٹھانی پڑی تھی۔

☆☆☆

''نوری۔۔۔ نوری۔۔۔ نوری۔۔۔'' ہلکی سی آواز۔۔۔ پراسرار پکار۔۔۔ معنی خیز سرگوشی۔ وہ نیند میں ذرا سا کسمسائی اور اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ دائیں دیوار کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھے بانکے خالو نے چہرے کے سامنے پھیلے اخبار کا کونا ذرا سا ہٹایا اور اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرا دیے۔

''خیریت۔'' انہوں نے پوچھا۔

اس نے چونک کر انہیں یوں دیکھا، گویا ان کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

وہ ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ اڑے اڑے حواس، زرد زرد چہرہ، بمشکل تھوک نگلا۔ بانکے خالو نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھا اور جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگے۔ وہ چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی، محض وہم تھا جو اسے نیند میں بھی بے چین و بے سکون کر گیا تھا۔ وگرنہ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ بانکے خالو کمرے میں موجود تھے، سو ڈھارس بندھ گئی تھی۔ چند گھونٹ پانی پی کر اس نے گلاس واپس تھما دیا تھا۔

''بخار تو نہیں ہے۔'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر نبض چیک کی اور پلٹ گئے۔ تب ہی منی خالہ اندر آئیں، چائے کا کپ ہاتھ میں تھا۔

''اٹھ گئیں، منہ ہاتھ دھلوا دوں۔'' آتے ہی عجلت میں پوچھا۔ بانکے خالو کو کپ پکڑاتے پکڑاتے چائے چھلک گئی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر کچھ کہنا چاہا مگر خالو بغیر کچھ کہے سنے ایک نظر انہیں دیکھ کر کرسی پر جا بیٹھے تھے۔

''کچھ دیر بعد نہا لوں گی۔'' نقاہت سی ہو رہی تھی۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

''ابھی کیوں نہیں، تین دن سے یہی کپڑے۔'' انہیں پتا نہیں کیوں اتنی جلدی تھی، نہ خیریت کا پوچھا، نہ حال احوال کی طلب۔ نور کو وحشت سی ہونے لگی۔ بعض اوقات ان کے رویے یونہی ناقابل فہم ہو جاتے تھے اس کے لیے۔

''پہلے اس کے لیے ناشتا لے آؤ، وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے۔'' بانکے خالو نے گویا یاد دہانی کرائی تھی۔

''ابھی دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے فوراً منع کر دیا تو منی خالہ اس کے قریب بیٹھ کر پھل کاٹنے لگیں۔

''تھوڑا بہت کھا لینا۔''

''اوپر کا کمرا خالی ہے، اسے نور القمر کے لیے سیٹ کر دو۔ وہ شخص اب اگر کبھی واپس آیا بھی تو۔۔۔''

''اماں آپ کا پوچھ رہی تھیں، غالباً کوئی کام کہا تھا انہوں نے آپ سے۔'' منی خالہ کو اچانک یاد

آ گیا۔

''کیوں بھئی! اب تو ڈر نہیں لگے گا نا تمہیں۔'' وہ سنی ان سنی کرتے براہ راست اس سے پوچھنے لگے تو وہ خجل سی ہو گئی۔

''اتنے دنوں سے منی خالہ کا کمرا سنبھالے بیٹھی ہوں، شاید اسی لیے۔'' وہ سوچ کر شرمندہ ہونے لگی۔

''نہیں، اب کیوں ڈرے گی۔ بس ذرا طبیعت سنبھل جائے تو پھر۔۔۔'' منی خالہ اس کی جگہ جواب دے رہی تھیں۔

''ہوں۔'' انہوں نے ہنکارا بھرا پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

''ایک بات تو بتاؤ۔'' وہ نور کے پاس آ کھڑے ہوئے تو اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''ابا میاں اپنے ضروری کاغذات کہاں رکھتے تھے۔'' قطعی غیر متوقع سوال تھا۔ منی خالہ تو چونکیں ہی، وہ بھی قدرے حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی مگر وہ جواب کے منتظر تھے۔

''لوہے کی صندوقچی میں ہوتے تھے سارے کاغذات۔'' حیرانی میں لپٹا جواب تھا۔

''اونہوں۔'' انہوں نے لب بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔ ''مکان کے کاغذات وہاں نہیں تھے، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ۔۔۔ یا کوئی دوست۔۔۔ محلے دار۔۔۔ جس کے پاس وہ اپنی ضروری چیزیں رکھوا سکتے ہوں۔''

نور نے الجھ کر منی خالہ کی طرف دیکھا۔ کچھ یاد آیا تو تھا مگر۔۔۔

''اگر بتانے والی بات ہوتی تو یقیناً منی خالہ بتا چکی ہوتیں، مجھ سے پوچھنے کی نوبت نہ آتی۔'' اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اسے یوں سوچ میں گم دیکھ کر بانکے خالو جھنجلا گئے تھے۔

''دیکھو نوری۔''

''نوری۔'' اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ بانکے خالو غیر شعوری طور پر بات کرتے کرتے رک سے گئے تھے مگر اگلے ہی پل شعوری طور پر خود پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے بات دوبارہ شروع کر لی تھی مگر لمحے کے ہزارویں حصے میں جس طرح نور سے نظریں ملتے ہوئے انہوں نے نگاہ چرائی تھی، وہ تھرا کر رہ گئی تھی۔

''مجھے مکان کا کوئی لالچ نہیں۔ وہ خود مجھے یہ کاغذات۔'' وہ پلٹ کر کھڑکی کی طرف چلے گئے تھے۔

نور پتھرائی آنکھوں سے ان کی پشت کو گھورتی رہی تھی۔

''نوری۔۔۔ نوری۔۔۔'' وہی سرگوشی اس کے آس پاس بکھری۔

آج سے پہلے کبھی کسی نے اسے اس نام سے نہیں پکارا تھا۔ ہاں مگر اس رات سے آج تک سماعتوں میں گونجتی ''وہ'' آواز۔۔۔ اور ''یہ'' آواز ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ منی خالہ کا ہاتھ پکڑا۔ وہ چونک کر استفہامیہ نظروں سے اس کے کپکپاتے لب دیکھنے لگیں۔

''میں وہ مکان بیچ کر تمہاری تعلیم اور۔۔۔'' بانکے خالو کھڑکی کھولے باہر جھانک رہے تھے۔

وہ کھسک کر منی خالہ کے نزدیک پہنچ گئی۔ انہوں نے محسوس کیا، اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سانس کی رفتار معمول سے تیز تھی۔

''نور۔'' اس کی بدلتی حالت ان کے لیے پریشان کن تھی۔

''منی خالہ!'' اس نے پوری قوت سے ان کے دونوں ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔

''منی خالہ! یہ۔۔۔'' وہ مدھم آواز میں کچھ کہنے جا رہی تھی کہ منی خالہ کا ہاتھ سختی سے اس کے ہونٹوں پر ثبت ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کڑی تنبیہ۔۔۔ وہ دانتوں تلے ہونٹ دبائے ان کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' بانکے خالو پلٹے تھے۔

''کچھ نہیں، شاید کمزوری محسوس کر رہی ہے، چکر آنے لگتے ہیں۔'' انہوں نے کاندھے سے لگی نور کو لٹانا چاہا مگر وہ ان سے بری طرح لپٹی ہوئی تھی۔

''تم اس کے لیے یخنی۔۔۔''

''خالہ! مجھے قے آ رہی ہے۔'' اس نے بمشکل کہا تھا۔

''آؤ۔'' منی خالہ اسے ساتھ لیے باہر نکل آئیں۔

غسل خانے میں گھستے ہی ان کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اسے اپنی پہچان پر بھروسہ تھا۔ منی خالہ اسے تھپکتی رہیں۔ رات تک وہ بمشکل اسے نارمل کر پائی تھیں۔

''انہوں نے بہت غلط سمجھا ہے مجھے، وہ مکان چھین کر ہم سے ہماری جائے پناہ چھین لینا چاہتے ہیں مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ صرف تمہارے صحت مند ہونے کا انتظار تھا مجھے۔'' وہ اٹھ کر کسی کام سے باہر جانا چاہتی تھیں۔

''آپ میرے پاس رہیں، مجھے ڈر۔۔۔''

''بے وقوف مت بنو، ہر کام، معمول کے مطابق ہونے دو۔'' انہوں نے سختی سے کہا پھر جھک کر اس کے کانوں میں بولیں۔

''کل کا سورج ہمیں اس گھر میں نہیں دیکھے گا۔'' ان کے ارادے کی پختگی ان کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ نور ٹکر ٹکر ان کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ٹرین کی چھک چھک میں بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ نور ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی ان کی گود میں سر رکھے مضمحل سی لیٹی تھی، غالباً سو چکی تھی اور سونے سے قبل وہ بار بار ان کا چہرہ کھوجتی رہی تھی۔

دکھ، پریشانی، اضطراب۔۔۔ منی خالہ جانتی تھیں وہ کیا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے، اسی لیے خود کو مطمئن ظاہر کرتی رہیں اور وہ ان کا ہاتھ تھامے اونگھنے لگی تھی۔

''تم پر سے ان احسانوں کا بوجھ ہٹا تو دوں نور! مگر کیا ہے کہ اس سے میرا اپنا وجود ہلکا پڑ جائے گا۔ وہ اور لوگ ہوتے ہوں گے جو خود پر کیے گئے ظلم کی داستان بڑھا چڑھا کر سب کو سناتے ہیں۔ یہاں تو آنکھ تھک جاتی ہے، اس ظلم و زیادتی کو سوچ کر جو مجھ پر ہوا اور جو میں نے چپ چاپ سہہ بھی لیا۔''

انہوں نے جیسے تھک کر اپنا سر کھڑکی سے ٹکا دیا اور باہر اندھیرے میں ڈوبی کائنات کو بھاگتے

دوڑتے دیکھنے لگیں۔ ریل گاڑی کی چھک چھک ان کی سہاگ رات کی کہانی سنانے لگی تھی۔ جب اس کی لمبی چوٹی کے بل ایک ایک کرکے کھولتے ہوئے وہ سرگوشیاں کررہے تھے۔

''تم بہت حسین ہو، بہت خوب صورت، دل کو چھو لینے والی مگر پہلی نظر میں تم مجھے بہت عام سی لگی تھیں۔ ہاں مگر وہ لمحہ۔۔۔ جب تمہارے گھر میں رات گئے چھت پر میں نے تمہاری کلائی پکڑی تھی اور تم کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح مجھ سے اپنا آپ چھڑا لے گئی تھیں۔ ہاں، اس ایک لمحے میں تم نے مجھے اسیر کرلیا تھا۔'' گھنے بال پشت پر بکھر کر ان کے نازک وجود کو چھپا سے گئے تھے۔

''جانتی ہو۔۔۔'' وہ اتنے نزدیک تھے کہ انہوں نے بے اختیار رخ موڑ کر گھٹنوں میں سر دے لیا تھا۔

''مجھے ڈری سہمی عورتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ خوفزدہ کبوتری کی مانند لرزتی، کانپتی عورتیں میری کمزوری ہیں۔'' انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں اتنی حیرت دیکھ کر وہ مسکرائے۔ بلاشبہ بہت دلکش مسکراہٹ تھی مگر اس پل وہ صرف ان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

سنگ دلی، کٹھور پن، سرد مہری اور۔۔۔ اور برفیلا انتقام۔۔۔ ان آنکھوں کو پڑھ کر وہ واقعی ڈر گئی تھیں، سہم گئی تھیں۔

ایک جھٹکے سے اٹھ کر انہوں نے ان سے دور ہوجانا چاہا تھا مگر اس کے پلنگ سے اترتے ہی انہوں نے ساڑھی کے پلّو کو اس انداز سے کھینچا تھا کہ وہ گھٹنوں کے بل گریں تو بچاؤ کے لیے سہارا تلاش کرتا ہوا ہاتھ بے اختیار ان کے سینے پر جا پڑا تھا۔ ان کی چوڑیوں بھری نازک کلائی کو ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے وہ ان کی طرف جھکتے ہوئے مسکرائے تو وہ پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہ گئی تھیں۔ بدن میں روح نکلتے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ قہر بھری سفاکی دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے چھلکی) اور اگلے ہی پل ان کے ہاتھ کے دباؤ سے کلائی میں پہنی سرخ چوڑیاں ایک ایک کرکے ٹوٹتی چلی گئی تھیں۔ وہ اپنا سفید پڑتا چہرہ لیے کلائی سے ٹپکتے قطرہ قطرہ خون کو دیکھتی رہیں اور وہ ہنستے ہوئے اس پری چہرہ کو آنکھوں کے رستے دل میں اتارتے رہے۔

ان کی پرورش باپ کے کٹھور پن اور ماں کی سنگدلی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ان کے بدصورت رویوں کی جڑ ان کے ماضی میں پیوست تھی۔ بیوی ملی تو اپنی عمر سے چند سال بڑی۔۔۔ اور شاطرانہ مزاج۔۔۔ تحکمانہ انداز۔۔۔ اوپر تلے تین بیٹے پیدا کیے تو گویا ساتوں آسمان اسی کے ہو گئے۔

ان کے جذبات کو کہاں کہاں کچلا گیا۔ ان کی خواہشات کس کس طرح مسترد ہوئیں۔ ان کی آنکھوں سے کون کون سے خواب نوچ لیے گئے۔ انہیں کس کس مقام پر ٹھکرایا گیا۔ وہ کچھ نہ جانتی تھیں، بس اتنی خبر تھی کہ پس پردہ ذات ''عورت'' کی ہی تھی۔ ان کے اردگرد چھائی ہوئی عورت مضبوط۔۔۔ طاقتور اور حاکمیت کے غلط استعمال کی عادی تھی۔ ان کے باپ کے مرنے کے بعد ان کی ماں نے اپنے انداز سے زندگی گزاری تھی اور ان کی بیوی نے اپنی زندگی اپنے طور طریقوں میں ڈھال رکھی تھی۔ معلوم نہیں ان دو عورتوں کے سوا اور کس کس ''عورت'' کا دخل ان کی زندگی میں رہا تھا اور کس انداز میں۔۔۔ کہ اب ان کے وجود میں کھولتا ہوا لاوا

تھا جو بہہ جانے کے لیے راہ ڈھونڈتا تھا۔ غصہ تھا، تلخی تھی، نفرت تھی، سرکشی تھی، انا تھی، انتقام تھا جو اپنے سامنے روتی دھوتی عورت کو دیکھ کر تسکین چاہتا تھا اور ان کی بدنصیبی کہ وہ پہلے مقام پر ہی ان سے ہار گئی تھیں اور پھر ہارتی چلی گئی تھیں۔

''آج تم یہ ساڑھی پہنو گی۔'' نیلے اور فیروزی رنگ کی ساڑھی پلنگ پر رکھی تھی۔ وہ کمرے میں آئیں تو ٹھٹک سی گئیں۔

''خوب اچھا سا میک اپ کرو، بال کھلے چھوڑنا۔'' وہ پرخیال نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''زیور، گہنا سب پہن لو، آج ہم ایک دعوت میں جارہے ہیں۔''

''دعوت۔۔۔'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''اور تمہیں سب سے حسین نظر آنا چاہیے۔'' وہ ان کے قریب آئے تو آواز حسب معمول سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ گیلے بالوں کو اس کے صبیح چہرے سے ہٹاتے ہوئے وہ بہت محبت سے مسکرائے اور باہر نکل گئے تھے۔

عجیب وغریب انداز تھا۔ کسی نئی قیامت کا پیش خیمہ، وہ الجھتی رہیں۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتا رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل بارہا پھیلا۔ لپ اسٹک بار بار خراب ہوئی۔ عجب خوف میں گھری زندگی تھی ان کی اور جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئے، وہ انہی کا دیا ہوا پرفیوم اسپرے کر رہی تھیں۔ عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو وہ چونک کر پلٹیں۔

وہ آنکھیں پھیلائے ساکت کھڑے تھے، یوں جیسے ان کے خیرہ کرتے حسن اور جگر جگر کرتے وجود نے انہیں مبہوت کردیا ہو۔

''ارے، تم جنت سے آئی ہوئی کوئی حور تو نہیں۔'' وہ واقعی دنگ رہ گئے تھے۔ ایسا والہانہ انداز تھا ان کے دیکھنے کا۔ وہ گھبرا کر ساڑھی کا پلّو درست کرنے لگیں۔

''کب چلیں گے ہم۔'' ان کی وارفتگی ان کے لیے عذاب کا سبب ہی بنتی تھی۔

''ہم کہیں نہیں جارہے۔'' وہی سرگوشی، ان کا پورا جسم ٹھنڈا ٹھار ہو گیا تھا۔

''ہم کہیں نہیں جائیں گے، آج کی دعوت۔۔۔ صرف ہماری اور آپ کی۔۔۔ اسی کمرے میں۔۔۔'' ان کی آنکھوں میں وہی خاص چمک ابھری تھی جو ان کے وجود کو بھربھری مٹی میں تبدیل کردیا کرتی تھی۔ انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر انہوں نے کترا کر نکل جانا چاہا مگر ہر راستہ مسدود تھا۔ وہ بے ساختہ ہی کئی قدم پیچھے ہٹ کر دیوار سے جالگی تھیں۔

''تمہاری آنکھیں کس قدر خوب صورت ہیں۔۔۔؟ نہیں۔۔۔'' انہوں نے خود ہی اپنی بات کو رد کیا۔

''تمہاری آنکھیں اتنی خوب صورت نہیں، جتنا ان میں تیرتا پانی انہیں خوب صورت بنا دیتا ہے۔'' وہ بہت نرمی سے ان کی پلکوں کو چھونے لگے تو انہوں نے سختی سے آنکھیں بند کرلیں۔

''تمہیں پتا ہے، برستی ہوئی آنکھیں مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔'' ان کے ریشمی بال ان کی مٹھی میں جکڑے گئے تو اس اذیت کو برداشت کرتے ہوئے بے اختیار بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے

تھے۔

''لیکن۔۔۔؟'' لمحے میں لہجہ بدل گیا تھا۔ساری نرمی، کرختگی میں ڈھل گئی۔

''اگر کبھی ان آنکھوں میں غصہ، نفرت یا بےزاری جھلکی تو جانتی ہو میں یہ آنکھیں نکال کر چیل کوؤں کو ڈال دوں گا۔'' بال جڑ سے اکھڑنے کے قریب ہو گئے تھے، وہ ہنستے ہنستے بھی خود کو زار و قطار رونے سے باز نہ رکھ سکیں۔

ان کے یوں رونے سے گویا ان کے جھلستے ہوئے جذبات پر نرم پھوار سی برس گئی تھی۔

آسودہ سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ اس کے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر گرتے ہوئے دیکھتے رہے۔

''ہاں، عورت کو ہمیشہ روتے سسکتے رہنا چاہیے۔زبان چلاتی عورت، قہقہے لگاتی عورت سے مجھے نفرت ہے، شدید نفرت۔'' ان کی انگلیاں اس کی نازک گردن پر سرسرا رہی تھیں اور اگلے ہی پل ایک جھٹکے سے گلے میں پہنا ہوا ہار کھینچ لے گئی تھیں۔

کوئی تیز چیز ان کی گردن کو کاٹتی چلی گئی تھی۔

''آہ۔۔۔'' دونوں ہاتھ لبوں پر رکھے وہ گرنے کے سے انداز میں زمین پر بیٹھ گئیں۔

گاڑھے، گرم خون کی باریک لکیر اپنی پشت پر بہتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔سارا بدن ایک ان دیکھی آگ میں جلنے لگا۔صبر، حوصلے، برداشت کی طنابیں ہاتھ سے چھوٹیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

''تم میرے ساتھ یوں مت کرو، تمہیں خدا کا واسطہ ہے، تم میرے ساتھ یوں مت کرو۔'' وہ کہتی رہیں مگر وہ سن نہیں رہے تھے، صرف دیکھ رہے تھے۔روتی، کرلاتی، سسکتی، بلکتی عورت کو۔۔۔

''تم۔۔۔تم اس کائنات کی سب سے حسین عورت ہو قمر ضیاء۔'' ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ بہت جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے اور اس حسن کی سزا انہیں یوں دی گئی کہ اپنے زخم زخم وجود کے ساتھ وہ دو دن تک کمرے میں بند رہیں اور باہر ڈھنڈیا مچی رہی۔وہ نہ چیخ سکیں، نہ پکار سکیں۔ایک ان چاہے وجود کے لیے کون مدد کو آگے بڑھتا وہ دونوں کمرے میں ہوتے اور سوتن جلے پاؤں کی بلی کی طرح باہر گھومتی رہتی۔

''کیا گھول کر پلا دیا میاں کو۔۔۔'' اپنی تلخی دور کرنے کے ان کے پاس بھی ہزار طریقے تھے۔ایک یہی دو گھڑیاں تو تھیں جو اس کے سینے پر سانپ بن کر لوٹتی تھیں تو پھر اپنے زخم دکھا کر سوتن کو فاتح بناتیں۔یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔

''چائے۔۔۔گرما گرم چائے۔۔۔'' ریل گاڑی ٹھہر گئی تھی۔ایک دم بہت سا شور کانوں میں پڑا تو انہوں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔وقتی پڑاؤ، وہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی لیے سستی سے باہر دیکھتی رہیں۔اُجالا ہر سو پھیل رہا تھا۔نور چڑیا کے بھوکے بچے کی طرح بے چین لگ رہی تھی۔۔۔انہوں نے پرس میں سے پیسے نکال کر اسے تھمائے تو وہ بھاؤ تاؤ کر کے ناشتے کا سامان لینے لگی۔حلوہ پوری اور گرما گرم چائے۔وہ رات سے بھوکی تھی اور اب خوب مزے لے کر کھا رہی تھی۔انہوں نے چند لقمے لیے اور پھر گرم گرم چائے حلق سے نیچے اتارنے

لگیں۔

کچھ ہی دیر میں دوبارہ سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔نور ڈبے میں بیٹھے دوسرے مسافروں کا جائزہ لینے لگی تھی۔وہ چڑھتے سورج کی زردی مائل دھوپ کو درختوں پر پھیلتے دیکھتی رہیں۔

اور وہ کہتا تھا۔''تم اس دنیا کی واحد عورت ہو جس سے میں نے محبت کی ہے۔'' لیکن تمہاری محبت میری روح کا ناسور بن گئی۔تمہاری محبت میرے لیے اذیت تھی، دکھ درد تھی، بے پناہ تکلیف تھی، تمہاری محبت میرے بدن پر سگریٹ کے جلے ہوئے نشان تھے۔خونخوار ناخنوں کی کھرونچیں تھیں، جابجا دکھتے ہوئے زخموں کے نیل تھے۔تمہاری محبت ''میری'' چاہ نہیں، میری بےبسی اور مجبوری تھی جو اختتام کو جا پہنچی۔

پہلے میرے باپ کی دیوانگی اور بےحسی نے تمہیں فائدہ پہنچایا۔دوسری مرتبہ اس کی موت نے مجھے بےسہارا بنا کر تمہارے در پہ لا پھینکا اور تیسری مرتبہ نور القمر کا وجود میری بےبسی بن گیا۔اس گھر میں ایاز تھا اور مجھے لگا خدا نے نور کے لیے سہارا ڈھونڈ نکالا ہے۔جب تک وہ وہاں تھا، میں چاہنے کے باوجود کوئی قدم نہ اٹھا سکی مگر جب ایاز ہی وہاں نہیں ہے تو پھر مزید اس دوزخ میں، میں خود بھی جلتی اور نور القمر کو بھی جلاتی، یہ تو ممکن ہی نہ تھا صاحب! سو اب چل نکلی ہوں تو خدا سے دعا ہے۔اس سفر کو ہم دونوں کے لیے بختاور بنا دے۔۔۔تو پروردگار، اس کے سوا اور کچھ نہ مانگوں کی زندگی میں۔''

☆☆☆

جس وقت وہ لوگ ٹرین سے اتر کر تانگے پر سوار ہوئیں، سورج غروب ہو چکا تھا۔پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں لوٹ چکے تھے اور اس قدرے سرد سی رات میں دور گھروں میں جلتی بلتی روشنیاں ٹھٹھرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔نور خوش تھی، بہت خوش۔۔۔ اس اندھیرے میں بھی اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔اپنا شہر، اپنی فضائیں، اپنی زمین، اپنا آسمان، وہ لوٹ کر اپنے گھر جا رہی تھی۔

منی خالہ چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ان کی نگاہیں نہر کے سیاہ چمکدار پانی پر ڈولتی ناؤ پر جمی تھیں جس پر بسیرا کیے وہ تنہا ملاح اسی پرسکوت آسمان تلے ٹھہرے ہوئے پانی سے جانے کیسا سرور حاصل کر رہا تھا۔نم آلود ٹھنڈی ہوا مانوس خوشبو سے لبریز تھی۔

شہر دور رہ گیا تھا، بستی نزدیک تھی۔سفیدے اور شیشم کے درختوں میں گھری سڑک کا آغاز ہوا تو نور قدرے کھسک کر منی خالہ کے نزدیک ہو گئی۔اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے سب سے پہلے محسوس کی جانے والی چیز خاموشی تھی۔گہری دبیز خاموشی اور درختوں کی شاخوں میں چھپا گھورتا ہوا سناٹا۔گھوڑے کے سموں کی ٹپ ٹپ رفتہ رفتہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔منی خالہ کا دل بھی ذرا سا کپکپایا تھا مگر نور کو تسلی دینے کی خاطر وہ ہولے ہولے اس کا ہاتھ دبانے لگی تھیں۔

چانن دے لئی وچ، ہنیرے جنداں جالن والے
وسدے رہین اجاڑاں دے وچ دیوے بالن
والے

اس آسیب زدہ خاموشی سے گھبرا کر کوچوان نے چابک لہرایا اور بلند آواز میں گانے لگا۔ اس کی بے ہنگم آواز کا خوب صورت بول گھوڑے کے سموں کی ٹپ ٹپ سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔

چانن دے لئی۔۔۔ ٹپ ٹپ۔۔۔ وچ ہنیرے۔۔۔ ٹپ ٹپ

نور کو ہنسی آ گئی اس تال میل پر مگر لطف آ رہا تھا۔ چپ چاپ سنتی گئی۔

وسدے رہین اجاڑاں دے وچ دیوے بالن والے

''بہن جی! جانا کہاں ہے۔ یہ سڑک آخیر پر ڈھول مٹی میں کھو جاتی ہے۔ یہ سامنے دو چار گھر کھڑے ہیں، آگے تو بے آباد زمینیں ہیں جی۔''

''آخری گھر پر روک دینا بھائی۔'' منی خالہ نے کہا اور سامان سمیٹنے لگیں۔

نور چلتے تانگے سے چھلانگ لگانے کو تیار بیٹھی تھی۔ جونہی کوچوان نے باگیں کھینچیں وہ فٹ سے نیچے۔۔۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لیا۔۔۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھی۔ منی خالہ کوچوان کو پیسے دے رہی تھیں، تب ہی برابر کے گھر سے کوئی نکلا اور پھر دہلیز پر کھڑا رہ گیا۔

''وامق بھائی!'' اس نے پہچان کر آواز لگائی مگر وہ سنے بغیر ایک ایک قدم اٹھاتے منی خالہ کے سامنے جا پہنچے تھے۔

وہ کچھ پوچھ رہے تھے۔۔۔ کیا۔۔۔؟ نور کو یہاں کھڑے کھڑے سمجھ میں نہ آیا۔ منی خالہ نے جواب میں کچھ کہا اور جھک کر بیگ اٹھانے لگیں۔ وامق بھائی نے ایک دم ان کا ہاتھ تھام کر روکا اور خود سامان اٹھانے لگے۔ تبھی دروازے سے ان کی اماں باہر آئیں، چند لمحے رک کر اس سارے منظر کو دیکھتی رہی تھیں۔ بیٹے سے نگاہیں ملیں تو طویل سانس لے کر تیز قدم اٹھاتی منی خالہ تک جا پہنچیں۔

گزرا ہوا وقت انہیں بہت کچھ سمجھا، بڑھا گیا تھا۔ آج عرصے بعد بیٹے کی آنکھوں میں زندگی کو کروٹ لیتے دیکھا تو آگے بڑھ کر منی خالہ کی پیشانی چوم لی۔ انہیں بانہوں میں لیا اور اپنے ساتھ لیے گھر میں داخل ہو گئیں۔

نور ہکا بکا جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔'' اس گھنی تاریکی میں وہ تنہا، بے یار و مددگار کھڑی رہ گئی تھی اور کسی نے اسے جھوٹے منہ بھی ساتھ آنے کو نہیں کہا۔ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا یا شاید رونا بھی۔ چند لمحے منتظر رہی، کوئی آئے اور اسے بھی ساتھ لے جائے۔۔۔ مگر۔۔۔

''مجھ سے تو خدا واسطے کا بیر ہے انہیں ہمیشہ سے۔ یوں ہے تو یونہی سہی۔ اب مر کے بھی ان کے گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔'' ہاتھ میں پکڑا سوٹ کیس ایک دھماکے سے زمین پر گرایا، اینٹ تلاش کی اور پوری قوت سے دروازے پر لگے تالے پر دے ماری۔ غصہ تو پہلے ہی بہت تھا، سو پہلی ضرب ہی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ تالا اٹھا کر دور پھینکا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

سرسراتی ہوا کے ساتھ جامن کا پتا لہراتا ہوا فرش پر گرا تو یہ نرم سی آہٹ اسے چونکا گئی تھی۔ کئی لمحے یونہی کھڑے بیتا دیے تھے اس نے۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر ابا میاں۔

برے بھلے جیسے بھی تھے، اب یاد آ رہے تھے۔ وہ زندہ ہوتے تو آج یہ گھر یوں اجاڑ، ویران نہ ہوتا۔ گھر کے کسی نہ کسی گوشے میں کوئی دیا ٹمٹما ہی رہا ہوتا۔ وہ اداس اداس سی آگے بڑھی برآمدہ پار کیا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندازے سے آگے بڑھنے لگی۔ سامنے کی دیوار میں طاق تھا، جہاں ہمیشہ ایک دیا رکھا ہوتا تھا۔ باورچی خانے سے ماچس بھی یقیناً مل ہی جاتی۔ آگے بڑھتے ہی اچانک ہی ٹھوکر لگی تھی۔

وہ بے اختیار ہی سسک کر رک گئی۔ پیر کے انگوٹھے کو دبایا۔ جب تک درد کم نہ ہوا، یونہی کھڑی رہی پھر آگے بڑھنے کو تھی جب عقب میں ہلکی سی آہٹ ابھری۔ بے اختیار ہی پلٹ کر دیکھا، تبھی روشنی کا جھماکا سا ہوا اور اگلے ہی پل سارا کمرا سفید روشنی سے بھر گیا۔ اتنی تیز روشنی کہ آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ بس ایک لمحہ لگا تھا سنبھلنے میں۔

''یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔'' مارے گھبراہٹ کے اس نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر دیکھا۔ سارا سامان تو وہی تھا پھر۔۔۔ ناسمجھی کے عالم میں باہر بھاگی۔ سامنے ابا میاں کا کمرا بھی روشن تھا مگر خالی۔۔۔ تبھی باورچی خانہ جھلملایا۔

''کون ہے؟'' وہ زور سے چلائی۔

عجلت میں باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ خوف کے مارے جسم میں سے جان نکل گئی تھی۔ دروازے کے پٹ سے لگی تھر تھر کانپتی دیکھتی رہی۔

تیز تیز چلتی ہوئی سانس، حیرت سے پھٹی آنکھیں، خوفزدہ چہرہ۔ سامنے کھڑا شخص اس کی کیفیت پر ذرا سا مسکرایا تھا۔

''کک۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔'' اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

''کمال ہے میں تو سمجھا مجھے پہچان کر یہ حالت ہوئی ہے۔'' وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پلٹا۔

''چائے پیو گی؟'' آواز کی نرمی، لہجے کی خوب صورتی۔

''یہ۔۔۔ یہ آواز۔۔۔'' پہلی بار وہ روشنی میں اس کے سامنے تھا۔ بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔

''ایاز۔۔۔ ایاز نام ہے میرا۔'' نہایت آرام سے اطلاع دے رہا تھا۔ اپنے کام میں مگن۔۔۔ مصروف۔۔۔ ڈبے کھولتا۔۔۔ بند کرتا۔۔۔ کپ نکالتا ہوا۔۔۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی۔

''اونہوں سنبھل کے۔'' اس نے اسٹول گھسیٹ کر سامنے رکھا۔

''تم یہاں کیسے؟ کب سے؟'' وہ ہکلائی۔

''کافی دن ہو گئے، تم نے دیکھا نہیں، میں نے گھر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔'' وہ شوخی سے بولا پھر ٹرے اٹھا لی۔

''آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔'' وہ اسے ابا میاں کے کمرے میں لے آیا۔ یہاں ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ کرسی، میز کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دو کپ چائے اور بسکٹوں سے بھری پلیٹ درمیان میں میز پر رکھ کر وہ موڑھا گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو۔۔۔او۔۔۔ہو، کہیں تم اس دن والے واقعے کی وجہ سے۔۔۔ بھئی میرا یقین کرو، وہ حرکت میں نے نہیں۔۔۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ جلدی سے کہہ گئی تو اس نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ "میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ۔۔۔"

"میں یہاں کیسے موجود ہوں۔" اس نے خود ہی نور کی بات مکمل کی پھر اپنے کپ میں سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے دوسرا کپ اس کے سامنے کھسکا دیا۔

"چائے پیو، بہت مزے کی بنی ہے۔"

اس نے ایک نظر چائے کے کپ پر ڈالی اور پھر الجھ کر اس کی سمت دیکھنے لگی۔

"یہ سب منی خالہ کی عنایت ہے۔" وہ اس کی حد درجہ بے چینی بھانپ گیا تھا۔ "اس رات جب خوامخواہ مجھ پر شک کرتے ہوئے گھر کے سب افراد مجھے گھر سے نکالنے کے درپے تھے، منی خالہ انتہائی غصے میں میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے سامنے اس الزام کو رد کرنا چاہا مگر ان کا مارا گیا تھپڑ۔۔۔اف۔۔۔میں جیسے آسمان سے زمین پر آ گرا تھا۔ میں بے یقینی سے انہیں دیکھے گیا۔ تب انہوں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا، مجھے گالیاں دی تھیں۔ مجھے کوسا تھا، برا بھلا کہا تھا۔۔۔پھر اسی غصے کے عالم میں انہوں نے مجھے دھکے دیتے ہوئے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ جس وقت میرے قدم اس گھر کی دہلیز سے باہر نکلے، اس لمحے ان کا ہاتھ میرے ہاتھ تک آیا اور جب میرے عقب میں گھر کا دروازہ زوردار طریقے سے بند ہوا، میں ہاتھ میں پکڑی چابیوں کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ بہت دیر تک میں سمجھ نہیں پایا اور جب جانا، تو مجھے لگا۔۔۔میں ابھی بھی پہلے جیسی بلندی پہ کھڑا ہوں۔ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکا۔ منی خالہ کو مجھ پر اعتبار تھا، یقین تھا۔ بس اس کے علاوہ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک ہفتہ اپنے دوست کے ہاں رہا، امتحان مکمل کیا اور پھر یہاں چلا آیا۔ بیرونی دروازے کی چابی وامق بھائی سے مل گئی تھی۔" اس نے لمبا سا گھونٹ لے کر اپنی چائے ختم کی۔

"تو منی خالہ کو اس وقت بھی علم تھا کہ۔۔۔" اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"جب میں اس گھر میں آیا تو مجھے بہت عجیب سا لگا تھا۔ اس گھر سے، اس کے مکینوں سے میں نے بہت نفرت کی تھی۔ دربدری، پائمالی، ٹھوکریں، مار پیٹ، تنہائی، طعنے، سب اسی گھرانے کی دین تو تھے۔ ہوسکتا ہے حالات کچھ اور ہوتے، اگر میری ماں زندہ رہتی تو۔۔۔لیکن وہ مرگئی اور اس کی موت کا ذمہ دار بھی میں ہی ٹھہرا۔ اس گھر میں مجھے ہمیشہ عاطف کا بیٹا کہہ کر پکارا گیا۔ میری ماں کو سب فراموش کر گئے۔ وہ مجھے یتیم کہتے تھے مگر میں پُر یقین تھا ایک دن میرا باپ آئے گا، مجھے یہاں سے لے جائے گا۔

میں انتظار کرتا رہا۔ اس گھر کو اپنی یادوں میں آباد رکھا۔۔۔کہ یہ گھر میرا تھا، اپنی عمر کے سات سال گزارے تھے میں نے یہاں۔ وقت گزرتا رہا، انتظار ناامیدی میں بدل گیا، یاد، نفرت میں ڈھل گئی۔ میں دن رات محنت، مزدوری، مشقت کر کے خود کو پالتا رہا۔ اکاؤنٹس کی تعلیم بہت مہنگی تھی مگر میں نے ناممکن کو ممکن کیا۔ کارخانوں، فیکٹریوں، بھٹوں، منڈیوں میں سر کھپایا۔

اور پھر۔۔۔پھوپھو وہاں آگئیں۔ یعنی تمہاری منی خالہ۔۔۔میں ان سے بھی نفرت کرتا تھا۔ کرتے رہنا چاہتا تھا مگر معلوم نہیں کیوں میرا دل اپنے آس پاس رہنے والوں کی طرح ظالم اور کٹھور نہ بن سکا۔ منی خالہ نے میرا بہت خیال رکھا۔ بالکل یوں جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کا خیال رکھتی ہے۔ وہ چند دنوں میں میرے معمولات میں اس طرح شامل ہوئیں کہ میں حیران رہ گیا تھا۔ ان کی محبت میں ایک جادوئی اثر تھا۔ وہ بات بہت کم کرتی ہیں، ساری گفتگو ان کی خاموشی میں ہوتی ہے۔ انہوں نے کبھی میرے لیے پیار محبت جتایا نہیں، بس ان کا عمل خود بخود ثابت کر دیتا تھا۔ میں رات گئے دیوار پھلانگ کر گھر آتا تھا۔ وہ بغیر کہے دروازہ کھولنے کے لیے جاگتی رہتیں۔ میرا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، سب ان کی ذمہ داری بن گیا۔ میرا دل چاہتا تھا میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھوں اور بس اپنی ہی کہتا رہوں۔ وہ سب جو اتنے سالوں سے میرے اندر جمع ہے۔ وہ ان کے سامنے کھول کر رکھ دوں لیکن کبھی اتنا وقت ہی نہیں مل سکا۔ وہ اپنے دھندوں میں الجھی رہیں، میں اپنے مسئلے نبٹاتا رہا اور پھر ان کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی۔"

وہ بات کرتے کرتے کہیں کھو سا گیا تھا۔ نور نے اس سارے وقت میں پہلی مرتبہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

سوچ میں ڈوبی ہوئی گہری، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس خاندان کی میراث تھیں۔ سیاہ بال، گوری رنگت، دلکش نقوش۔۔۔سرمئی سوٹ پہنے بہت ہی عام اور سادہ حلیے کے باوجود اس قابل تھا کہ ہر کوئی اسے کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کی خواہش کرتا۔

نور نے طویل سانس لے کر نظر اس پر سے ہٹائی اور پلیٹ میں سے بسکٹ اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگی۔ تب وہ ذرا سا چونکا۔ اسے دیکھا پھر جانے کیا سوچ کر مسکرا دیا۔ مسکرانے کا انداز بالکل منی خالہ جیسا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ گویا مسکراہٹ کا مفہوم جاننا چاہتی ہو۔

"ایک دفعہ منی خالہ نے بہت عجیب سی بات کہی تھی۔ میں اپنے مستقبل کی ترقی کے ہزار نقشے ان کے سامنے کھینچ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔ معلوم نہیں تم اسے میری خود غرضی سمجھو گے یا کچھ اور۔۔۔لیکن مجھے لگتا ہے تم صرف نور کے لیے بنے ہو۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔

بالکل غیر متوقع بات تھی، نور کے ہاتھ سے بسکٹ چھوٹ گیا۔

"ہاں اس وقت میری بھی یہی حالت تھی۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ گیا۔

"چائے تو ٹھنڈی ہو گئی لیکن اب گرم میں نہیں، تم خود کرو گی۔"

وہ پلنگ پر سے کپڑے اٹھا کر کھونٹی پر لٹکانے لگا۔ جبکہ وہ ابھی تک اس کی کچھ دیر پہلے کی کہی گئی بات کے زیر اثر ساکت بیٹھی تھی۔

"جب میں یہاں آیا تو یہ گھر بہت بے آباد، ویران تھا۔۔۔مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ حالات و واقعات جو بھی رہے ہوں، یہ میرا آبائی گھر ہے۔ میں اسے ہر حال میں آباد، ہنستا بستا دیکھنا چاہتا ہوں اگر تم تھوڑا سا ساتھ دے دو تو میرا خیال ہے یہ زیادہ جلدی اور آسانی سے ہو گا۔" وہ بڑی لاپروائی سے کہتے ہوئے چپل پہن رہا تھا۔ نور سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"اور۔۔۔اور منی خالہ کا کیا ہو گا۔۔۔وہ بانکے خالو۔۔۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''تمہارے خالو سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ منی خالہ کو ایک ساتھی مل گیا ہے جو ان کی ساری مشکلات آسان کر دے گا پھر ہم بھی تو ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن تم سے ابھی تک چائے کا ایک کپ تو ختم نہیں ہوا۔ حد ہے بھئی سستی کی۔ تالا توڑنے میں تو بہت جلدی کی، وامق بھائی کے گھر میں بیٹھا تھا اس وقت، پانچ منٹ منی خالہ سے ملنے میں کیا لگ گئے محترمہ سب سامان باہر پھینکے تاریک کمروں میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھیں۔ ایک ذرا سا بٹن دبانے کی زحمت کر لیتیں تو۔۔۔''

اس نے ٹھنڈی ٹھار چائے سے بھرا کپ اس کے سامنے سے اٹھاتے ہوئے کھلی آنکھوں میں جھانکا اور چپل گھسیٹتا باہر چل دیا۔ وہ جو پچھلے کئی منٹ سے منہ بند کیے صرف اسے دیکھ اور سن رہی تھی، اس کے باہر نکلتے ہی بند مٹھی پر چہرے جمائے مسکرانے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ سارا گھر روشن تھا۔ اس کا اپنا چہرہ بھی اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر جگر جگر کرتے کمرے کے در و دیوار کو دیکھا۔

''گھر تو تم نے آباد کر لیا ہے ایاز! یہ دل بھی۔۔۔ مجھے تو صرف تمہارا ساتھ دینا ہوگا۔ اجالوں کی بستی میں پھول کھلانے کے لیے، دائمی محبت کے رنگ بھرنے کے لیے۔۔۔'' وہ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابا میاں اپنے پلنگ پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

وہ بھی جواباً مسکرائی اور پھر گنگناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

وسدے رہین اجاڑاں دے وچ دیوے بالن والے

☆☆☆☆☆☆

چاندنی میں نہائی رات

بجلی بہت زور سے کڑکی تھی۔ دو ستونوں پر ڈالی گئی چھت کے نیچے تخت پر سوئی ماہین کچی نیند سے ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ اس ہیبت ناک ماحول نے اسے اتنا سہما دیا تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ گنگ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ سرمئی شام سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان میں کہیں کھو گئی تھی اور خوفناک سی تاریکی چہار جانب سے اسے اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔ دھواں دھار برستی ہوئی نادیدہ بارش اور پُر زور گھن گرج سے ماحول کو مزید وحشت ناک کر دینے والے بادل، بجلی ایک بار پھر کڑکی تھی۔ بہت تیز روشنی کی آڑی ترچھی لکیر آسمان کے سیاہ بدن پر نمودار ہوئی تو وہ پوری لرز گئی تھی۔

''اماں۔'' اس نے پوری قوت سے پکارا تھا مگر آواز یہیں کہیں پھنکارتی ہوئی ہوا میں چک پھیریاں کھا کر گم ہوتی چلی گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد دیکھنا چاہا، یہ اس کا اپنا گھر نہیں تھا۔ وہ پہچان گئی تھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' اسے بری طرح رونا آ گیا۔ تب ہی اس کی نظر سیڑھیوں کی طرف گئی جہاں لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ ہوا کے زور سے بار بار کھل کر بند ہو رہا تھا اور اسے ایک دم ہی یاد آ گیا کہ وہ اپنے نانا ابو کے گھر میں تھی۔ شام کو جب سب بچے چھت پر کھیلنے کے لیے آئے تھے تو وہ بھی ان کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی۔ یہاں ایک ہی بڑا سا کمرا تھا جس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اور اس کمرے کے ساتھ یہ برآمدہ جس میں بچھے سال خوردہ تخت پر اوندھی لیٹی وہ بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی تھی مگر ان کے کھیل میں حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوئی تھی۔ دو روز ہو گئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے مگر ابھی تک وہ کسی سے گھل مل نہ پائی تھی۔ بے حد شرارتی، جھگڑالو، شیطان نما بچے اسے ایک آنکھ نہیں بھائے تھے پھر دوستی کیسے ہوتی، وہ بس تخت پر لیٹی ان کے عجیب و غریب قسم کے کھیل دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہی تھی۔ آسمان

پر اس وقت بادل چھائے ہوئے تھے اور خوشگوار ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ شروع میں دو چار بڑے بڑے چھینٹے گرے تو بڑے ماموں کا لمبا سا محبّ ایک دم ناچ اٹھا تھا۔

''ارے یہ دیکھو ننھیاں گر رہی ہیں، ارے یہ دیکھو چونیاں۔'' وہ پانی کے ہر قطرے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی بچے بھی اسی کھیل میں لگ گئے۔

کوئی اکنّی ہاتھ میں لینے کو دیوانہ ہوا تو کوئی چونی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گھٹنے چھیل بیٹھا۔ اس بے تکے کھیل سے خوامخواہ ہی چڑ کر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آوازیں آنی بند ہوگئی تھیں۔ اس نے بازوؤں پہ رکھا ہوا سر اٹھا کر ذرا کی ذرا دیکھا، بارش پوری طرح نہیں آئی تھی اور اب دن بھر کی جلتی بلتی چھت نے بارش کے کچھ قطروں کو اس طرح جذب کیا تھا کہ ان کا نام ونشان بھی نہ رہا تھا۔ اس نے آسمان پر مزید گھرے ہوتے بادلوں کو دیکھا اور پھر بازوؤں میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے دھیرے دھیرے تھپک رہے تھے اور پھر اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور کب بارش نے زور پکڑ لیا اور اب اس کی آنکھ کھلی تو کچھ سجھائی ہی نہ دے رہا تھا۔

''اماں!'' اس نے پہلی سسکی بھری اور ڈرتی کانپتی تخت سے نیچے اتر کر زینے کی طرف بھاگی تب ہی بادل بہت زور سے گرجا تھا، اس نے ایک تیز چیخ ماری اور صحن کے عین وسط میں رک گئی۔ ننھا سا دل دھڑک دھڑک کر اس کی سانسیں اتھل پتھل کیے جا رہا تھا۔ بادلوں کی گرج کہیں دور اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہوگئی تب اس نے بدقت اپنے شرابور ہوتے وجود کو حرکت دی تھی۔ زینے تک پہنچی ہی تھی جب تیز ہوا سے جھولتا ہوا دروازہ ٹھک سے اس کے اوپر آ لگا، وہ لڑکھڑا کر گری۔ چند لمحوں کے لیے گلا پھاڑ کر چیخی اور پھر دیوانہ وار دروازہ کھول کر نیچے کی طرف لپکی۔ پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی اس کی نظر صحن میں سیڑھیوں کے برابر لگے بیری کے درخت پر پڑی۔ جو کسی دیو کی مانند اسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے اس کی طرف جھکا آ رہا تھا۔

''اماں، اماں۔'' وہ چیختے چیختے نڈھال ہوگئی مگر اس کی مہین آواز اس طوفانی بارش سے بچنے کے لیے کمرے میں بند افراد کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پائی تھی۔ بارش کا پانی اس کی آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا تھا۔ اس پر گھپ اندھیرے میں بڑی بڑی سیڑھیاں اترنا بھی دشوار تھا۔ ہر جھٹکے پر یوں لگتا جیسے وہ ابھی سیڑھیوں پر لڑھک جائے گی۔ تب ہی آخری سیڑھی سے کوئی سایہ سا نمودار ہوا تھا اور کسی جن بھوت کی طرح اوپر ہی اوپر چلا آ رہا تھا۔ وہ دونوں مٹھیاں زور سے بھینچ کر اس قوت سے چلائی تھی کہ اپنے ہی کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ سایہ اس کے بے حد نزدیک آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ خوف کے مارے اس کا دل پھٹ جاتا اور وہ اپنے ہوش وحواس کھو کر سیڑھیوں پر گر جاتی، اس سائے نے اپنے بازو پھیلا کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

''ڈرو مت گڑیا! آؤ اماں کے پاس چلتے ہیں۔'' بہت ہی نرم مگر غیر مانوس انسانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے کے سبب خدوخال واضح نہ ہو سکے۔ بادل ایک بار پھر گرجا تھا۔ بارش کی شدت میں اضافہ ہوگیا تو اس کی ہچکی ایک بار پھر بندھ گئی۔ تاہم دل کچھ ٹھہر سا گیا تھا۔ آنے والا اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھامے سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اتر رہا تھا اور ماہین نے اپنے بازوؤں سے اس کی گردن کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

''تائی اماں۔۔۔! تائی اماں! دروازہ کھولیے۔'' لمبا صحن عبور کرنے کے بعد وہ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں برآمدے میں کھڑا ہوا دروازہ پیٹ رہا تھا جبکہ وہ اس کے شانے میں منہ گھسائے ابھی تک روئے چلی جا رہی تھی۔

''رو مت ماہین! تمہیں کچھ نہیں ہوا، اچھے بچوں کو کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا مگر اس کے رونے میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

تب اس نے پہلے سے بھی زیادہ قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ یہ بڑے کمرے کا دروازہ تھا جہاں رات گئے تک اہل خانہ نشست جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ یہ بڑے ماموں تھے جو انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

''ارے ماہین، یہ۔'' انہوں نے فوراً سسکتی ہوئی ماہین کو گود میں لیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''شاید یہ اوپر تھی، میں نے اسے سیڑھیوں پر چلاتے ہوئے دیکھا تو۔'' بڑے ماموں اس کی بات سنے بغیر واپس پلٹ گئے تو وہ بھی چپ سا ہو کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اماں نے کمرے میں اس کے رونے کی آوازیں سنی تو وہ بھاگی چلی آئیں۔ بارش سے بھیگی کانپتی ماہین کو دیکھا تو بجائے اسے چپ کروانے کے خود ہی رونے بیٹھ گئیں۔

''میں تو بے فکر تھی کہ بچی اپنوں کے درمیان ہے۔ سو پوچھنے والے، سو دیکھنے والے ہیں مگر یہاں کس کو فکر ہوگی، سب نے اپنے بچوں کو پکڑ دھکڑ کر کمروں میں بٹھا لیا۔ ایک میری یتیم بچی اس طوفانی بارش میں نجانے کہاں خوف سے دبکی رہی۔''

اماں کو اپنی بیوگی کے بعد بھائیوں کے در پہ آ پڑنے کا شدت سے احساس تھا اور اسی احساس نے انہیں حد سے زیادہ حساس اور زود رنج بنا دیا تھا۔

''ایسی بات نہیں فریدہ! تم سرِ شام ہی سونے کے لیے کمرے میں چلی گئیں تو ہم سمجھے شاید ماہین بھی تمہارے ساتھ ہوگی ورنہ ہم تو اپنے بچوں سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتے ہیں۔ تم خوامخواہ دل خراب مت کرو، ماہین خوفزدہ ہے اسے کمرے میں لے جا کر دلاسا دو۔'' بڑی ممانی نے رسان سے انہیں سمجھایا۔

''نیند کس کافر کو آتی ہے، اب تو دل چاہتا ہے خود بھی کچھ کھا کر سو رہوں۔ اگر ماہین کا خیال نہ ہو تو۔''

وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ماہین کو گود میں اٹھائے کمرے میں چلی گئیں اور اسے اپنے ساتھ لٹا کر تھپکنے لگیں۔ ماہین نیم غنودگی کے عالم میں ہچکیاں لیتی رہی اور اماں کی قمیص مٹھی میں جکڑے جانے کس وقت دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی پھر اس کے بعد وہ جتنی بار بھی اٹھی، گھر کے سب افراد کو پریشان چہروں کے ساتھ خود پر جھکے پایا تھا۔ ایک دو بار بازو میں سوئی کی سی تیز چبھن کا بھی احساس ہوا، وہ درد سے تڑپی چلائی اور پھر غافل ہوگئی۔ کئی دن بعد طبیعت سنبھلی تو معلوم ہوا، اتنے دن وہ سخت بخار میں پھنکتی رہی تھی۔

اس طوفانی بارش نے اس بچی کو اچھا خاصا ہراساں و پریشان کیا تھا اور اب بخار اترنے کے بعد بھی کمزوری اتنی تھی کہ وہ خود سے اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ کڑوے کڑوے سیرپ پینے کے بعد کچھ کھانے

کو دل نہ چاہتا۔ اماں منتیں کر کر کے تھک جاتیں تب بڑے ماموں آجاتے۔ ان کی ذرا سی ڈانٹ ڈپٹ سے ماہین کی جان نکل جاتی۔ ان کے رعب و دبدبے کے سامنے سارے انکار دم توڑ جاتے وہ جہاں تک ہو سکتا دل پہ جبر کر کے دلیہ، کھچڑی نگلتی پھر آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں میں التجا سمیٹے ماموں کی طرف دیکھتی تو ان کا سارا جاہ و جلال رفع دفع ہو جاتا۔ ہونٹوں پہ شفقت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوتی اور پھر وہ جھٹ سے اسے اپنی گود میں بٹھا لیتے۔

''ہماری مانو کہانی سنے گی؟'' ان کے پوچھنے پر وہ اثبات میں سر ہلا دیتی اور بڑے ماموں کوئی بہت ہی مزے دار سی کہانی اسے سنانے لگتے۔



کمرے میں پڑے پڑے دل اچاٹ سا ہونے لگا تو وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔ اماں برآمدے میں تخت پر منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔ ماہین نے ان کے قریب جا کر آہستگی سے انہیں پکارا انہوں نے منہ سے دوپٹہ ہٹا کر اپنی سرخ متورم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اپنے پاس بٹھا کر اس کی پیشانی کو چوما اور پھر ایک آہ بھرتے ہوئے دوپٹہ دوبارہ سے چہرے پہ تان لیا۔ وہ ان کے پاس بیٹھی بے زاری سے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ بڑی ممانی سبزی بناتے ہوئے نکی بوا کو دوپہر کے کھانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر ٹکر ٹکر ان سب کو دیکھتی رہی۔۔۔ چھوٹی ممانی آج بہت اکتائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اسی لیے بار بار اپنے بچوں کو جھڑک رہی تھیں۔ وہ تنگ آ کر وہاں سے اٹھ گئی اور پھر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر پائیں باغ میں چلی آئی۔ یہاں کونے میں دھری میز پہ نجمہ خالہ کی کتابیں اور نظر کی عینک تو موجود تھی مگر وہ خود غائب تھیں۔ ماہین ان کی کرسی پہ بیٹھ کر ایک کتاب کے ورق گننے لگی پھر ان کی عینک اٹھا کر ناک پہ جماتے ہوئے اس نے کتاب پڑھنے کی کوشش کی مگر کتاب ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی اور عینک ناک پر سے۔ چند لمحوں تک خود کو نجمہ خالہ محسوس کرتے ہوئے وہ اکتا گئی تو دونوں چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھ کر آم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں آ کر لیٹ گئی۔ حالیہ بارشوں نے موسم قدرے خوشگوار کر دیا تھا۔ سبک ہوا کی چھیڑ خانی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سبز گھاس پر لیٹی درختوں پر کودتی، شور مچاتی چڑیوں کو دیکھنے لگی۔

''یہ والا باغ تو بہت چھوٹا ہے، چڑیاں بھی تھوڑی سی ہیں۔ ہمارے گھر والا باغ کتنا بڑا تھا اور اس میں کتنے ڈھیر سارے درخت تھے، چڑیاں تو ایسی رنگ برنگی ہوتی تھیں کہ۔۔۔''

''ارے ماہین گڑیا ادھر بیٹھی ہے؟'' کوئی اس کے قریب آ کر بولا تھا اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ دس گیارہ سال کا لڑکا تھا۔ چہرے پہ بھرپور دوستانہ مسکراہٹ لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''پتا نہیں کون ہے؟'' اس نے گھاس کا تنکا منہ میں ڈال کر سوچتے ہوئے اپنا رخ پھیر لیا جبکہ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

''مجھے پہچانتی ہو؟'' وہ بہت امید سے پوچھ رہا تھا۔ ماہین نے ایک نظر دوبارہ اسے دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا'' وہ خواہ مخواہ ہی ہنسا۔

''اس دن رات کو بارش ہو رہی تھی ناں۔ تم چھت پہ ڈر گئی تھیں کسی نے بھی تمہارے رونے کی

آواز نہیں سنی تھی۔ میں کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھا تھا۔ بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں مجھے تمہارا سایہ سا نظر آ گیا۔ پھر میں ہی تمہیں اماں کے پاس لے کر گیا تھا۔'' وہ فخریہ انداز میں بتا رہا تھا۔ ماہین کو ایک دم سے یاد آ گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

''تمہیں بارش سے ڈر لگتا ہے کیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ ماہین نے جھٹ سے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ اس کے صاف جھوٹ بولنے پر بے اختیار ہنس دیا تھا۔ ماہین شرمندگی سے بچنے کے لیے سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔ درخت کے گھنے پتوں سے چھن چھن کر آتی روشنی کی کرنیں عجب کھیل کھیل رہی تھیں وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''تم کو یہ گھر کیسا لگا ماہین؟'' اس کے دوبارہ بولنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''اچھا ہے مگر۔''

''مگر۔۔۔؟''

''ہمارے والا گھر زیادہ اچھا تھا۔'' وہ دل کی بات کہہ گئی۔

''کیا واقعی؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''ہاں سچ وہ گھر تو بہت اچھا تھا، بہت پیارا۔'' وہ اب اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اور وہاں کے درخت اتنے اونچے تھے کہ مالی بابا کا بیٹا ایک درخت پر چڑھا تو اللہ تعالیٰ سے ہاتھ ملا کر واپس آیا تھا۔'' وہ پُرجوش معصومیت سے اسے بتا رہی تھی۔ اس نے لب بھینچ کر اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''مالی بابا کے بیٹے نے بتایا تھا۔''

''اچھا اور کیا کیا تھا وہاں؟'' وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

''وہاں کیاریوں میں پھول ہوا کرتے تھے ہر رنگ کے، وہاں ٹیوب ویل بھی تھا اور میرے دوست بھی۔'' وہ ایک دم بجھ سی گئی تھی۔ اسے اپنا گھر بہت یاد آ رہا تھا۔

ابا ٹیچرز ٹریننگ کالج میں پڑھاتے تھے اور اسی کالج کے ایک کونے میں کھڑے تین کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر میں وہ لوگ رہا کرتے تھے۔ دو پختہ کمرے، کچن، باتھ روم اور کھلا سا صحن، کہنے کو بس یہ ہی ان کا گھر تھا مگر وہ تو پورے کالج کو اپنی ہی ملکیت سمجھا کرتی تھی۔ جونہی کالج میں پڑھائی کے اوقات ختم ہوتے کالج میں ملازمین کے بچوں کا راج ہوتا۔ وہ سب لوگ ایک ٹولی کی شکل میں اپنے گھروں سے باہر آ جاتے۔ پھر وہ ہوتے اور کالج کا وسیع و عریض احاطہ ہوتا۔ جہاں ہر قسم کے پھل دار درخت تھے اور کیاریوں میں ہر رنگ کے چھوٹے بڑے پھول۔ بڑے بچے درختوں پر چڑھ کر پھل گراتے اور چھوٹے بچے پھلوں سے اپنی جھولیاں بھر لیتے۔ پھر سب مل کر ٹیوب ویل کی طرف جاتے، وہاں رگڑ رگڑ کر پھل دھوتے اور مزے لے لے کر کھاتے۔ ٹاہلی کی مضبوط شاخوں پر مالی بابا نے ان کے لیے ایک پینگ بھی ڈال رکھی تھی۔ لڑکیاں جی بھر کے جھولا جھولتیں اور لڑکے چھپا چھپ ٹیوب ویل کے پانی میں نہاتے۔ شام گئے تھک ہار کر گھر کو واپسی ہوتی اور گرمیوں کی سخت دوپہروں، حبس زدہ شاموں کے بعد وہ سرسراتی

ہوا میں کھلے آنگن میں اماں کے ساتھ لیٹتی تھی تو نیند کیسی خوبصورت آیا کرتی تھی سردیوں کی کپکپاتی صبحوں کے بعد کالج کے گراؤنڈ دھوپ سے بھر جاتے تو وہ اپنے سارے کھلونے اٹھا کر وہاں چلی آتی تھی کیسے مزے کے دن ہوتے تھے۔ وہ اپنی جگہ چپ چاپ لیٹی اپنے ایک ایک دوست کے بارے میں سوچتی رہی۔ مالی کا موٹا سا بیٹا۔ جسے وہ سب ''گونگلو'' کہتے تھے۔

چوکیدار کی زرد چہرے والی بیٹی جس کا نام انہوں نے ''ہلدی'' رکھ چھوڑا تھا۔

اور لیبارٹری اسسٹنٹ کی بیٹی ''بھنڈی'' جو اپنا نام سن کر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی تھی اور اس کا پستہ قد بھائی ''کوڈو۔''

''یہ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟'' غصیلی آواز نے سوچ میں گم ماہین کو بری طرح چونکایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نجمہ خالہ سرخ چہرہ لیے اس کے سر پہ کھڑی تھیں اور اس لڑکے پر ناراض ہو رہی تھیں جس کے نام سے وہ ابھی تک ناواقف تھی۔

''اول نمبر کے ڈھیٹ انسان ہو تم۔۔۔ تم اس قابل ہی نہیں کہ کوئی ذمہ داری تمہیں سونپی جائے۔'' اس نے کئی بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر نجمہ خالہ اسے کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔

''کھا کر حرام کرنا تو تمہاری گھٹی میں پڑا ہے۔ مفت خوری کی عادت نے تمہیں محنت کے نام سے ہی بے زار کر دیا ہے مگر اتنا تو بتاؤ کہ بازار تک جانے میں کتنے ہل جوتنے پڑتے ہیں تمہیں۔''

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر نجمہ خالہ کی قیاس آرائی ایک بار پھر اسے چپ کروا گئی۔

''ہاں، ہاں معلوم ہے مجھے۔ گھر میں سائیکل نہیں تھی مگر اللہ نے اتنی لمبی ٹانگیں جو دے رکھی ہیں، یہ کس واسطے ہیں۔ کیا دو قدم چل کر بازار تک بھی نہ جا سکتے تھے۔ اب بتاؤ کون سا دوپٹہ لے کر جاؤں گی میں نئے سوٹ کے ساتھ۔'' انہوں نے تھک کر سانس لیا۔ اب کی بار اس لڑکے نے منہ کھولنے کی غلطی نہ کی تھی۔

''اب جاؤ دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ اتنی مسکینی برستی ہے چہرے پہ کہ خوامخواہ ترس آ جاتا ہے۔'' وہ دل کی بھڑاس نکال چکیں۔ تب اس کے چہرے کی مسکینی پہ ترس آیا تھا انہیں۔

ماہین نے دیکھا، وہ لڑکا اپنا دھواں دھواں چہرہ لیے لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چل دیا تھا۔

''اور ہاں نواب صاحب! اگر زحمت نہ ہو تو آج شام تک دوپٹہ بازار سے لے آیئے گا۔'' نجمہ خالہ بہت طنزیہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ وہ جاتے جاتے ایک دم رک کر پلٹا تھا۔

''میں آج صبح ہی دوپٹہ لے آیا تھا۔ آپ کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔''

وہ بھرائی آواز میں کہہ کر ان کی طرف دیکھے بغیر پلٹا تھا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ماہین نے نظروں کا زاویہ بدل کر نجمہ خالہ کو دیکھا۔ وہ گم صم سی اپنی جگہ پر کھڑی تھیں اور نگاہیں اس طرف جمی ہوئی تھیں، جدھر سے ابھی ابھی وہ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ان کے جسم نے حرکت کی تھی اور وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی جا کر اپنی کرسی پہ ڈھے سی گئی تھیں۔ ماہین نے ناگواری نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھٹک کر بڑبڑائی۔

''اب یقیناً پچھتا رہی ہوں گی۔'' اس کی تمام تر ہمدردی اس لڑکے کے ساتھ تھی۔



آج کئی روز ہونے کو آئے تھے مگر اجنبیت تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ حالانکہ گھر میں اس کے ہم عمر کئی بچے موجود تھے۔ چھوٹے ماموں کے عبید بھیا اور بڑے ماموں کی سمیعہ آپا تو خیر عمر میں اس سے کافی بڑی تھیں لیکن محب اور زرین کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی انہوں نے ماہین کو بھی کئی بار اپنے اندر شامل کرنا چاہا مگر ان کی سرگرمیاں ماہین کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھیں سو وہ جلد ہی ان سے الگ ہو جاتی تھی۔ چھوٹے ماموں کا اسد ان ہی دنوں اسکول میں داخل ہوا تھا سو وہ بے حد جھنجھلایا ہوا رہتا، ادھر کسی نے چھیڑا، ادھر اس کا باجا بجنے لگتا۔

چنانچہ اس عرصے میں وہ کسی سے بھی ٹھیک طرح سے گھل مل نہ پائی تھی۔ ہاں بس ایک وہ ہی تھا ''چاند'' جسے مذاق میں سب بچے اور نجمہ خالہ غصے میں ''چاند گرہن'' کہا کرتی تھیں۔ مگر وہ ناراض نہیں ہوتا تھا بس ہلکے سے مسکرا دیتا یا پھر یونہی اپنی سوچ میں گم رہتا جیسے سب لوگ اسے نہیں کسی اور کو ''چاند گرہن'' کہتے ہیں۔

پہلی رات سے لے کر اب تک صرف وہی تھا جو ماہین کو بہت اچھا لگا تھا۔ عمر میں وہ ان سب بچوں سے کافی بڑا تھا۔ عبید بھیا سے بھی سال چھ ماہ بڑا۔۔۔ مگر جب وہ ماہین سے بات کرتا تھا تو اسی کی طرح چھوٹا بچہ بن جاتا تھا۔ ماہین سب لوگوں میں سے صرف اسے ہی اپنا دوست مانتی تھی اور اس سے بات کرتے ہوئے ماہین کو کسی قسم کی گھبراہٹ بھی محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن وہ گھر کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ ماہین کو اس سے بات کرنے یا اس کے پاس بیٹھنے کا بہت ہی کم وقت ملتا تھا۔ سو سارا دن وہ بیگانوں کی طرح کبھی اس کمرے، کبھی اس دالان میں گھومتی رہتی۔۔۔ اس کی اسی کیفیت کو دیکھتے ہوئے بڑے ماموں نے اسے جلد از جلد اسکول داخل کروانے کا سوچ لیا تھا۔ مگر ان ہی دنوں اس کی ملاقات ایک ایسی شخصیت سے ہوئی تھی جس سے ملنے کے بعد اس گھر میں رہنا اسے بہت آسان اور دلچسپ معلوم ہونے لگا تھا۔



صبح اس کی آنکھ کسی غیر معمولی احساس کے تحت کھلی تھی۔ وہ چند لمحے یونہی لیٹی چھت کو گھورتی رہی پھر اچانک اسے احساس ہوا جیسے گھر میں بھونچال سا آیا ہوا ہے۔ صحن عجیب بے ہنگم سی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ وہ آنکھیں ملتی اپنے کمرے سے نکل کر باہر کو بھاگی اور پھر حیران رہ گئی۔ وہ عام سے نقوش کی مالک ایک دبلی پتلی لڑکی تھی۔ کھلے پائنچوں والی ٹخنوں سے اوپر شلوار اور گھٹنوں سے اونچی قمیص، کریب کا بڑا سا دوپٹہ سر پہ لے کر باقی گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ایک پلو زمین کو چھو رہا تھا۔ گھر کے سب بچوں کے ساتھ ہمسائے کے ایک دو بچوں کو اکٹھا کیے وہ ان کے عین وسط میں اپنی کراری آواز میں نعت پڑھ رہی تھی۔

شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ
عطروں سے بڑھ کر تیرا پسینہ
شاہِ مدینہ

''اوئے میں نے تھپڑ لگانا ہے تمہارے، ادھر سیدھے ہو کے کھڑے ہو۔'' اس نے کیاری کی

طرف جاتے بچے کو بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔
''چلو اب آگے بڑھو۔''

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

سارے بچے جوش و خروش سے اس کا ساتھ دینے لگے تھے۔
''اے ہیڈ ماسٹرنی! بند کر یہ ڈرامہ۔۔۔۔ اِدھر ہزار کام پڑے ہیں کرنے کو۔'' نکی بوا باورچی خانے کی کھڑکی سے چلائیں۔
''چلو، چلو جلدی سے قومی ترانہ پڑھو۔'' اس لڑکی نے کوئی پروانہ کی تھی۔

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین

اس نے کشور کو جی بھر کے رگڑا دیا تھا۔ ماہین کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔
''کیا مصیبت ہے؟ یہ گھر ہے یا پیلی دیواروں والا اسکول۔ کان پک گئے ہیں صبح سے یہ الٹی سیدھی بکواس سن کر خبردار جواب مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔''
نجمہ خالہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلیں تو ماہین ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھ کر ڈر سی گئی تھی، چہرے پہ نجانے کون سا ماسک تھوپ رکھا تھا۔ غصے سے لال ہوتی ہوئی آنکھیں۔ چیختی، دھاڑتی وہ برآمدے تک آئیں تو ماہین خوامخواہ ہی ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ حسبِ عادت خوب بول کر دھماکے سے دروازہ بند کرتے ہوئے اپنے کمرے میں غائب ہوئیں تب ماہین کی جان میں جان آئی۔
اس نے پلٹ کر دیکھا، صحن بالکل خالی تھا۔ سارے بچے غائب ہو چکے تھے۔ بس ایک وہی لڑکی رہ گئی تھی جو ہونٹوں کی بے آواز جنبش سے نجمہ خالہ کی سب باتوں کے جواب دے رہی تھی آخر میں جب اس نے غصے کے اظہار کے لیے ''اونہہ'' کہہ کر سر کو زوردار جھٹکا دیا تو ماہین کی بے اختیار ہنسی نکل گئی ہے وہ لڑکی خشمگیں نگاہوں سے گھورتی اس کی طرف آئی۔
''یہ تمہیں کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟'' وہ کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔ ماہین کی ہنسی کو وہیں بریک لگ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکی مزید کچھ کہتی، کچن سے نکی بوا ایک بار پھر چلا اٹھی تھیں۔
''افوہ نکی بوا! تم اپنا ٹیپ بند ہی رکھا کرو۔ پتا ہے مجھے کون سے کام کرنے والے ہیں۔''
جواباً اس نے چمک کر کہا اور پھر ماہین کو سرتاپا دیکھنے کے بعد اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ماہین وہیں تخت پر ٹک گئی تھی۔ ذرا دیر بعد نکی بوا ناشتا بھی اس کے سامنے رکھ گئیں۔ تو وہ ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی دیکھتی گئی جو حیرت انگیز طور پر کام میں بہت پھرتیلی تھی۔ صحن میں بچھی بڑی بڑی چارپائیاں اس نے بہت سہولت کے ساتھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی تھیں۔ پھر بچوں کے جوتے، چپلیں اور کھلونے اٹھا کر ان کی جگہوں پر رکھے، پائپ لگا کر کیاریوں اور بیری کے درخت کو پانی دیا اور پھر صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے بڑی سی جھاڑو اٹھا کر پھیرنے لگی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا تھا اور بڑے ماموں صبح کی سیر کے بعد واپس آئے تھے۔ وہ لڑکی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کی طرف لپکی، بڑے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا جواباً بڑے ماموں نے بھی پُرجوش انداز میں اس کے سر پہ تھپکی دی تھی۔
''آ گئی ہور تو! دل لگ گیا تھا تمہارا گاؤں میں؟''
''کہاں جی، بڑی مشکل سے دن پورے کیے۔ ادھر اماں بستر سے اٹھی ادھر میں بھاگی چلی آئی۔''

اس نے بڑی بے مروتی سے اپنی سوتیلی اماں کا ذکر کیا۔
''اچھا، تیری اماں ٹھیک تو تھی نا۔۔۔؟''
وہ اس سے باتیں کرتے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ماہین کو غالباً انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا مگر جب ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رتو نے فخریہ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تو وہ ایک دم جل سی گئی۔ اسے لگا رتو اس سے زیادہ حق بڑے ماموں پر جما رہی تھی۔ وہ ناشتا وہیں چھوڑ کر بھاگتی ہوئی بڑے ماموں کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ انہوں نے دیکھتے ہی فوراً اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ تب ماہین نے شرارتی نظروں سے رتو کی طرف دیکھا، جو کن انکھیوں سے مسلسل اس کی طرف دیکھنے کے بعد بھی خود کو بے حد انجان اور بے نیاز ظاہر کرتے ہوئے ماموں کی اسٹڈی ٹیبل کو اپنے دوپٹے سے رگڑنے لگی تھی پھر ان کی عینک صاف کر کے میز پہ رکھی اور ماموں سے ناشتے کا پوچھ کر باہر کی طرف بڑھی۔
''تم تو اپنا ناشتا کر لو۔ وہاں تخت پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اس نے جاتے جاتے دانستہ پلٹ کر بلند آواز میں کہا تھا۔
''بھئی، ماہین کا ناشتا بھی یہیں لے آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے کر لیں گے۔'' بڑے ماموں نے کہا تو رتو نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ہونٹوں کو بے آواز جنبش دے کر ''اونہہ'' کہتی سر کو جھٹکتی باہر نکل گئی۔ ماہین کو اس کے اس انداز پہ ایک بار پھر زور کی ہنسی آ گئی تھی۔
''ہا میں کیا ہوا؟'' بڑے ماموں نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس کی ہنسی خود بخود تھم گئی تھی۔



بڑے ماموں اسے اسکول میں داخل کروا آئے تھے۔ ابتدائی چند دن تو ویسے ہی گزر رہے تھے جیسے ہر بچے کے گزرتے ہیں یعنی روتے دھوتے، منہ بسورتے لیکن رفتہ رفتہ اسکول کے ماحول سے واقفیت ہو گئی تھی۔ وہ اسکول سے واپس آتی تو فوراً چاند بھیا کو تلاش کرنے لگتی۔
وہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتے، کبھی سودا سلف لا رہے ہوتے۔ کبھی دھوبی کے پاس جانا ہوتا، کبھی پائیں باغ کی گھاس کاٹنے میں مشغول تو کبھی صحن کی کیاریاں ٹھیک کرنے میں لیکن وہ بھی سارے گھر میں انہیں ڈھونڈتی ڈھانڈتی بالآخر ان تک پہنچ ہی جاتی اور پھر انہیں سارے دن کی روداد سنانے لگتی۔ فلاں ٹیچر نے ایسے پڑھایا۔ فلاں نے ایسے ڈانٹا۔ اس دوست سے میری کٹی ہو گئی۔ اس دوست کے ساتھ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات انہیں سناتے نہ تھکتی اور وہ سنتے نہ تھکتے۔ کبھی کبھی تو اسے وہم ہونے لگتا کہ وہ خود ہی بول رہی ہے۔ چاند بھیا تو اپنے کام میں مصروف ہیں۔ تب وہ ہر دوسری بات پر تصدیق کرتی۔
''چاند بھیا سن رہے ہیں نا؟''
''کہے جاؤ گڑیا! کہے جاؤ، تمہارے چاند بھیا سن رہے ہیں۔'' وہ اسے دلاسا دیتے تو وہ ایک بار پھر فل اسپیڈ سے شروع ہو جاتی، اس روز بھی وہ خود ہی بولتے بولتے تھک گئی تو چاند بھیا سے پوچھنے لگی۔
''آپ رہتے کہاں ہیں؟''
''میں؟ اسی گھر میں رہتا ہوں؟'' انہوں نے کیاریوں سے خشک پتے اکٹھے کرتے ہوئے سر اٹھا

کر دیکھا تو وہ حیران سی ہوگئی تھی۔

''اسی گھر میں کہاں؟'' وہ تو سرِ شام ہی اماں کے ساتھ کمرے میں گھس جاتی تھی۔ سو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ بھی اس گھر کا ایک حصہ ہیں۔

''یہ جو کھڑکی سامنے نظر آرہی ہے ناں۔ یہ میرے کمرے کی ہے۔ دیکھنے چلو گی میرا کمرا۔'' انہوں نے پیش کش کی تو وہ فوراً مان گئی۔

''ہائے اللہ یہ ہے آپ کا کمرا۔'' وہ حیرت سے چاروں طرف گھوم گئی۔ پلستر اکھڑی دیواروں والا سیلن زدہ کمرہ جس کے ایک طرف گندم سے بھری بوریاں پڑی تھیں۔۔۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا تھا اور گھر کا بہت سا فالتو سامان، بس بائیں دیوار کے ساتھ بچھی ایک چارپائی، اس پہ پڑا بوسیدہ سا بستر اور برابر میں رکھی ایک چھوٹی میز یہ تھی ان کی کل متاع جس کے بل بوتے پر وہ اس کمرے کو اپنا کمرا کہتے تھے۔

''اس گھر میں اور کوئی کمرا اتنا گندہ نہیں ہے۔ بو بھی آرہی ہے۔'' اس نے ناک سکوڑی تو چاند بھیا کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

''آپ کے کمرے میں بلب نہیں ہے کیا؟ کتنا اندھیرا ہو رہا ہے؟ ماہین کو اس نیم تاریک کمرے اور سائے کی طرح خاموش کھڑے چاند بھیا سے خوف آنے لگا تھا۔

''نہیں گڑیا! یہاں بلب نہیں ہے۔ بجلی کا کنکشن تو ہے لیکن۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک سے گئے تھے۔ پھر آگے بڑھ کر انہوں نے باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے سورج کی نارنجی شعاعوں کو کمرے میں آنے کا راستہ مل گیا تھا۔

''تمہیں پتا ہے ماہین! اس کمرے میں بہت ساری چیزیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ صرف محسوس ہوتی ہیں۔ بہت سے چہرے، بہت سی آوازیں ہیں۔ جو رفتہ رفتہ نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت جب رات کی تاریکی چپکے سے اس کمرے میں داخل ہونے لگتی ہے۔ تب میں یہ کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔ مجھ میں اس کو کھولنے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ یہ درخت یہ پھول بوٹے اس وقت اس ہیئت میں نہیں رہتے ان کی شکلیں بدلنے لگتی ہیں اور میں ان بدلتی ہوئی شکلوں سے خوفزدہ ہونے لگتا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگتا ہے میں۔۔۔''

وہ کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکائے جیسے بہت تھکے تھکے انداز میں بول رہے تھے۔ ماہین کو ان کی صرف آخری بات سمجھ میں آئی تھی۔

''چاند بھیا آپ کو ڈر لگتا ہے؟ کس چیز سے؟ اور آپ اتنے بڑے ہو کر بھی ڈرتے ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ ہلایا تو وہ چونک سے گئے۔

''کون میں؟ نہیں، میں تو نہیں ڈرتا۔ تم سے کس نے کہا۔''

''ابھی آپ نے خود ہی تو کہا؟'' وہ الجھ سی گئی

''تم۔۔۔ تم میری بات سن رہی تھیں۔'' وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''ہاں۔''

''کمال ہے، میں تو بس خود سے بات کر رہا تھا لیکن تم کتنی اچھی ہو ماہین! تم میری باتیں کس قدر توجہ سے سنتی ہو۔ حالانکہ ان میں تمہاری دلچسپی کی تو کوئی بات نہیں ہوتی۔ اچھا چلو، آج سے میں تمہارا پکا پکا

بھیا بن جاتا ہوں۔ ابھی بازار جاؤں گا، تو تمہارے لیے چاکلیٹ لے کر آؤں گا، اتنی اچھی گڑیا کو چاکلیٹ تو ملنا چاہیے ناں؟'' انہوں نے کہا تو وہ خوش ہو کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ وہاں سے باہر نکلی تو رتو باغ میں جھولا جھول رہی تھی۔ اسے چاند کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو فوراً اٹھ کر اس کی طرف بھاگی۔

''اے تم کیا کر رہی تھیں وہاں؟'' اس کا لہجہ غصیلا تھا۔ ماہین کو اچھا نہیں لگا تو وہ یونہی جواب دیے بغیر رخ موڑ گئی۔

''چلو بھاگو یہاں سے، تمہاری اماں تمہیں بلا رہی ہیں۔'' وہ اس کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر خوب ہی اس پر رعب جماتی تھی اب بھی ماہین وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اس سے خوفزدہ ہو کر وہاں سے واپس آگئی تھی۔



ماہین ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی، اماں کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ یوں بھی نجانے کیوں اماں اپنے ہی خیالوں میں گم رہنے لگی تھیں۔ وہ بولتی رہتی، انہیں خبر ہی نہ ہوتی۔ وہ سوال پوچھ پوچھ کر تھک جاتی اماں کی طرف سے جواب نہ آتا تب وہ چڑ جاتی اور اماں کے پاس سے اٹھ جاتی۔ اب بھی وہ ہمیشہ کی طرح انہیں ڈھونڈنے کے بجائے برآمدے کی سیڑھیوں پر آبیٹھی تھی۔ وہ اسکول سے آکر سو گئی تھی۔ اس لیے ابھی تک یونیفارم میں ہی تھی۔ نکی بوا صحن میں رکھی میز پر شام کی چائے کے برتن رکھ رہی تھیں۔ رتو غائب تھی اور چاند بھیا کمرے سے کرسیاں لا کر صحن میں رکھ رہے تھے۔ اسے وہاں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو ماہین؟'' وہ ابھی جواب بھی نہ دے پائی تھی جب نجمہ خالہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ٹک ٹک سینڈل بجاتی باہر آگئیں۔

''ارے یہاں کیوں بیٹھی ہو ماہین اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے کپڑے بھی نہیں بدلے ابھی تک، چلو اٹھو شاباش۔ نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرو۔ ایک تو آپا میری سمجھ میں نہیں آتیں، بھائی صاحب کی وفات کے بعد تو وہ زندگی گزارنے کا طور طریقہ بھی بھول گئی ہیں۔ اب بتاؤ بھلا کوئی مرنے والوں کے ساتھ مرا ہے۔ انہیں اپنا نہیں تو ماہین کا تو خیال کرنا چاہیے۔''

وہ فل اسپیڈ سے بولتی صحن میں چلی گئیں۔ ماہین کو نجمہ خالہ کا اماں کے خلاف بولنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، اسی لیے یونہی گھسی سی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

''اے چاند! ذرا پائپ تو نل میں لگا دو اور اگر ہو سکے تو کبھی میرے کہے بغیر بھی ان کی طرف دیکھ لیا کرو کیسی خشک ہو رہی ہیں کیاریاں۔'' چاند بھیا نے جھٹ پٹ پائپ نل میں لگا دیا اور وہ کیاریوں میں پانی بھرنے لگیں۔

''ہاں، وہ تمہارا ایپھٹیچر سا ریڈیو بھی تو ہوا کرتا ہے۔ وہ تو لے کر آؤ ذرا'' نجمہ خالہ بہت کم اس موڈ میں چاند بھیا سے بات کیا کرتی تھیں۔ چاند بھیا بے چارے پہلے سے بھی زیادہ پھرتی سے اور گھبراتے ہوئے ان کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔

''پتا نہیں چاند بھیا، نجمہ خالہ سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟'' ماہین نے چاند بھیا کو تقریباً بھاگ کر ریڈیو لاتے دیکھا تو چڑ کر سوچنے لگی۔

"آج تو ہمیں کوئی اچھا سا گانا سنوا دو۔"

وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھیں۔ اسی لیے کیاری میں لگے گلابوں کو پانی کی باریک پھوار سے دھو رہی تھیں۔ چاند بھیا کچھ دیر تک ریڈیو کان سے لگائے سوئی گھماتے رہے اور پھر ایک جگہ سیٹ کر کے میز پہ رکھ دیا اور پھر ماہین کو اشارے سے اپنی طرف بلاتے ہوئے کلیوں کے جھنڈ کے پاس جا بیٹھے تھے۔ ماہین سست سے انداز میں چلتی ہوئی ان کے پاس جا بیٹھی تھی۔ چاند بھیا فرش پہ بکھری کلیوں کو اپنے ہاتھوں میں اکٹھا کر رہے تھے۔

"کلیوں کا ہار بناؤ گی؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو ماہین نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پہلے کلیاں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں انہیں دھاگے میں پرو لیں گے۔" وہ کلیاں سمیٹ سمیٹ کر اس کی فراک میں رکھنے لگے۔

ناگن ناگن زہر پیا ہے بجا کے من کی بین
پیار نہ کرنے کی کرتے ہیں تبھی تو ہم تلقین

مغنیہ کی آواز سرسراتی ہوا کے ساتھ پورے صحن میں بکھرتی جا رہی تھی۔ لفظوں کے معنی و مفہوم سے آگاہ نہ ہونے کے باوجود ماہین کو فضا میں پھیلے یہ سر بہت بھلے لگ رہے تھے۔

چھوڑ دیا پل بھر میں اس نے جنم جنم کا ساتھ
اتر گئی ٹوٹے سپنوں کی ہر دے میں سنگین

ماہین نے دیکھا، نجمہ خالہ پائپ یونہی زمین پر پھینک کر ریڈیو کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔

اب کے برس بستی میں آیا یہ کیسا موسم
آنکھوں آنکھوں گھنی اداسی، ہر چہرہ غمگین

اس نے نجمہ خالہ کو ریڈیو اٹھا کر ہاتھ میں لیتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اتنا اچھا گانا چل رہا ہے، اب یہ سوئی گھما دیں گی۔" اسے افسوس ہونے لگا مگر اگلے ہی پل نجمہ خالہ نے ریڈیو گھما کر پوری قوت سے زمین پہ دے مارا تھا۔

"آ۔۔۔" ماہین کی بے اختیار ہی چیخ نکل گئی تھی۔ چاند بھیا بجلی کی سی تیزی سے پلٹے اور پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

ناگن ناگن زہر پیا ہے بجا کے من کی بین

ریڈیو سے آواز آنا ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ خالہ بھرپور وحشت کے عالم میں آگے بڑھیں اور ریڈیو کو اٹھا کر زمین پہ دے مارا، چاند بھیا تڑپ کر اس طرف بھاگے تھے، یہ ریڈیو ان کی تنہائی کا واحد ساتھی، جسے اب نجمہ خالہ اپنے سینڈلوں سے توڑنے پھوڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ریڈیو سے آواز آنا اب بند ہو گئی تھی۔

"نہیں ایسا مت کیجئے، آپ کو خدا کا واسطہ، اسے مت توڑیے۔"

چاند بھیا نے جتنی بار بھی ریڈیو اٹھانے کی کوشش کی۔ نجمہ خالہ کے سینڈل کی ہیل اتنی دفعہ ہی ان کا ہاتھ زخمی کر گئی تھی۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور وہ دونوں جبڑے بھینچے شدید غصے کے عالم میں تھیں۔ ماہین وہیں

اپنی جگہ پر سمٹ گئی تھی۔ تب ہی نجمہ خالہ نے چاند بھیا کو کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر زناٹے دار تھپڑ انہیں دے مارا پھر دوسرا اور پھر جیسے وہ جنونی انداز میں انہیں مارتی چلی گئی تھیں۔ انہوں نے لمبے ناخن سے ان کے چہرے پہ کھرونچیں ڈال دی تھیں۔ تھپڑوں سے ان کا منہ سرخ کر ڈالا تھا۔ ماہین خوفزدہ سی ہو کر دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر چیخنے لگی تھی۔ پھر جیسے ایک دم ہی آنگن میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ اس نے دیکھا نجمہ خالہ وہاں موجود نہیں تھیں اور چاند بھیا گرتے پڑتے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ نکی بوا اور رتو اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑی تھیں۔ ماہین کے رونے کے سوائے صحن میں اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس نے چاند بھیا کو پکارنا چاہا ان کے پیچھے جانا چاہا، مگر اس کی ہمت ہی نہ پڑ سکی۔ تب ہی کوئی اس کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر دیکھا، وہ رتو تھی۔

"تم کیوں رو رہی ہو؟" اس کے پوچھنے پر ماہین کے رونے میں شدت آ گئی۔

"بتاؤ ناں، کیوں رو رہی ہو۔ انہوں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا۔"

"لیکن خالہ نے چاند بھیا کو تو مارا ناں، وہ بھی اتنی زور سے۔" وہ مزید رونے لگی۔

"تم اس وجہ سے رو رہی ہو؟" رتو کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو رتو فوراً ہی اس کے نزدیک ہو بیٹھی۔ اس کے آنسو پونچھے، بال سنوارے۔

"سنو، مجھ سے دوستی کرو گی۔" اس کی اس درجہ اپنائیت پر ماہین حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی تھی۔



بڑی ممانی بیسن کے لڈو بنا رہی تھیں، وہ بھی سب سے چھپ کر صرف رتو کو راز دار بنایا تھا، وہ بھی صرف اس لیے کہ اس سے ڈھیروں ڈھیر کام لینا تھا۔ اسی لیے پہلے اسے نچلے پورشن میں بھجوا کر معلوم کروایا تھا کہ اس وقت کون کون گھر میں موجود ہے۔ کون موجود نہیں ہے۔ کتنے لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ فرما رہے ہیں اور کتنے منحوس ہیں جو جاگ رہے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث وہ حال ہی میں اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئی تھیں جواباً رتو نے آ کر بتایا تھا۔

"ایک منحوس کے سوا باقی سب سو رہے ہیں۔ نکی بوا گھر کی نگرانی کے لیے ڈیوڑھی میں بیٹھی ہیں مگر اونگھ رہی ہیں۔ چھوٹی صاحبہ کا پتا ہی نہیں چلا، سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔ یوں تو پورا کمرا ان کے خراٹوں سے گونج رہا تھا مگر جونہی میں نے پاؤں کمرے میں رکھا، فوراً سر اٹھا کر پوچھنے لگیں۔ "مسئلہ کیا ہے؟"

"مطلب تو یہ ہی ہوا ناں کہ اس وقت یہاں کسی کے آنے کا خطرہ نہیں۔ چلو تم جلدی سے کام شروع کرو، ہو سکتا ہے، آج شام کو محبت آ جائے۔۔۔ بیسن کے لڈو اسے بہت پسند ہیں۔" ممانی کے کہنے پر رتو فوراً ہی بیسن نکالنے لگی تھی۔

پھر سارا کام راز داری سے ہی ہوا تھا اور اس راز داری کے عوض رتو کو ایک نہ دو پورے تین لڈو ملے تھے وہ شکریہ کہتی نیچے چلی آئی۔ مزے لے لے کر لڈو کھاتے ہوئے وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر چکراتی رہی مگر جونہی ماہین آنکھیں مسلتی اپنے کمرے سے باہر نکلی وہ اس کے پاس بھاگی چلی آئی۔

"اے ایک مزے کی بات بتاؤں؟"

"ہاں بتاؤ"

''اچھا وعدہ کرو کہ بعد میں تم میری ایک بات مانو گی۔''
''ہاں مانوں گی۔'' ماہین نے بڑے آرام سے وعدہ کر لیا۔ رتو اسے یونہی اپنی راہ پر چلا لیا کرتی تھی۔
''اچھا پھر اوپر جاؤ، بڑی صاحبہ بیسن کے لڈو بانٹ رہی ہیں۔'' اس نے ماہین کے کان میں سرگوشی کی۔
''ہیں واقعی؟'' ماہین کی آنکھیں چمکیں اور اگلے ہی پل وہ بڑی ممانی کے روبرو تھی۔
''بڑی ممانی! ہمیں بھی لڈو دیجئے ناں۔'' اس کے بھرپور مطالبے پر بڑی ممانی نے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس کے سر پہ سینگ اگ آئے ہوں۔
''جلدی دیں ناں۔ اتنی بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ پاؤں پٹخ کر بولی تھی۔ ممانی کو یقین تھا۔ نہیں دیں گی تو یہ آفت کی پرکالہ آسمان سر پہ اٹھا لے گی۔ وہ دانت پیستی دل ہی دل میں رتو کو کوستی اٹھیں اور دو لڈو اس کے ہاتھ میں تھما کر چلتا کیا۔
''اب اِدھر ہی بیٹھ کر کھا لو۔ سارے زمانے کو مت خبر کرتی پھرنا۔'' انہوں نے تاکید کی مگر وہ سنی اَن سنی کرتی نیچے چلی آئی۔ بڑی ممانی آرام کی خاطر کچھ دیر کے لیے لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد ماہین دوبارہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔
''چھوٹی ممانی کہہ رہی ہیں، اوپر ہی اوپر لڈو بنا کر کھا لیے۔ ہمیں بھی تو چکھایئے کیسے بنے ہیں؟''
''ہائیں! انہیں کیسے خبر ہوئی؟'' ممانی تڑپ اٹھی تھیں۔
''میں کیا جانوں؟'' اس نے حد درجہ معصومیت سے کندھے اچکائے، اب کیا بتاتی کہ اسے تو رتو نے سکھا پڑھا کر بھیجا تھا۔ یوں نہ کہنا یوں کہنا۔
''ارے پتا کیسے چلنا تھا۔ ہماری دیورانی صاحبہ کی ناک ہی بہت تیز ہے۔ خوشبو سونگھ لی ہو گی۔ خود تو کبھی اتنی زحمت کی نہیں کہ اپنے ہاتھ سے کوئی سوغات بنا لیں۔ بس دوسروں کے ہاتھ کے کھانے کی عادت پڑ چکی ہے۔'' بڑی ممانی نے حسبِ توفیق دل کی بھڑاس نکالی اور پھر چند لڈو پلیٹ میں رکھ کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔
''کہہ دینا، تھوڑے سے بنائے تھے، ختم ہو گئے۔'' وہ تابعداری سے پلیٹ لے کر نیچے اتر آئی۔
آخری سیڑھی پر رتو نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی تھی۔
''شاباش ماہین! تم تو بڑے کام کی نکلیں۔'' رتو نے خوش ہو کر ایک اور لڈو اسے دیا اور خود کچن میں چلی گئی۔ ماہین نے ذرا سا کھایا۔ پھر دل بھر گیا تو باقی لڈو منڈیر پہ بیٹھے کوے کو ڈالا اور خود ہاتھ جھاڑتی ہوئی چاند بھیا کے کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی غالباً پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگے تھے۔ ذرا سا کھٹکا ہوا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ سینے پہ دھری کتاب پھسل کر نیچے جا گری، ماہین کھلکھلا کر ہنسی تو وہ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کتاب اٹھانے لگے۔
''کیا کرتی ہو ماہین؟ ابھی تو میری آنکھ لگی تھی۔'' انہوں نے لمبی جمائی لی۔
''تم غالباً خود بھی نہیں سوئیں، ہے ناں؟'' انہوں نے استفسار کیا۔ تو وہ اچک کر کھڑکی پہ بیٹھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''نہیں بھئی۔۔۔ میں نہیں سوئی، ہماری ٹیچر کہتی ہیں جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔''
''کھوتا۔۔۔'' چاند بھیا اس کے تلفظ پر ہی غور کرتے رہ گئے۔
''ہاں جسے پنجابی میں گدھا کہتے ہیں۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تھا جواباً چاند بھیا کھل کر مسکرا دیے تھے۔
''اری بیوقوف! اس سے مراد کھونا ہے کسی چیز سے محروم رہنا۔'' انہوں نے وضاحت کی۔
''اوہ جیسے آپ نے بیسن کے لڈو کھو دیے۔ ہے ناں؟'' وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھی۔
''بیسن کے لڈو۔۔۔؟''
''ہاں بھئی، بڑی ممانی نے بنائے ہیں۔''
''کیسے بنے ہیں۔۔۔؟'' یقیناً مزے کے ہوں گے۔'' چاند بھیا کے منہ میں سچ مچ پانی بھر آیا۔ سردی کا موسم ہو یا گرمی کا وہ موسم کی ہر سوغات سے محروم ہی رہتے تھے۔
''ہاں مزے کے تھے، آپ نے کھانے ہیں، لے کر آؤں؟'' ماہین کے پوچھنے پر انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن ماہین جھٹ سے کھڑکی سے نیچے اتر آئی تھی۔
''میں ابھی لے کر آتی ہوں آپ کے لیے'' وہ ان کے روکنے کے باوجود بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن ممانی کے پاس پہنچی تو انہوں نے جواباً زبردست قسم کی جھاڑ پلا دی۔
''ارے دیسی گھی میں بنائے ہیں اپنے محبت کے لیے، اندر بیسیوں میوہ جات ڈالے ہیں۔ اب کیا ہر ایرے غیرے نٹ پونجیے پر لٹاتی پھروں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے اور ہر وقت اس بدبخت کے کمرے میں مت گھسی رہا کرو۔''
''بدبخت کہاں بڑی ممانی! وہ تو میرے بھیا ہیں۔'' وہ ان کی ڈانٹ سے خائف ہو کر منمنائی۔
''ارے سگے بھتیوں کی کوئی کمی ہے تمہیں جو ادھر ادھر بھیّے بناتی پھرتی ہو۔ لو بھئی، ہمارے بچوں نے تو کبھی اس کو منہ نہیں لگایا اور یہ چلی ہیں انہیں بھیا بنانے۔'' بڑی ممانی کے تیور جارحانہ تھے، وہ آنکھوں میں آنسو بھرے واپس بھاگ آئی۔
''خوامخواہ باتیں بناتی ہیں، بھلا ان جیسا کوئی دوسرا بھیا ہے اس گھر میں نہ کوئی کہانی سنانے والا نہ کوئی ٹافیاں لا کر دینے والا۔'' وہ بڑبڑاتی رہی۔ چاند بھیا کے پاس خالی ہاتھ جاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ صحن میں آ کر اس جگہ کو دیکھا جہاں کوے کے لیے بیسن کا لڈو پھینکا تھا۔ وہاں کسی چیز کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔
''خوامخواہ کوے کو لڈو کھلا دیا۔ اگر پہلے خیال آ جاتا تو چاند بھیا کے لیے رکھ چھوڑتی۔'' وہ بائیں باغ میں آ کر چاند بھیا کے کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے آ بیٹھی، نجانے کتنی دیر تک وہاں بیٹھی بڑبڑاتی رہی تب ہی چاند بھیا نے کھڑکی سے جھک کر اسے دیکھا اور بصد اصرار اسے کمرے میں بلوایا۔
''بڑی ممانی نے لڈو دیے ہی نہیں۔'' اس نے جھکے سر کے ساتھ بتایا۔
''ارے تو اس میں اتنا فکرمند ہونے کی کیا بات ہے۔ لڈو تو مجھے مل گئے۔''
''ہائیں مل گئے مگر کیسے؟'' ''کس نے دیے۔'' وہ خوشگوار سی حیرت کے ساتھ چاند بھیا کو دیکھنے لگی۔ ان کے چہرے پہ خوشی کا محسوس کیے جانے والا تاثر ابھر رہا تھا۔

''بس ہے کوئی ہمارا ہمدرد جو ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ تم نے تو کوے کو کھلا دیا ناں ہمارے حصے کا لڈو۔'' انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

''تو کیا میں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔۔۔ اتنی ڈانٹ کھائی میں نے بڑی ممانی سے آپ کے واسطے۔'' وہ روہانسی ہوگئی تو چاند بھیا فوراً اسے تسلی دینے لگ گئے۔

''ارے میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ تم تو میرا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہو۔''

''تو پھر بتائیے، ناں لڈو کس نے دیے آپ کو۔''

''گڑیا! اگر رازداری کا وعدہ نہ ہوتا تو ہم تم کو ضرور بتا دیتے۔ لڈوؤں کا بھی صرف اس لیے بتا دیا کہ تم میرے لیے فکرمند بیٹھی تھیں۔ لیکن وعدہ کرو۔ اب آگے تم کسی سے نہیں کہو گی ورنہ میری تو شامت آجائے گی۔''

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔



شام کو اپنا ہوم ورک ختم کرنے کے بعد وہ باہر نکلی ہی تھی جب ٹھک سے کوئی چیز آکر اس کے سر پہ لگی۔

'ہائے اللہ!' وہ بری طرح خوفزدہ ہو کر چلائی اور پھر بے اختیار ہی سر اٹھا کر اوپر دیکھا، وہ محب تھا۔ دانت نکالتا منہ چڑاتا ہوا غالباً آج ہی ہاسٹل سے واپس آیا تھا ماہین کو ہمہ وقت منہ پھاڑ کر ہنسنے اور وقت بے وقت کھانے والا اپنا یہ کزن بہت برا لگتا تھا۔ وہ اس سے محض دو جماعتیں آگے تھا مگر رعب اتنا جماتا تھا کہ وہ بری طرح خار کھانے لگی تھی اس سے۔ اس کی ان ہی بے تکی حرکات سے تنگ آکر اسے سدھارنے کے لیے ہی بڑے ماموں نے اسے ہاسٹل میں بھجوایا تھا مگر لگتا تھا کہ ہاسٹل بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ وہ جوں کا توں ویسا ہی تھا۔ اب بھی گاجر کھاتے کھاتے اس کے سر پہ دے ماری تھی۔ وہ غصے سے سر جھٹکتی کچن میں رتو کے پاس آگئی۔ نکی بوا مٹر کے دانے نکال رہی تھیں۔ رتو پیاز کاٹ رہی تھی اور دونوں کے بیچ مکالمہ حسبِ معمول جاری تھا۔

''اے بدھو! یہ پیاز اس طرح سے کاٹتے ہیں۔'' نکی بوا کو رتو کا ہر کام ناپسند تھا۔

''ہاں تو اور کس طرح کاٹتے ہیں، سر نیچے ٹانگیں اوپر کر کے۔'' رتو کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ ماہین نے برابر اس کا ساتھ دیا تھا۔

''ادھر لا۔۔۔ میں خود کاٹ لیتی ہوں۔۔۔ تو جا کے برتن دھولے۔''

''لو میں کیوں دھوؤں۔۔۔ صبح میں نے دھوئے تھے۔۔۔ اب تمہاری باری ہے۔''

''آئے ہائے۔ شرم نہیں آتی کیا بوڑھی نانی سے مقابلہ کرتی ہو۔'' نکی بوا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''بوڑھی نانی بھی تو مقابلے کے لیے ہر دو منٹ بعد باورچی خانے میں بھاگی آتی ہے۔ اتنی بار تو کہا ہے۔۔۔ سب کچھ مجھ پہ چھوڑ دو۔ کرلوں گی سب کھانا تیار۔۔۔'' رتو بھی جھنجھلائی ہوئی تھی۔

''اے۔۔۔ دیکھ، دیکھ ذرا کیسے بکری کی طرح چرتی ہے۔'' رتو نے مٹر کے دانے اٹھا کر پھانکے تو

نکی بوا نے زوردار چپت اس کے ہاتھ پہ دے ماری۔ رتو نے پہلے ہی کہتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچا، غصے سے نکی بوا کو گھورا اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''شکر کرو، بکری کی طرح چرتی ہوں۔ اونٹ کی طرح چرنے لگی تو تم کو بھی نگل جاؤں گی نکی بوا! وہ بھی سالم۔''

''چل ہٹ مردودنی نہ ہو تو دفع ہو جا یہاں سے۔ میں خود کرلوں گی سب کام۔'' نکی بوا کفگیر لے کر اس کی طرف لپکیں تو وہ جھٹ ماہین کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جاتی ہوں، جاتی ہوں لیکن رات کو ہڈیاں تھک کر چور ہوگئیں تو مجھ سے مت کہنا دبانے کو ہاں۔''

اس نے مٹھی میں پکڑے مٹر کے دانے پھانکتے ہوئے کہا اور باورچی خانے سے باہر آگئی۔ پیچھے نکی بوا بڑبڑاتی رہ گئی تھیں۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر صحن میں آئیں تو محب ممانی کی گود میں سر رکھے چارپائی پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ قریب سے گزرنے لگیں تو محب نے فوراً اپنی ٹانگ سامنے کر دی۔ ماہین گرتے گرتے بچی۔

''کیا تکلیف ہے تم کو؟'' وہ غصے سے بولی۔

''کوئی تکلیف نہیں۔'' وہ بڑے آرام سے کہتے ہوئے کروٹ بدل گیا۔ پھر رات تک یہ ہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل تک آرہی تھی جب اس نے دوبارہ یہی حرکت کی۔ وہ اتفاقاً ہی ایک بار پھر گرنے سے بچ گئی تھی اور اگر بڑی ممانی وہاں موجود نہ ہوتیں تو شاید ماہین ان کے لاڈلے سپوت کو مزا چکھا دیتی۔ ڈائننگ ٹیبل تک آکر وہ بیٹھنے ہی والی تھی جب اس نے اچانک پیچھے سے کرسی اپنی طرف گھسیٹ لی۔ اب کی دفعہ بچاؤ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ وہ دھڑام سے گری تو ہر فرد اپنی جگہ چونک گیا تھا۔ تکلیف سے زیادہ شرمندگی نے اسے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور وہ تھا کہ ڈھیٹ بنا اسے اٹھانے کو سب سے پہلے بھاگا چلا آیا تھا۔

''معاف کرنا بھئی مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اس کرسی پر بیٹھنے والی ہو۔''

''جھوٹ مت بولو، تم نے جان بوجھ کر۔'' وہ روتے روتے چلائی، بڑے ماموں نے محب کو ڈانٹنا چاہا مگر نجمہ خالہ نے فوراً ٹوک دیا۔

''اب خوامخواہ اسے پریشان مت کریں۔ کہہ تو دیا اس نے کہ وہ لاعلم تھا۔''

بڑے ماموں خاموش ہو رہے لیکن ماہین اٹھ کر باہر بھاگ آئی۔ اسے معلوم تھا اب وہ ''لمبو'' جان بوجھ کر کھانے کے دوران اسے چڑائے گا۔ رتو باورچی خانے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی وہ بھی آنسو پونچھتی اسی کے ساتھ کھانے بیٹھ گئی۔

''نکی بوا! اس چاند گرہن پہ بھی تھوڑا سا ترس کھالو، بے چارہ تیسری مرتبہ بھی کھنکھارتا ہوا یونہی لوٹ گیا ہے۔'' رتو نے مصروف سی نکی بوا کو ٹوکا۔

''ہاں، اس نواب زادے کو بٹھا دوں پہلے کھانے کو اور وہ جو سارا کنبہ میز پہ بیٹھا نکی بوا کی راہ تک رہا ہے۔'' نکی بوا نے اسے جھڑکا اور ٹرے میں ڈونگے رکھ کر ڈائننگ روم کی طرف لپکیں۔ رتو کندھے اچکا کر ماہین کے لیے سالن نکالنے لگی تھی۔ اور پھر جب تک محب یہاں رہا،

وہ اس کے سائے سے بھی بچتی رہی۔ ادھر وہ چھٹیاں گزار کر ہاسٹل کی طرف روانہ ہوا ادھر ماہین نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔



ماہین کا پانچویں کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا۔ کلاس میں اس کی دوسری پوزیشن تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اڑ کر گھر پہنچ جائے۔

''سب سے پہلے اماں کو بتاؤں گی پھر چاند بھیا کو اور پھر رتو کو، باقی گھر والوں کو اماں خود ہی بتا دیں گی۔''

وہ دل ہی دل میں منصوبہ بناتی رہی مگر جب گھر پہنچی تو وہاں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ نجمہ خالہ کی چیخ و پکار سن کر وہ ڈیوڑھی میں ہی دبک گئی تھی۔ بکھرے بال، وحشت زدہ چہرہ، منہ سے کف اڑاتے وہ صحن کے عین وسط میں کھڑی نجانے کیا کچھ بول رہی تھیں۔ ماہین تو ایک لفظ بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ غصے میں بولتے بولتے نجمہ خالہ نے چارپائی کے پاس پڑی چھوٹی سی میز بھی الٹ دی تھی۔ میز پہ پڑے چائے کے برتن اور جگ گلاس کرچیوں کی صورت پورے صحن میں بکھر گئے تھے۔ وہ تو خوفزدہ ہو کر نکی بوا کی گود میں چھپ گئی۔ چھوٹی ممانی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کمرے میں گھس گئیں۔ بڑی ممانی دونوں ہاتھوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔ اماں گاہے گاہے نجمہ خالہ کو پچکارتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نجمہ خالہ بکتی جھکتی اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ ماہین نکی بوا کی گود سے نکل کر اماں کے کندھے سے چپک گئی۔ تب ہی چھوٹی ممانی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

''اللہ میری توبہ، زبان ہے کہ قینچی۔ کیسی کتر کتر چلتی ہے۔ اے آپا تمہاری بہن ہے۔ ہو سکتا ہے، تمہیں برا لگے لیکن میں تو کہتی ہوں اس کا دماغ ٹھکانے نہیں۔ اچھا ہو گا کہ کسی نفسیات کے ڈاکٹر کو دکھا کر اس کا علاج معالجہ کروائیے۔ بھلا کوئی یوں بھی ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتا ہے، ذرا مزاج کے خلاف بات ہوئی اور محترمہ سارے ادب آداب بھول گئیں۔ اس یتیم کا خون الگ چوسے رکھتی ہیں۔''

چھوٹی ممانی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کو ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔

''اے بات کیا ہوئی اصل میں؟'' بڑی ممانی، نجمہ خالہ کی چیخ و پکار سن کر نیچے آئی تھیں، لہٰذا اصل بات سے لاعلم تھیں۔

''ارے بات کیا ہونی تھی۔۔۔ بھلائی کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں رہا۔ یہ اپنا چاند ہے ناں؟''

ماہین کو حیرت ہوئی۔ آج چھوٹی ممانی کو نجانے کیسے چاند میں اپنا پن نظر آ گیا تھا۔ تاہم وہ اپنے خیال کو جھٹکتی ہوئی دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''بے چارہ سارا دن بازار کی خاک چھان کر اناج کے تھیلے بھر بھر کے لایا تھا۔ ابھی سانس بھی نہ لے پایا ہو گا کہ ہماری نند کو یاد آیا کہ انہیں بازار سے کچھ کتابیں منگوانی ہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہو تو پوچھے کہ ابھی گھڑی بھر پہلے تو چاند سب سے پوچھ کر گیا تھا کہ اگر کسی کو بازار سے کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دے۔ اس وقت کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھی رہیں۔ خیر وہ کتابیں لینے بازار چل دیا۔ وہاں سے لوٹا تو سینڈل کی مرمت کروانے کو بھجوا دیا۔ وہ بیچارہ حکم کا غلام سینڈل کی مرمت بھی کروا کر لایا۔ اب خدا جانے اچھے بھلے کام میں کیا نقص نظر آیا کہ لے کے چاند کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ اتنی جھاڑ پلائی اس بے زبان کو کہ بس

کچھ نہ پوچھو۔ میری غلطی جو میں نے اس کی طرف داری میں دو جملے بول گئی۔ ارے وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئیں۔''

''ارے کنیز! تم نے بھی تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات کی تھی۔ جانتی تو ہو سارا معاملہ۔ مت ٹانگ اڑایا کرو اس کے کاموں میں۔'' بڑی ممانی نے نصیحت کی۔ اماں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

''بس کیا کروں، اس یتیم بے آسرا کی درگت بنتے دیکھ کر یونہی دل پسیج گیا۔ کیا معلوم تھا، قیامت کا رخ میری طرف ہو جائے گا۔'' چھوٹی ممانی نے گویا اپنے غلطی پر پچھتاتے ہوئے ہاتھ مسلے تھے۔

''اللہ بخشے! میاں جی زندہ تھے تو کسی کی زبان اتنی آزاد تھی نہ ہاتھ اب روکنے والا کون ہے۔ بھائی سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ ہم کچھ کہیں تو الٹا ہم ہی بدنام۔ میں تو بس ڈرتی ہوں، کبھی جو اس غریب کے دل سے نجمہ کے لیے آہ نکل گئی تو ساری عمر گئے وقتوں کو روئے گی۔ خدا ہی اسے ہدایت دے۔'' چھوٹی ممانی طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ماہین بھی چپکے سے وہاں سے اٹھ گئی۔ کچن میں جا کر رتو کو دیکھا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ چاند بھیا کے کمرے تک آئی تو ان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی بار بار کی دستک کے جواب میں بھی نہ کھلا۔ رزلٹ کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ شام تک گھر کی فضا یونہی مکدر رہی۔ نجمہ خالہ کسی طور کمرے سے باہر نکلنے پر رضا مند نہ تھیں۔



ماہین بڑی ممانی سے سوٹ سینا سیکھ رہی تھی۔ ابھی بھی وہ ان سے اپنا کرتا کٹوا کر دو، دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ اتفاقاً عین اسی وقت محبّ نے اوپر جانے کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا تھا۔ حسبِ معمول رگِ شرارت ابھری تو وہ تیزی سے دو سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا اور جونہی ماہین اس کے پاس آئی۔ اس کی ٹانگ فوراً حرکت میں آ گئی تھی۔ ماہین کے لیے یہ رکاوٹ انتہائی غیر متوقع تھی۔ وہ تیسری سیڑھی سے لڑکھڑائی تو سیدھی پکی اینٹوں کے فرش پہ جا گری۔ اگلے ہی لمحے سارا گھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ سیڑھیوں پہ کھڑے محبّ کا رنگ یک لخت ہی زرد ہو گیا تھا۔ ماہین کو سیڑھیوں سے لڑکھڑاتے اور گرتے دیکھ کر ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی اس حرکت کا نتیجہ کتنا خوفناک ہو سکتا ہے اور پھر وہی ہوا، ماہین بری طرح روتی اور چیختی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی تو ٹھوڑی پہ رکھا اس کا ہاتھ خون سے بھر چکا تھا۔ محبّ کا دل ایک لمحے کے لیے رک سا گیا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ تب ہی برآمدے میں کرسی پہ بیٹھے عبید بھیا اپنی کتابیں پھینکتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اس تک آئے تھے۔

''اوہ میرے خدا! ہاتھ پیچھے ہٹاؤ۔'' عبید بھیا نے سختی سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹا کر اپنا رومال اس کی ٹھوڑی پہ رکھ دیا تھا۔ لیکن اس دوران ایک لمحے میں محبّ گاڑھے سرخ خون کو ٹھوڑی سے بہہ کر گردن تک آتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ عبید بھیا روتی ہوئی ماہین کو ساتھ لیے عجلت میں ڈاکٹر کے پاس بھاگ گئے تھے۔ محبّ مرے مرے قدموں سے بقیہ سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ پچھتاوے کا شدید احساس اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ اب اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ یہ حرکتیں اسے زیب دیتیں یا وہ اس قسم کی حرکتوں کے خطرناک نتائج سے ناواقف ہوتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ماہین کے رستے میں ٹانگ اڑاتے ہوئے

اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ صورتِ حال اس قدر سنگین بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے تو وہ ہمیشہ ہی اپنے گھٹنے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی۔۔۔ ناراضی کا شدید اظہار کرتی یا پھر اسی پہ پل پڑتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا خود کو اس حرکت کے لیے لعنت ملامت کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد امی کو بھی خبر ہو گئی صرف چوٹ لگنے کی۔۔۔ کیسے لگی؟ یہ انہیں بھی نہیں پتا تھا کیونکہ عبید بھیا کو بھی اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ سیڑھیوں سے گری ہے اور جو گرنے کی وجہ سے باخبر تھی۔ وہ انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔

"ہائے ہائے۔ تین ٹانکے لگے ہیں بیچاری کے۔ رنگ بھی کیسا زرد پڑ گیا ہے۔"

بڑی ممانی کہہ رہی تھیں۔ وہ شرمندگی میں ڈوبا جا رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت ہی نہ پڑی تھی نیچے جا کر اس کی خیریت معلوم کرنے کی اور کچھ دن گزرنے کے بعد وہ یونہی چپکے سے ہاسٹل واپس چلا آیا تھا۔

اگلی دفعہ اس کی آمد ہوئی تو اس کے زخم پر کھرنڈ آ چکا تھا اور ناراضی بھی غائب تھی۔ وہ نارمل انداز میں اس سے بات کرتی رہی مگر اس کے اپنے دل میں ہی چور تھا کہ وہ اس سے نگاہ ملا کر بات نہیں کر سکا تھا۔ پھر زخم پر سے کھرنڈ بھی اتر گیا لیکن نشان مستقل رہ گیا جو اس کی صاف وشفاف رنگت پہ بدنما لگنے کے بجائے خوب صورت لگنے لگا تھا۔ کم از کم محبّ کو تو خوب صورت ہی لگتا تھا۔

اور پھر ایک دفعہ جب وہ اپنا ایف اے کا امتحان دے کر آیا تو وہ اس کے عین سامنے کھڑی اسے چڑا رہی تھی۔

"میٹرک میں میرا اے پلس آیا ہے۔ تم نے تو اے گریڈ لیا تھا ناں۔"

اور وہ جواب دینے کے بجائے اس کی ٹھوڑی پہ لگے نشان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا تھا وہ اسے بتائے۔ "یہ نشان مجھے بہت تنگ کرنے لگا ہے۔ میں چاند کو دیکھوں تو اس کے داغ مجھے اس داغ کی یاد دلا دیتے ہیں جو میری وجہ سے تمہارے چہرے پہ لگا اور یہ داغ اب میری رات کی گھور تاریکیوں میں آ کر چاند کی طرح ہی جگمگانے لگتا ہے اور میری آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔"

"اب خاموش کیوں ہو گئے؟" وہ اس کے مقابل کھڑی اسے چڑا رہی تھی۔ وہ بہت خاموشی سے آگے بڑھ کر اس کے نزدیک ہوا تھا اور ہاتھ بڑھا کر زخم کے اس نشان کو چھونے لگا تھا۔

"خدا کی قسم۔ اس نشان کو ساری عمر پوجوں گا میں۔" اس نے دل میں عہد کیا تھا۔

"کیا ہوا؟" ماہین کو اس کے گم صم سے انداز پر حیرت ہوئی۔

"آئی ایم سوری ماہین۔" اس نے ہاتھ ہٹا کر کہا تھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ ماہین نے ٹھوڑی پہ لگے نشان کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر حیرت سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔ وہ محبّ کے اس انداز کو کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔



آج صبح سے ہی بادلوں نے آسمان پہ ڈیرا جما رکھا تھا۔ ماہین کا ارادہ کالج سے چھٹی کا تھا۔ مگر بڑے ماموں اس معاملے میں کافی سختی کرتے تھے۔ اِدھر انہوں نے ذرا ڈپٹ کر بات کی، اُدھر وہ جھٹ پٹ تیار ہو کر عبید بھیا کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ یہ اور بات کہ کالج میں سارا دن بارش نہ ہونے کی دعائیں اس کے لبوں سے جاری ہوتی رہیں۔ بارش کے ساتھ بجلی کی کڑک کا تصور ہی اس کے اعصاب پر کوڑے

کی طرح لگتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے چھٹی ہوئی تو وہ کالج سے آتے ہی سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی اور پھر رتو کے لاکھ اکسانے پر بھی باہر نہیں نکلی، کھانا بھی وہیں منگوا کر کھایا اور پھر لیٹ گئی۔ رتو کچھ دیر تک اس کا سر کھاتی رہی۔ پھر اکتا گئی تو جھنجھلا کر اسی پہ پل پڑی۔

"اس سے تو اچھا ہے، کوئی گنبد بنا لو اور اس موسم میں قید ہو جایا کرو۔" رتو اس کی مسلسل جوابی مسکراہٹ سے چڑ کر باہر نکل گئی۔

اماں کسی کام سے کمرے میں آئیں تو وہ چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتری اور ان سے لپٹ گئی۔ لاکھ انہوں نے مصروفیت کا بہانا بنایا۔ پیار سے سمجھایا۔ گھُرکا بھی مگر وہ چھوڑنے کو تیار ہی نہ تھی۔ مجبوراً انہیں اس کے ساتھ لیٹنا ہی پڑا۔ جانے کیسا خوف سمایا تھا بچپن سے اس کے دل میں جو کسی صورت پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہیں لیٹے لیٹے وہ سو گئی تو اماں آہستگی سے اٹھ کر وہاں سے چلی آئیں۔ نکی بوا کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں باورچی خانے میں رتو کا ہاتھ بٹانا تھا۔

ماہین کمرے میں مزے سے کمبل اوڑھے سوتی رہی۔ باہر سبک خرام ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ بارش پہلے ہلکی ہلکی پھوار کی صورت برسی اور پھر آناً فاناً ہی آسمان سے زمین تک پانی کی ایک چادر سی تن گئی تھی۔

"رتو! ذرا جا کر ماہین کو تو اٹھا لا۔۔۔ لاؤنج میں آ کر سب کے ساتھ بیٹھ جائے ورنہ خوامخواہ ہی وہاں اکیلی ڈرتی رہے گی۔" اماں نے برتن صاف کرتی رتو کو تاکید کی تھی۔

"اچھا ابھی جاتی ہوں۔ بس یہ ایک دو پلیٹیں رہ گئی ہیں۔" رتو کو کام نمٹانے کی جلدی تھی۔۔۔ ذرا سی دیر میں وہ بھول بھی گئی کہ اماں نے اس سے کوئی کام کہا تھا۔



ٹھک کی زوردار آواز سے کھڑکی کھلی تو ماہین کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی۔ چند لمحوں کے لیے اسے سوچنا پڑا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ تب ہی کھلی کھڑکی سے سرد نم آلود ہوا کا جھونکا کمرے میں داخل ہوا تو وہ جھرجھری لیتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ سوئے سوئے اعصاب میں تحریک ہوئی تو بارش کا شور۔۔۔ بادلوں کی گھن گرج اس کے لاشعور میں ڈوبے بچپن کے کسی انتہائی خوفناک لمحے کو یکدم ہی اچھال کر شعور کی سطح پر پھینک گئی۔

"اماں۔" اس نے سرسراتی آواز کے ساتھ اماں کو پکارتے ہوئے چارپائی پہ اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔ ان کی غیر موجودگی کا احساس اسے لمحہ بھر میں پانچ سالہ ماہین میں بدل گیا تھا۔ تاریک کمرا اسے ایک اندھیری قبر کی مانند لگ رہا تھا۔

"اماں" وہ برق رفتاری سے چارپائی سے اتر کر برابر والی چارپائی پہ ہاتھ مارنے لگی۔ اچانک نیند سے اٹھنے اور کمرے میں گھپ اندھیرے کے باعث وہ نہ سمت کا تعین کر پا رہی تھی نہ مقام کا۔ اسے لگا وہ واقعی ایک گنبد میں قید ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

"اف میں مر جاؤں گی۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے۔" اسے اپنی آواز حد درجہ اجنبی محسوس ہوئی تھی۔ لمبے لمبے سانس لیتی وہ دروازے کی تلاش میں اندھا دھند آگے بڑھی تو ایک سپاٹ دیوار سے ٹکرا گئی۔ وہاں سے پلٹی تو پاؤں غالباً میز کے پائے سے ٹکرا گیا۔ درد کی ایک شدید لہر پاؤں کے انگوٹھے سے ہو کر جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ منہ سے نکلنے والی بے اختیار کراہ نے اسے روہانسا کر دیا تھا۔ یونہی دیواروں کو ٹٹولتے ہوئے اچانک اس کا ہاتھ دروازے سے ٹکرایا تو ایک لمحے کی بھی دیر کیے بغیر وہ جھٹکے سے دروازہ

کھول کر باہر نکل آئی تھی۔

''اماں! رتو!'' اس نے برآمدے میں آتے ہوئے زور سے پکارا۔ لاؤنج کے دروازے سے روشنی کی ننھی منی کرنیں باہر نکل رہی تھیں وہ خود کو تسلی دیتی تیزی سے آگے بڑھی۔ برآمدے میں آنے والی بارش کی بوچھاڑ نے اسے ایک منٹ میں بھگو دیا تھا۔ تب ہی دور کہیں بجلی کڑکی تھی۔ وہ سرتاپا کانپی تو پاؤں خود بخود ہی گیلے چکنے فرش سے پھسل گیا۔

''آہ۔'' ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس نے بے اختیار ہی ستون کو تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔

''کون۔۔۔؟ کون ہے ادھر۔۔۔؟'' کوئی اس کے آس پاس ہی بولا تھا۔ پھر برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے کی آواز آئی۔ آنے والا بارش سے بچنے کی خاطر بہت عجلت میں قدم اٹھا رہا تھا۔

''کون ہے بھئی یہاں؟'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف آیا۔ ماہین اسے پہچان چکی تھی۔

''محب! میں۔''

''کون ماہین۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ حیرت زدہ سا اس کے نزدیک آیا تو ماہین نے فوراً ہی اُس کا بازو دبوچ لیا۔

''وہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔'' ماہین کو احساس ہوا کہ اس کی آواز اور جسم دونوں بری طرح لرز رہے تھے۔

''دشش۔۔۔ شاید لائیٹ نہیں ہے۔۔۔ بہت اندھیرا ہو رہا تھا۔'' اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔

''نہیں۔ لائیٹ تو ہے لیکن برآمدے میں لائیٹ جلانے کی کسی نے زحمت نہیں کی ہوگی۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا تھا پھر اندازے سے ہی دیوار پر سوئچ بورڈ کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس نے دو چار بٹن اکٹھے ہی دبا دیے۔ برآمدے میں ایک تیز روشنی پھیل گئی تھی۔

ماہین کی جان میں جان آئی تب ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس نہ دوپٹہ تھا نہ پیروں میں چپل۔ عام سادہ سے سوٹ میں وہ اب ڈر، خوف سے زیادہ ہوا کے سرد جھونکوں سے کانپ رہی تھی۔

''تمہارے کمرے میں لائیٹ تو ہے ناں؟ شام کو ہی جلا لیا کرو۔'' وہ اس کی حالت پر توجہ دیے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''بھئی کہاں ہے سوئچ بورڈ، مجھے تو نہیں مل رہا۔'' وہ ایک دیوار پر اندازاً ہاتھ مارنے کے بعد اس کی طرف پلٹا تو اس نے آگے بڑھ کر لائیٹ آن کر دی تھی۔

''تھینک گاڈ۔ تھوڑی روشنی تو ہوئی ورنہ تمہارا کمرا تو اندھیرے غار کا منظر پیش کر رہا تھا۔'' وہ پلٹ کر عین وسط میں کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔

''محب رکو! جانا نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی لاؤنج تک چلتی ہوں۔''

وہ اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ جلدی سے اپنی چارپائی سے دوپٹہ اٹھا کر کندھے پہ رکھا پھر چارپائی کے نیچے سے چپل نکال کر عجلت میں پہننے لگی تو پیر کے انگوٹھے کا ٹوٹا ہوا ناخن چپل میں پھنس کر مزید ادھڑ گیا۔ بے اختیار ہی ایک ہلکی سی سسکاری لے کر اس نے پیر واپس کھینچ لیا تھا۔

''میں ابھی یہیں کھڑا ہوا ہوں۔ بھئی تم آرام سے۔ ارے۔۔۔'' وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف آیا اور پھر انگوٹھے کے ناخن سے رستا خون دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹھک سا گیا اور وہ خوامخواہ اتنا شرمندہ

ہوئی کہ جھک کر دوپٹے کے کونے سے ہی انگوٹھے کو دبا دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' محب نے حیرت سے پہلے اس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روکتے ہوئے دوپٹے کو زخم سے ہٹا دیا۔

''اس کو ڈیٹول سے صاف کر کے اس پر پٹی باندھ لو۔ آخر کیوں اتنا گھبرا رہی ہو۔ پہلے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا مگر اب تو اندھیرا نہیں ہے بلکہ یہ لو، میں یہیں بیٹھا ہوں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ تمہیں تنہا اس غار میں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔'' وہ آرام سے چارپائی پہ دراز ہو گیا تھا۔

ماہین خاموشی سے پلٹ کر کپکپاتے ہاتھوں سے سنی پلاسٹ نکالنے لگی۔ اب اسے کیا بتاتی کہ ڈر اور خوف تو اسے دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب تو بس شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔ وہ جانتی تھی، صبح یہ محب جب شرافت کا لبادہ اتار پھینکے گا تو اس کی اس کمزوری پر اس کا کس قدر مذاق بنائے گا اور بنوائے گا۔

وہ ابھی اپنے کام سے فارغ ہوئی ہی تھی جب رتو آدھمکی۔

''لو جی۔ تم تو بہت آرام سے بیٹھی ہو۔ وہاں تمہاری اماں نہ صرف خود ہول رہی تھیں بلکہ مجھے بھی ہولائے دے رہی تھیں۔ ماہین اندھیرے سے ڈرتی ہے۔ بجلی سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ بارش سے گھبرا جاتی ہے اور اگر مجھے پتا ہوتا محب صاحب ادھر بیٹھے ہیں تو سچی بھئی، میں نے آرام سے وہاں ڈراما دیکھنے بیٹھ جانا تھا۔''

''تو دیکھ لیتیں ناں ڈراما۔۔۔ کس نے بلایا تھا تمہیں جو یوں بھاگی چلی آئی ہو؟ کوئی مرے یا جیے تمہاری بلا سے۔'' اسے اپنی شرمندگی مٹانے کا اور کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا تو رتو پر ہی ٹوٹ پڑی۔ وہ بے چاری ہکا بکا سی اس کا منہ دیکھے گئی۔ جبکہ محب بے اختیار ہنس دیا تھا۔

''اچھا بھئی رتو! اب تم آ گئی ہو تو میں چلتا ہوں۔''

''ارے بیٹھو ناں؟'' رتو نے اسے اٹھتا دیکھ کر فوراً کہا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں۔ گرم گرم بستر چھوڑ کر آیا ہوں اور ہاں۔۔۔'' وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔

''اب اسے تنہا چھوڑ کر مت جانا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار میرا دل درست سگنل ہی دے۔'' وہ معنی خیز انداز میں کہتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

رتو نے الجھن آمیز نگاہوں سے ماہین کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں۔ اس کی تو عادت ہے خوامخواہ بولنے کی۔ تم بتاؤ! اماں کہاں ہیں۔'' اس نے جان بوجھ کر بات بدل دی کہ محب کے بدلتے تیوروں نے خود اسے بھی الجھا کے رکھ دیا تھا۔

''بھئی ظاہر ہے، اس برستی بارش میں رات کے وقت وہ کہاں ہو سکتی ہیں، لاؤنج میں ہوں گی یا کچن میں۔ ویسے جب میں یہاں آئی تو بڑی صاحبہ انہیں اپنے کمرے میں بلا رہی تھیں۔'' رتو نے وضاحت کی تب ہی زوردار طریقے سے بجلی کڑکی تھی۔ ماہین ہلکا سا کپکپا کر فوراً ہی رتو کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''سنو، دروازے پر دستک ہو رہی ہے کیا؟'' رتو نے اچانک ہی کہا تو وہ بھی سن گن لینے لگی۔

''نہیں بھئی، وہم ہے تمہارا۔ اس بارش میں بھلا کون دستک دے گا۔'' ماہین نے اسے جھٹلانا چاہا مگر وہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں جا کر۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور اس کو روکنے کی ماہین کوشش بھی نہ کر سکی۔

"کتنی بے وقوف ہے۔ گھر کے کسی مرد کو کہنے کے بجائے خود چل دی ہے۔" وہ کھلی کھڑکی سے رتو کو بارش میں بھاگ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ واپس لوٹی تو ایک اور ہیولا سا اس کے ساتھ تھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" اس نے تعجب سے تاریک صحن میں رتو کے برابر آتے اس سائے کو دیکھ کر سوچا۔

"ارے چاند بھیا۔" برآمدے کی زرد روشنی میں وہ بھیگا سراپا واضح ہوا تو وہ چارپائی سے اتر کر احتیاط سے چپل پہنتے ہوئے باہر کی طرف لپکی۔

"آپ اس موسلا دھار بارش میں کہاں سے آ رہے ہیں؟"

چاند بھیا نے گیلے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکتے ہوئے ایک دم رک کر اس کو دیکھا۔

"کسی کام سے گیا تھا۔"

"ایسا کون سا کام تھا جو صبح نہیں ہو سکتا تھا۔" ہوا کے جھونکے پر اس نے کپکپی لیتے ہوئے دونوں بازوؤں کو سینے پر لپیٹا۔

"نجمہ خالہ نے اپنی دوست سے قمیص کا کوئی نیا ڈیزائن منگوانا تھا۔" انہوں نے مختصراً بتایا۔

"پھر لے آئے۔۔۔؟" ماہین نے ان کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

"ان کی دوست گھر پہ نہیں تھیں۔" چاند بھیا نے قمیص کا دامن نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"پتا نہیں۔ نجمہ خالہ کی یادداشت کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ خالہ کی یہ دوست ابھی کل ہی تو ان سے ملنے آئی تھی اور بتا کر گئی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جا رہی ہے۔" رتو کا لہجہ کسی حد تک طنزیہ تھا۔

"ارے نجمہ خالہ! کبھی تو بے چارے چاند بھیا پر رحم کھا لیا کریں۔ معلوم نہیں انہیں ایذا پہنچانے سے کون سی تسکین ملتی ہے آپ کو۔" ماہین ان دونوں کے سامنے نجمہ خالہ کو برا بھلا تو نہیں کہہ سکتی تھی بس دل ہی دل میں ان کی بے حسی پر تاؤ کھا کر رہ گئی تھی۔

"چاند بھیا! آپ کوئی سواری ہی لے لیتے۔" وہ ان کی ہمدردی میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"اس بارش میں سواری کہاں سے ملتی۔ ویسے ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔" چاند بھیا نے اسے متفکر دیکھ کر جھوٹی تسلی دی ورنہ وہ دیکھ تو رہی تھی کہ چاند بھیا بری طرح بھیگ گئے تھے اور اب بار بار سردی کی وجہ سے جھرجھریاں لے رہے تھے۔

"رتو! تم کھڑی کیوں ہو؟ جا کر کھانا گرم کر دو ناں چاند بھیا کے لیے اور چائے بھی بناؤ۔" وہ رتو کی طرف پلٹی مگر جواباً رتو نے ڈھیٹ بن کر صاف انکار کر دیا۔

"ہم سے نہیں بار بار کھانا گرم کیا جاتا جسے کھانا ہو وقت پر آ کے کھایا کرے ورنہ جیسا تیسا بھی ہو، کھا پی کر سو رہے رہ گئی چائے تو وہ اسی وقت بنے گی جب سب گھر والوں نے پینی ہوگی، تب انہیں بھی مل جائے گی۔"

"اف کتنی بدتمیز ہو تم رتو۔" اسے سچ مچ رتو کا جواب بہت برا لگا تھا۔ چاند بھیا نجانے کیسے مروت

میں آ کر مسکرا دیے تھے۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ایسی خاطریں ہم سے نہیں کی جاتیں۔ آپ کو زیادہ ہمدردی ہے تو جائیے کچن میں ہم نے روکا تھوڑی ہے۔" وہ بڑے مہذب انداز میں بدتمیزی کرتے ہوئے چلی تو سیدھا لاؤنج میں جا کر ہی دم لیا۔

"اس کا بھی کوئی علاج نہیں۔ خیر آپ تو جا کر جلدی سے کپڑے بدل لیں۔ اس بری طرح بھیگ گئے ہیں۔ ٹھنڈ لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ میں جا کر رتو کو دیکھتی ہوں۔ وہ کھانا آپ کے کمرے میں ہی دے جائے گی۔" اس کے متفکر لہجے پر وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھے تو وہ بھی تیز قدم اٹھاتی کچن کی طرف آ گئی۔



صبح اٹھتے ہی اسے عجیب و غریب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی کے دن عموماً تگڑا سا ناشتا تیار کیا جاتا تھا۔ کبھی حلوہ پوری، کبھی نان چنے، کبھی کباب پراٹھے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہر فرد اپنی پسند کا ناشتا کرتا تھا۔ لہٰذا کچن میں صبح سے ہی گہما گہمی اور ہلچل سی مچ جایا کرتی تھی۔ کھانے والے تو اپنے وقت پر ہی اٹھتے مگر بنانے والے ان گھڑیوں میں بہت مستعد نظر آیا کرتے تھے۔ مگر آج نہ تو نکی بوا کی ڈانٹ ڈپٹ سنائی دے رہی تھی نہ رتو کے جوابی حملے تھے اور تو اور چاند بھیا بھی منظر سے غائب تھے جو اس وقت عموماً ناشتے کا سامان لاتے، پودوں کی کاٹ چھانٹ کرتے اور کیاریوں کو پانی دینے میں مصروف نظر آیا کرتے۔

اس نے حیران ہوتے ہوئے باورچی خانے میں جھانکا۔ رتو گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے سکڑی بیٹھی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم۔ اس نے دو مرتبہ پکارا تب اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔

"خیریت؟" اس نے خاصی تشویش سے رتو کی حد درجہ فراغت کو دیکھا۔

"ہاں خیرت ہی خیریت۔"

"نکی بوا؟"

"ناشتے کا سامان لینے گئی ہیں۔" رتو نے بتایا تو وہ حیران حیران سی اس کے سامنے آ بیٹھی۔

"کیوں بھئی، وہ چاند بھیا کہاں گئے؟" ماہین عرصہ دراز سے چاند بھیا کو بلا ناغہ یہ فریضہ سرانجام دیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"انہوں نے کہاں جانا تھا۔ بس گرہن لگ گیا انہیں۔" رتو ذرا سا ہنسی۔

"مطلب۔۔۔؟"

"مطلب یہ کہ انہیں بخار ہو گیا ہے۔" رتو نے بتایا تو وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"تو گویا رات کو بارش میں بھیگنا اپنا اثر دکھا گیا۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی ہوئی اٹھ کر چاند بھیا کے کمرے کی طرف آ گئی۔

"ارے چاند بھیا! یہ کیا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں؟" وہ بلند آواز میں کہتی ہوئی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ چاند بھیا اس کی آواز سن کر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ماہین نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر انہیں لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ بخار خاصا تیز لگ رہا تھا۔ تپا تپا سا چہرہ اور تیز ہوتی

ہوئی سانسیں، چاند بھیا آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے تھرمامیٹر اٹھا لائی۔
''کوئی دوا لی ہے کیا؟'' بخار چیک کرنے کے بعد اس نے پوچھا تو جواب حسبِ توقع نفی میں ملا تھا۔
''کوئی بات نہیں۔ میں ناشتا بھجواتی ہوں اور بخار کی گولیاں بھی کھا لیجئے گا۔ دو منٹ میں ٹھیک ہو جائیں گے۔''
وہ کہتی ہوئی باہر آ گئی۔ صحن میں چہل قدمی کرتی نجمہ خالہ نے حد درجہ ناگواری سے اسے چاند بھیا کے کمرے سے نکلتے دیکھا اور ٹھٹھک کر رک گئیں۔ ماہین نے جان بوجھ کر چاند بھیا کی خرابی طبیعت کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا مگر وہ توجہ دیے بغیر کیاریوں کا جائزہ لینے لگی تھیں۔ ماہین نے رتو کو چاند بھیا کے لیے ناشتا بنانے کی آواز لگائی تب نجمہ خالہ نے جھٹ اسے ٹوک دیا۔
''پہلے میرے لیے ناشتا بنا لینے دو پھر جس کی دل چاہے خاطریں کرتی رہنا۔'' دلیے کی طرف ہاتھ بڑھاتی رتو پلٹ کر ایک بار پھر آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنے لگی تھی۔
ماہین کو ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔
''جی ہاں! پہلے انہیں ناشتا بنا دو۔ ان کی ٹرین چھوٹ رہی ہے۔ پتا نہیں کیسا پتھر دل ہے خالہ آپ کا۔ کوئی مرتے مر جائے مگر آپ کے معمولات میں فرق نہ آئے۔''
''شٹ اپ! زیادہ بات کی تو میں منہ توڑ دوں گی تمہارا۔'' نجمہ خالہ کی سرد آواز پر وہ خود بخود خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا یونہی جھنجلاتی ہوئی دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سامنے سے محبّ دو، دو چار، چار سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آ رہا تھا۔
''کدھر کے ارادے ہیں بھئی؟ اوپر ای تو اٹھنے پر آمادہ نہیں۔ لہٰذا وہاں جانا بے کار ہے۔''
اس نے سیڑھی پر اس کے برابر آتے ہوئے انگلی موڑ کر زبردست ٹھونگا اس کے سر پہ لگایا اور پھر قہقہہ لگا کر نیچے اتر گیا۔ بے وقت کی ہنسی۔۔۔ اس نے چڑ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر خیال آیا وہ بھی مقابلے پر اتر آیا تو رات کے واقعہ کی خوامخواہ ہی تشہیر کرتا پھرے گا۔ لہٰذا خاموشی ہی بہتر تھی۔ وہ وہیں سے پلٹ کر کچن میں آ گئی۔
جلد ناشتے کے شوقین عبید بھیا، محبّ اور اسد ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ زین آج کل گھر پہ کم ہی نظر آتا تھا۔ غالباً پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ وہ باورچی خانے میں آئی تو رتو ڈبل روٹی سینک رہی تھی۔
''چاند بھیا کے لیے ناشتا بنا؟''
''کیا بجلی سے چلتی ہوں میں؟'' رتو اس سے بھی زیادہ جھنجلائی ہوئی تھی۔ وہ بس دانت پیس کر رہ گئی تھی۔ دوسرے چولہے پر نکی بوا پراٹھے بنا رہی تھیں۔ وہ وہیں اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی رتو نے انڈے فرائی کیے تو بڑے ماموں نے ابلے انڈوں کی فرمائش کی۔ انڈے ابلنے لگے ساتھ ساتھ ماہین بھی کھولنے لگی۔
''ارے زمانے کو فارغ کر دو، انہیں یونہی بھوکا مرنے دو، یہاں کون سا کوئی پوچھنے والا ہے۔'' وہ تلملا کر وہاں سے اٹھ گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد رتو نے آ کر اطلاع دی۔
''دے آئی ہوں ناشتا تمہارے چاند بھیا کو۔''

''اب بھی نہ دیتیں میری بلا سے۔۔۔'' وہ ناراضی سے بولی تو رتو بے اختیار ہنس دی۔
''چلو آؤ ناشتا کریں۔ قسم سے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔
''چلتے ہیں، پہلے یہ گولیاں دے آؤ چاند بھیا کو۔'' اس نے بخار کی گولیاں نکال کر رتو کو دیں۔
''میں باورچی خانے میں ہوں، وہیں آ جانا۔'' وہ رتو سے کہتی ہوئی باورچی خانے میں آ گئی۔
''رتو! آخر کیوں کرتے ہیں سب لوگ ایسا؟ کیا چاند بھیا انسان نہیں ہماری اور تمہاری طرح۔ پھر ان کی تکلیف پر کسی کا دل کیوں نہیں دکھتا۔''
وہ جلے دل سے بولتی رہی۔ رتو مزے سے اپنا ناشتا کرنے کے بعد اس کے ناشتے پر پل پڑی۔ خوب ڈھیر سارا بول چکنے کے بعد اسے احساس ہوا، تب تک وہ اس کے حصے کا ابلا ہوا انڈہ اور آلو کے قتلے کھا چکی تھی۔
''بدتمیز۔'' کھلکھلاتی ہوئی رتو کو بس گھور کر رہ گئی تھی۔
ناشتے کے بعد دوبارہ چاند بھیا کے کمرے میں گئی تو وہ سو رہے تھے، وہ یونہی خاموشی سے باہر نکل آئی۔ بڑی ممانی نہ صرف اٹھ چکی تھیں۔ بلکہ اس کی تلاش میں نیچے آ گئی تھیں۔ انہیں بازار جانا تھا اور وہ ماہین کو ساتھ لے جانے پر بضد تھیں۔ اس نے کمرے میں آ کر اماں سے اجازت لی اور پھر رتو کو چاند بھیا کا خیال کرنے کی تاکید کرتی ہوئی ممانی کے ساتھ بازار چلی گئی۔ ممانی نے سمیعہ کو کچھ چیزیں بھجوانی تھیں اور یہ تمام چیزیں انہوں نے اتنی دیکھ پرکھ، جانچ پڑتال کے بعد خریدی تھیں کہ واپسی پر شام تو ہو ہی گئی تھی۔ وہ آ کر جو بستر پر گری تو پھر رات کو ہی اٹھی تب خیال آیا، کل اس کا ایک بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔ رات کا کھانا بھی اس نے یونہی جلدی میں کھایا۔ رتو سے چائے بنانے کا کہنا چاہا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ نکی بوا سے کہہ کر وہ اسٹڈی میں آ گئی۔ کچھ نکات سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس نے چھوٹے ماموں سے مدد طلب کی۔ جواباً وہ اسے سمجھانے بیٹھے تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور جب وہ مطمئن ہو کر اسٹڈی روم سے باہر آئی تھی تو آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں، چاہنے کی باوجود بھی وہ چاند بھیا کی خیریت معلوم کرنے ان کے کمرے میں نہ جا سکی۔



صبح وہ حسب عادت فجر کے وقت ہی اٹھی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد یونیفارم استری کیا اور باہر نکل آئی۔ کچن میں پھیلی تاریکی اور خاموشی بتا رہی تھی کہ رتو اور نکی بوا ابھی تک نہیں جاگیں۔
وہ سیدھی اوپر چلی آئی۔ بڑی ممانی بہت دیر سے اٹھتی تھیں۔ محبّ ناشتا جلدی کرنے کا عادی تھا بلکہ ہاسٹل لائف نے عادی بنا دیا تھا۔ لہٰذا وہ صبح ہی اٹھ کر ممانی کے بیڈروم کے چکر لگانے لگتا اور بالآخر جھنجلاتا ہوا نیچے اتر آتا اور آج تو ممانی تھکاوٹ کے مارے یقیناً بہت دیر سے اٹھیں گی۔ محبّ کو واپس بھی جانا تھا، لہٰذا اس کے لیے ناشتا تیار کرنے کے خیال سے ہی وہ اوپر آ گئی تھی۔
بڑے ماموں بھی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ اس کے سلام کا جواب نہایت خوش دلی سے دیتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر تھپکی دی اور ساتھ ہی چائے کی فرمائش بھی کر دی۔
''جب سے سمیعہ کی شادی ہوئی ہے، تمہاری ممانی نے تو ہمیں چائے کے لیے بھی ترسا دیا ہے۔''
''میں ابھی تیار کرتی ہوں ماموں جان۔'' وہ کچن میں آ گئی۔ چائے کے لیے پانی چولہے پہ رکھا تو

خود آملیٹ کے لیے پیاز کاٹنے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ چائے کے لیے فریج سے دودھ نکال رہی تھی جب وہ اچانک پیچھے سے آ کر بولا۔

''اوہ اب سمجھا، مستقبل کی پریکٹس ہو رہی ہے۔'' اس نے خود ہی فرض کر لیا جبکہ ماہین نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات پر بالکل بھی توجہ نہیں دی تھی۔

''میں تو صرف ناشتا تیار کر رہی ہوں، آپ جو مرضی سمجھیں۔''

''سوچ لو، میں کچھ بھی سمجھ سکتا ہوں۔'' اس نے بے حد معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے فریج سے انڈے نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

''محب! تم اتنا فضول کیوں بول رہے ہو۔ بتاؤ، چائے میں چینی کتنی لو گے۔''

''لو جی، ابھی تک تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔ آخر مستقبل میں۔۔۔''

''فار گاڈ سیک محب! میں یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی جاؤں گی۔'' وہ درمیان میں چڑ کر بولی تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر چند ثانیے کے بعد بولا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں چینج کر کے آتا ہوں۔ تم تب تک آملیٹ بنا لو۔'' اس کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا۔ ماہین نے بھی واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

''سنو، یہ ماموں کے لیے چائے لیتے جاؤ۔'' اس نے روک کر چائے کا کپ اسے تھمایا۔

''محب! میں جانتی ہوں، تم میرے رویے سے بہت ہرٹ ہوتے ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم یہ سب قبل از وقت سوچ رہے ہو۔ ایک عمر پڑی ہے ایسی باتیں سوچنے کے لیے۔ ابھی تمہیں اپنا کیریر بنانا ہے۔ مجھے پڑھنا ہے اور ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ۔''

''ماہین! میں تمہیں ابھی شادی کی آفر تو نہیں کر رہا۔ میں تو صرف تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں کسی بھی رائے کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں محب! میں نہیں چاہتی کہ کل کو فیصلہ میری رائے کے برعکس ہو تو مجھے کسی شرمندگی یا الزام کا سامنا کرنا پڑے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا ماہین؟ جانتی ہو، محض کسی شرمندگی یا الزام سے بچنے کی خاطر تم مجھے کتنی اذیت دیتی ہو۔'' وہ ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔

''محب! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ماموں انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ سخت لہجے میں کہہ کر رخ موڑ گئی تو محب سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے تیزی سے کام مکمل کیا۔ جانتی تھی وہ تیار ہو کر آئے گا اور دوبارہ اس کا سر کھائے گا۔ لہٰذا اس کے واپس آنے سے قبل ہی وہ ناشتا تیار کر کے نیچے آ گئی تھی۔ اس کی باتوں میں یونہی الجھتی ہوئی وہ چاند بھیا کے کمرے کے سامنے سے گزری تو ان کی کراہوں کی آواز سن کر وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔

''یا اللہ، کہیں تکلیف زیادہ تو نہیں ہو گئی۔ وہ تو بہت برداشت کرنے والے انسان ہیں۔''

وہ ان کی کراہوں سے گھبرا کر فوراً ان کے کمرے میں داخل ہو گئی اور پھر ان کی حالت دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ گھٹنے ٹھوڑی سے لگے۔ سردی سے بچاؤ کے لیے ناکافی بوسیدہ کمبل۔ نیم بے ہوشی اور ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ نکلتی آہیں اور کراہیں۔ انہیں اس طرح بے سدھ پڑے دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول

گئے تھے۔

''چاند بھیا، چاند بھیا۔'' اس نے ایک دم انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

''غضب خدا کا اتنا تیز بخار۔'' ماہین نے ان کی جلتی پیشانی کو چھوا تو ٹھنڈے ٹھار ہاتھ کے لمس سے جھرجھری لیتے ہوئے چاند بھیا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''اتنا تیز بخار ہے۔ چاند بھیا! دوا نہیں لی تھی کیا؟ اٹھیے میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔'' وہ عجلت میں کمرے سے باہر نکل گئی اور پھر جلد ہی بسکٹ اور نیم گرم دودھ کا گلاس لے کر واپس آ گئی پھر چاند بھیا کو آواز دی مگر ان کی پلکیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔

''چاند بھیا! اٹھیے ناں دوا لے لیجیے۔ بخار کم ہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھانے چلتے ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر چاند بھیا کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''اماں! اماں۔'' چاند بھیا کے لبوں سے بے اختیار نکلنے والے یہ الفاظ بالکل واضح تھے۔ وہ اپنی جگہ رک سی گئی۔

''اماں! مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ میں مر رہا ہوں! اماں میں مر جاؤں گا۔'' ان کی آواز کی تڑپ اور نقاہت ماہین کا دل دہلا گئی تھی۔

''چاند بھیا۔'' اب کے اس نے آہستگی سے انہیں پکارا تو فوراً ہی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

''اٹھیے دودھ پی لیجیے۔'' وہ انہیں سہارا دینے کو آگے بڑھی۔ چاند بھیا نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اگلے ہی پل ان کی لرزتی پر حدت انگلیاں اس کی کلائی سے لپٹ گئی تھیں۔ ماہین نے ایک دم سر اٹھا کر انہیں دیکھا وہ ڈبڈبائی آنکھوں میں سرخی لیے اس پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ ان کی گرفت کی غیر معمولی سختی اسے لحہ بھر میں سراسیمہ کر گئی تھی۔

''اٹھیے چاند بھیا۔'' اس نے اصرار کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔

''ماہین! میں کون ہوں؟ کیوں ہوں؟ اس پوری کائنات میں مجھ سے بے کار کوئی اور بھی ہو گا کیا۔'' ان کا لہجہ بھی غیر معمولی تھا اور انداز بھی عجیب۔ ماہین ایک لمحے کو خوفزدہ سی ہو گئی۔

''میں کبھی بھی سمجھ نہیں پایا۔ میرا جرم کیا ہے۔ کون سا قصور سرزد ہوا ہے مجھ سے۔ سب لوگ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ میری ماں کیوں مر گئی؟ میرا باپ کیوں مر گیا؟'' وہ اب اٹھ بیٹھے تھے اور اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں جکڑے ہذیانی کیفیت میں بول رہے تھے۔

''تم جانتی ہو، رات بھر سرد ہوائیں میرے بدن کو چیرتی رہیں۔ کسی نے آ کر مجھے اپنی آغوش کی گرمی نہیں بخشی۔ بھوک میری آنتوں میں پنجے گاڑے بیٹھی ہے مگر کسی کو اس کی فکر نہیں، میرے سر پہ ہتھوڑے برس رہے ہیں مگر کوئی مسیحا لمس اس درد کو سمیٹنے کے لیے میری پیشانی پر نہیں اترا۔ کیوں؟ ماہین میں جیوں یا مر جاؤں، کوئی میرے لیے تردد کرنے والا نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے ماہین؟'' وہ کسی نو عمر بچے کی سی عاجزی سے اس سے سوال کر رہے تھے۔

''اگر میری ماں یہاں ہوتی تو کیا وہ اس اندھیری کوٹھری میں مجھے یوں مرنے کے لیے چھوڑ دیتی۔ میرا باپ ہوتا تو کیا میں یونہی بخار میں جلتا رہتا۔ میں بھوکا رہتا تو کیا وہ دونوں پیٹ بھر لیتے۔ نہیں

وہ کبھی ایسا نہیں کرتے۔ ماں باپ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ جاؤ ماہین! کسی کو بلاؤ۔ کسی اپنے کو، میری ماں کو، اسے کہو، مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' چاند بھیا کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ماہین کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''اماں! اماں! آ جاؤ، میرا جسم، میری روح تھکن سے چور چور ہے۔ پیاس بہت ہے، درد بہت ہے۔ میں مر رہا ہوں، مجھے بچاؤ۔'' وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ سر گرائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

''کوئی نہیں جانتا۔ اس طرح سے زندگی جینا کتنا دشوار ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے خود کو کئی بار مرتے دیکھتا ہوں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا ماہین، میں یہاں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ یہاں انسان نہیں بستے، بھیڑیے رہتے ہیں جو روز اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ جو روز زندہ کرتے ہیں، روز مار دیتے ہیں۔ روز ٹھوکر لگا کر وجود کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ کچل دیتے ہیں۔ پامال کر دیتے ہیں۔ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں ماہین، بتاؤ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔''

''چاند بھیا! آپ۔۔۔'' ماہین بے بس سی ہو کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگی تھی اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان کے اضطراب کو سکون میں ڈھالے۔

''میں کل سے بھوکا ہوں ماہین! میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ کوئی مجھے رات کے کھانے پر بھی پوچھنے نہیں آیا۔ تم بھی نہیں آئیں ماہین! میں انتظار کرتا رہا، بہت دیر تک منتظر رہا تمہارا، رتو کا۔ میں کئی بار اس چارپائی سے اٹھا تھا اور ہر بار ہی دروازے پر پہنچنے سے پہلے گر گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، میں کتنے پہر بے ہوش رہا ہوں۔ میں اس قدر بے بس کیوں ہو گیا ہوں؟ مجھے اپنی کمزوری سے، اپنی بے بسی سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ اپنے آپ سے، تم سے، اس کمرے سے، اس گھر سے اس پوری کائنات سے۔''

انہوں نے وحشت کے عالم میں ماہین کو دھکا دے ڈالا، اپنے اوپر سے کمبل نوچ پھینکا۔ ماہین خوفزدہ سی ہو کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں لہرا کر دوبارہ چارپائی پہ ہی گر گئے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''میں، میں کسی کو بلا کر لاتی ہوں۔ آپ ابھی ڈاکٹر۔'' وہ دروازے کی طرف لپکی مگر چاند بھیا نے روک دیا۔

''نہیں۔۔۔ کسی کو مت بلانا۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ نفرت ہے مجھے اس نام نہاد ہمدردی سے۔'' ان کا نحیف لہجہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

''ہاں، کسی کو بلانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تیمارداری کے لیے یہ باندی جو حاضر ہے۔''

چاند بھیا کے کمرے کی خنک خاموشی میں یہ سخت گیر آواز کسی چابک کی طرح ان کی سماعتوں پر لہرائی تھی۔ ماہین یک لخت پلٹی تھی اور پھر نجمہ خالہ کو دروازے کے عین وسط میں کھڑے دیکھ وہ فوراً ان کی طرف بڑھی تھی۔

''نجمہ خالہ! دیکھیے ذرا بھیا کی طبیعت کتنی بگڑ گئی ہے؟'' لیکن نجمہ خالہ اسے بری طرح نظر انداز کر کے چاند کی طرف بڑھی تھیں۔

''کیا تماشا لگایا ہے اب کے تم نے۔ چلے ہو تم بھی اپنے باپ کی طرح ایک لڑکی کو پھانسنے۔ اپنی

مظلومیت اور بے چارگی کا ڈھونگ رچا کر کر اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھانے کی خوب سوچی ہے تم نے۔ مگر میاں! یاد رہے، میں ابھی زندہ ہوں تاریخ اپنے آپ کو دہرانا چاہتی ہے مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔'' ان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' ماہین تیر کی طرح ان کی طرف لپکی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں اور تم؟'' وہ پھنکارتی ہوئی اس کی طرف پلٹیں ''تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی، یوں تنہا اس کے کمرے میں آتے ہوئے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' خالہ کی صاف اور سیدھی بات اس کے ہوش اڑا لے گئی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے خالہ آپ کو، میں تو صرف۔''

''ہاں تم صرف بیمار کی تیمارداری کے لیے آئی تھیں۔۔۔ ہے ناں؟ مگر کیوں؟ کس لیے؟ کیا لگتا ہے یہ تمہارا، کس تعلق۔۔۔ کس رشتے سے تم اتنی ہلکان ہوئی جا رہی ہو؟ اس گھر کے باقی سب لوگ مر گئے ہیں کیا؟ رتو، نکی بوا یا اس گھر کا کوئی اور فرد صرف تم ہی کو ہمدردی کا بخار کیوں چڑھا ہوا ہے؟'' ان کی بلند آواز ماہین کو زمین میں گاڑ گئی تھی۔

''خالہ! چپ ہو جائیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں، آپ کتنی گھٹیا بات کر رہی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے سب۔ تم نہیں جانتیں۔ کم عقل اور نادان ہو تم وہ تمہیں کس کس طرح اپنے جال میں پھنسا رہا ہے۔ تمہیں اندازہ تک نہیں۔ اس طرح شیشے میں اتارتے ہیں یہ بدبخت۔'' نجمہ خالہ کی آواز اور الفاظ ماہین کو آج سے پہلے کبھی اتنے غلیظ اور کریہہ نہیں لگے تھے۔

وہ چاند بھیا کے بارے میں کتنی مقدس سوچ رکھتی تھی اور نجمہ خالہ کتنی گری ہوئی باتیں کر رہی تھیں، خود چاند بھی دم بخود سے بیٹھے تھے۔

''دیکھیے آپ، آپ ایسا مت کہیے۔ میرے لیے ایسا سوچنا بھی کفر ہے۔ ماہین میرے لیے۔'' چاند بھیا کے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا وہ بمشکل سنبھلتے ہوئے خالہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

''تم اپنی بکواس بند کرو۔۔۔ باپ کی طرح جھوٹے اور مکار۔'' انہوں نے پوری قوت سے چاند بھیا کو اپنے سامنے سے دھکیلا تو وہ بری طرح لڑکھڑا کر گر گئے تھے۔ ان کا سر زوردار طریقے سے لوہے کی چارپائی سے ٹکراتے دیکھ کر ماہین کی چیخ نکل گئی تھی۔ قطعی غیر ارادی طور پر وہ انہیں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی تھی مگر نجمہ خالہ نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس گھسیٹ لیا تھا۔

''خبردار جو تم آگے بڑھیں۔ بڑے بھیا سے کہہ کر ایسی مار لگواؤں گی تمہیں کہ ساری ہمدردی ہوا ہو جائے گی۔ چلو نکلو باہر۔'' نجمہ خالہ نے اس کو باہر کی طرف دھکیلا اور وہ نجانے کیسے کمزور پڑ گئی۔ شاید یہ خوف کہ اگر یہ جھوٹ موٹ کی بات سچ مچ کسی کے کانوں تک پہنچ گئی تو کیا ہو گا؟

''نجمہ خالہ! آپ اچھا نہیں کر رہیں۔ چاند بھیا کے خون نکل آیا ہے اتنی ظالم مت بنیے۔'' وہ تڑپی تھی مگر نجمہ خالہ نے ایک دھکے سے اسے کمرے سے نکال باہر کیا تھا۔

''بدبخت! کیوں اپنی عزت گنوانے کے درپے ہو چلو اپنے کمرے میں۔'' وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آئی تھیں۔ ماہین کو چاروں طرف سے گھیرا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" بڑے ماموں سیڑھیاں اترتے ہوئے آرہے تھے، انہیں صحن کے عین وسط میں کھڑے دیکھ کر پوچھے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

"اپنی بھانجی سے پوچھیے۔" ان کے لہجے میں طنز ہی طنز تھا۔ اس سے پہلے کہ ماموں اس سے استفسار کرتے، وہ چیخ اٹھی تھی۔

"مجھ سے کیا پوچھنا ہے۔ پوچھیے اپنی اس بہن سے جو انسانیت کے نام پر دھبا ہیں۔ صرف دھبا اور کچھ بھی نہیں۔"

وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ہکا بکا سے بڑے ماموں کو کچھ اندازہ نہ ہوا تو وہ حیرت کے عالم میں کندھے اچکاتے نجمہ کی طرف پلٹے، وہ بھی بغیر جواب دیے غصے سے سر جھٹکتے ہوئے ایک طرف بڑھ گئی تھیں۔



صبح سے دوپہر ہو گئی تھی مگر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا۔ اماں نے کئی بار آکر دروازہ کھٹکھٹایا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ محبّ جانے سے قبل اسے خدا حافظ کہنے آیا تب بھی وہ یونہی چپکی رہی، بھوکی، پیاسی روتی رہی اور کھولتی رہی۔ نجمہ خالہ کی باتیں رہ رہ کر یاد آتیں اور اسے نئے سرے سے جلاتیں، کتنی بار دل چاہا نجمہ خالہ کے سامنے جائے اور انہیں کھری کھری سنا کر آئے۔ اسے اپنے مضبوط کردار پر فخر تھا۔ اماں اس چھوٹی سی عمر میں اسے اپنے لیے اس قدر محتاط دیکھتیں تو سینہ فخر سے تن جاتا۔ اکثر سب کے سامنے کہتی تھیں۔

"میری بیٹی اپنے باپ کی عزت کا علم ہمیشہ سر بلند رکھے گی۔"

اور یہ نجمہ خالہ ایسی گھٹیا باتیں کہہ گئی تھیں کہ اس سے کسی طور پر ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ کئی بار چاند بھیا کا خیال بھی آیا۔ اتنا تیز بخار اس پر وہ گہری چوٹ، اس نے اپنی آنکھوں سے ان کے سر سے خون بہتا دیکھا تھا۔

"یا اللہ! اس گھر کے مکینوں کے دل تھوڑے سے نرم کر دے۔" وہ بے اختیار دعا کرنے لگی۔

کئی بار قدم غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ جی چاہا تمام باتیں پس پشت ڈال کر چاند بھیا کی خیریت معلوم کرنے جا پہنچے۔ مگر کوئی ڈر، خوف تھا جو اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔

"کہیں خالہ دوبارہ جنون میں آگئیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خوامخواہ اپنی بات کو سچا بنا دیں گی۔" بات جھوٹی تھی، بے سروپا تھی مگر اس کے لیے شرمندگی کا باعث تھی۔

"اور یہ رتو بھی خدا جانے کہاں مر گئی ہے۔ آجاتی تو چپکے سے کہتی، چاند بھیا کو کچھ کھانے کو دے آؤ اور کسی سے کہہ کر ڈاکٹر کو بلوا لو۔" وہ بے حد فکرمند تھی۔

"خیر بسکٹ اور دودھ تو وہیں کمرے میں ہی پڑے تھے، چاند بھیا ذرا سی ہمت کریں تو کھا ہی لیں گے۔ لیکن یہ کمبخت رتو آئے تو پوچھوں تو سہی میں جو کل بازار جانے سے قبل اسے چاند بھیا کا خیال رکھنے کا کہہ گئی تھی تو پھر وہ سارا دن بھوکے کیوں رہے۔" رتو کا سوچ کر اسے مزید غصہ آگیا تو بند کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ وہ یونہی خود سے لڑتی جھگڑتی رہی اپنی بزدلی پر تاؤ کھاتی رہی۔

"مجھے اسی وقت ماموں جان کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے تھی وہ خود ہی نجمہ خالہ کے ہوش ٹھکانے لگا دیتے۔ لیکن کہاں؟ نجمہ خالہ تو چہیتی ہیں سب کی، الٹا مجھے ہی سمجھانے بیٹھ جائیں گے۔"

اس نے فکرمندی سے سر تھام لیا، تب ہی بھوک کا احساس ہر سوچ پر غالب ہو گیا۔ پیٹ میں آگ سی جلنے لگی۔ تب وہ سینہ ٹھونک کر ہر صورت حال کے مقابلے کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر آگئی۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اسے کسی غیر معمولی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غالباً نجمہ خالہ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بڑی ممانی ساگ بنا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا دیں۔

"آج تو سونے کے ریکارڈ قائم ہو گئے ماہین۔"

وہ جواباً مسکرا بھی نہ سکی۔ سیدھی باورچی خانے میں آگئی۔

"اے آپا! ذرا پوچھ کر تو دیکھو، مسئلہ کیا ہے۔ صبح نجمہ بھی ناشتا کیے بغیر ہی اسکول گئی ہے۔ لگتا ہے خالہ بھانجی میں کچھ ٹھن گئی ہے۔" اس نے اپنے پیچھے ممانی کو کہتے سنا تھا۔ لیکن اماں نے فوری طور پر اس کے پیچھے آنا غالباً مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔

کچن میں نکی بوا دوپہر کا کھانا تیار کر چکی تھیں۔ اس نے وہیں بیٹھ کر گرم گرم چپاتی ہاٹ پاٹ سے نکالی اور تھوڑا سا سالن نکال کر کھانے بیٹھ گئی، نکی بوا کہتی رہیں۔

"رائتہ بن رہا ہے۔ سلاد بن جانے دو۔ گھڑی بھر انتظار کر لو، چاول دم پہ ہیں۔" مگر وہ سنی ان سنی کر کے کھاتی رہی۔ تنگ آکر نکی بوا خاموش ہو گئیں۔ سارا غصہ برتنوں کی اٹھا پٹخ پر نکلا، وہ ابھی کھا ہی رہی تھی جب باہر سے رتو کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی اور ماہین ہاتھ میں پکڑا نوالہ وہیں پلیٹ میں رکھ کر اٹھ گئی۔ رتو کی ہنسی اسے آج سے پہلے کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی۔ تیز رفتاری سے قدم اٹھاتی وہ باہر صحن کی طرف آئی اور اگلے ہی لمحے ٹھٹھک کر رہ گئی۔ وہ غالباً کہیں باہر سے آرہی تھی۔ کپڑوں کی ایک گٹھڑی ابھی بھی اس نے بازو میں دبائی ہوئی تھی ماہین وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"ہاں بھئی رتو! بھگتا آئی منگنی کا فنکشن۔" چھوٹی ممانی تجسّس سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں جی۔ بس کیا بتاؤں، بڈھی گھوڑی لال لگام۔ جھریوں بھرا چہرہ بندہ پوچھے اب اس عمر میں منگنی جیسے چونچلوں کی ضرورت ہی کیا تھی، سیدھے سیدھے نکاح پڑھوا کر رخصت کر دیتے۔" وہ اپنے مخصوص بے ساختہ انداز میں بولے جا رہی تھی۔

"اب تو بس یہ ہی دعا ہے کہ اللہ ہماری۔" اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے تب ہی نظر ماہین پر پڑی تو جلدی سے دونوں ہاتھ گرا کر کھڑی ہوئی۔

"اچھا چھوٹی صاحبہ! باقی تفصیل تو میں آپ کو شام کو بتاؤں گی۔ ابھی تو میں ماہین سے سلام دعا کر لوں۔"

"ہاں ہاں کر لو، تمہارے بغیر اس کا بھی گھر میں دل کہاں لگا؟ سارا دن اپنے کمرے میں ہی گھسی رہی۔" ممانی کے کہنے پر رتو نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا سی گئی۔

"ماہین! خیریت تو ہے ناں؟" وہ فوراً اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ تو اس کے چہرے کے رنگوں کو پہچان لیتی تھی اب بھی اسے غیر معمولی طور پر سنجیدہ دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی تھی۔

"رتو۔۔۔کہاں گئی تھیں تم؟"
"لو جی، تمہیں خبر ہی نہیں۔" رتو نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"خبر ہوتی تو کیا میں تم سے پوچھتی۔" وہ چڑ کر بولی تو رتو خوامخواہ ہی خفا ہو گئی۔
"کل سے میں گھر سے غائب تھی اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ بس اتنا ہی خیال ہے ناں میرا۔"
"رتو! میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ مجھے تنگ مت کرو۔" وہ ستے ستے انداز سے کہتی وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔
"نجمہ خالہ کی سہیلی کی منگنی تھی ناں تو کل وہ مجھے اپنے ساتھ اس کے گھر لے گئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں۔ کچھ کام وغیرہ کروانا ہے۔ کام تو کیا تھا وہاں سارا انتظام ہوٹل کے بندوں نے سنبھال رکھا تھا۔ میں تو بس ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔ رات کو واپسی کا وقت ہوا تو نجمہ خالہ نجانے کیسے چپکے سے وہاں سے چلی آئیں۔ میں تو سچ پرائے گھر میں بڑا گھبرائی، خیر ایک بوڑھی ملازمہ کے کوارٹر میں رات بسر کی، صبح سارا پھیلاوا سمیٹا اور اب جوں ہی ان کی سہیلی کا بھائی فارغ ہوا۔ اپنی گاڑی میں مجھے یہاں چھوڑ گیا۔ وہ تو میرے کام سے بہت خوش ہوئے۔ آتے ہوئے ایک نیا جوڑا بھی دے رہے تھے مگر میں نے لیا نہیں کہہ دیا کہ نجمہ خالہ کی سہیلی سمجھ کر آپ کے کام میں مدد کروا دی ہے ورنہ میں اجرت پر یوں گھر گھر کام نہیں کرتی۔"
"تو نجمہ خالہ! یہ آپ کی ہی کارستانی تھی۔ ایک سوچی سمجھی اسکیم، آپ کو معلوم تھا۔ اس گھر میں چاند بھیا کے ایک نہیں دو ہمدرد ہیں ایک کو آپ نے گھر سے ہی دور کر دیا۔ دوسرے پہ الزامات کی بوچھاڑ کر دی، ایک بیمار اور لاغر شخص کو اذیت دے کر بھلا کتنی راحت ملی آپ کو۔" رتو اپنی ہی باتوں میں گم تھی۔ ماہین اپنی سوچوں میں غلطاں۔
"اے کیا سوچ رہی ہو؟" درمیان میں رتو نے اسے ٹوکا۔
"رتو ذرا چاند بھیا کے کمرے میں تو جاؤ، صبح ان کی طبیعت بے حد خراب تھی، معلوم کرو۔"
"طبیعت زیادہ خراب تھی۔" رتو ایک دم مضطرب سی ہو گئی اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ماہین طویل سانس لے کر کمرے میں آ گئی۔ وہاں اماں پہلے ہی اس کی منتظر تھیں۔ اس نے ان کے پاس بیٹھ کر تمام صورتِ حال ان سے کہہ ڈالی تھی اماں اڑی اڑی رنگت کے ساتھ چپ بیٹھی رہیں پھر کتنی ہی دیر بعد گویا ہوئیں۔
"میں تو پہلے ہی تم سے کہا کرتی تھی ماہی کہ چاند کی طرف زیادہ دھیان مت دیا کرو۔ نکی بوا یا رتو سے کہہ دیا کرو۔ تم نجمہ کو نہیں جانتیں سانپ سے زیادہ زہریلی ہے یہ، اب یہ ہی دیکھ لو، اتنے برس بیت گئے۔ اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ نجانے کیسا پتھر دل ہے اس کا۔ کسی صورت پگھلتا ہی نہیں، گھر بس جاتا شاید کوئی تبدیلی آ جاتی۔ مگر اللہ بخشے ہمارے اماں باوا نے سب سے چھوٹی جان کر لاڈ بھی ضرورت سے زیادہ ہی اٹھائے تھے۔ اسی لیے تو آج تک بڑے بھیا بھی دبتے آئے ہیں۔ خیر آئندہ تم ذرا احتیاط ہی کرنا اس کے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔ یہاں تمہارا باپ نہیں بیٹھا سرپرستی کرنے والا، میں نجمہ سے بات کروں گی۔"
اماں بے چاری فکرمندی ہو کر اٹھ گئی تھیں۔ تب ہی رتو بھاگی چلی آئی تھی۔ غیر معمولی طور پر گھبرائی

ہوئی، ماہین کا دل ایک لمحے کے لیے ڈوب سا گیا۔
"نجانے کیا خبر سنائے گی یہ۔" وہ دم بخود سی اسے دیکھے گئی۔
"سنو ماہین! وہ۔۔۔وہ چاند گرہن کے کمرے میں خون۔" وہ ماہین کے پاس آ کر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔
"ہاں، ان کے چوٹ لگی تھی۔ وہ خود تو ٹھیک ہیں ناں؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔
"وہ، وہ خود تو کمرے میں نہیں ہیں۔"
"کیا؟ کہاں چلے گئے وہ؟" وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"مم۔۔۔میں کیا جانوں؟ سب سے پوچھ آئی ہوں۔ کسی نے کام سے بھی نہیں بھیجا۔" رتو بس رو دینے کو تھی۔
"کام سے کس نے بھیجنا تھا رتو! اور وہ اس قابل ہی کہاں تھے کہ۔۔۔۔ خیر تم جاؤ، جا کر ادھر اُدھر دیکھو بلکہ آس پاس جو ڈاکٹرز کے کلینک ہیں۔ وہاں پتا کر کے آؤ، ہو سکتا ہے۔" اس نے کسی امید کے تحت رتو کو باہر بھگا دیا اور خود گھر کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ گھر کے تمام افراد بھی لاعلم تھے۔
"اس نے کہاں جانا ہے بھئی۔۔۔ یہیں کہیں ہو گا، آ جائے گا۔" اکثریت کا خیال یہ ہی تھا مگر اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب کی بار کچھ غیر معمولی ہو کر رہے گا۔
رتو کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی صحن سے ڈیوڑھی اور ڈیوڑھی سے صحن تک چکر لگاتی رہی تب ہی بڑی ممانی نے اوپر سے جھانکا۔
"ماہین! آج کالج نہیں گئیں یا پھر جلدی واپس آ گئی ہو؟"
"آج چھٹی کی ہے ممانی۔" وہ بمشکل خود کو جواب دینے پر آمادہ کر پائی تھی۔
"اچھا، اچھا سنو، صبح محب کو ناشتا تم نے بنا کر دیا تھا۔" کھوجتا ہوا انداز، ماہین کے لیے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔
میری توبہ جو آج کے بعد کسی کی مدد یا ہمدردی کا خیال بھی میرے دل میں آیا۔ ہر نیکی ہی گلے پڑ رہی ہے۔
"ماموں نے چائے بنانے کے لیے کہا تھا۔ ساتھ میں ناشتا بھی تیار کر دیا۔ معلوم نہیں محب نے کھایا یا ماموں نے۔"
اس نے ٹالنے کے سے انداز میں بات کی تو ممانی کی پُرسکون سی طویل سانس اسے یہاں تک سنائی دے گئی۔ وہ محب کے لیے اپنی بھانجی پر نظر رکھے بیٹھی تھیں اور سارا خطرہ انہیں صرف اور صرف ماہین کی طرف سے ہی تھا کہ بیٹے کے تیور وہ خود تو دیکھ رہی تھیں۔
کچھ وقت مزید گزر گیا تو وہ تھک کر وہیں سیڑھیوں پہ ٹک گئی۔ تب ہی دروازہ کھلا اور رتو دھیرے دھیرے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ماہین اس سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی کہ اس کے بہتے آنسوؤں نے ساری بات اسے سمجھا دی تھی اور پھر شام سے رات ہو گئی۔ وہ دونوں یونہی چپ چاپ بوکھلائی بوکھلائی سی پھرتی رہیں۔ ماہین نے کئی بار چوری چھپے ان کے کمرے میں جا کر جھانکا، رتو کے آنسو رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

"اور مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ کسی جیتے جاگتے انسان کا وجود اس قدر ارزاں بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے کھڑکی کھول کر باہر تاریکی کو دیکھا۔

کوئی بھی تو نہیں تھا جو فکر مند ہوا ہو، جو بے قرار ہو کر انہیں ڈھونڈنے نکلا ہو۔ بڑے ماموں نے کہا تھا۔ "ہاں بھئی، پتا کرواتے ہیں۔ اس کا، کہاں چلا گیا ہے۔" مگر وہ جانتی تھی، انہوں نے کہیں پتا نہیں کروایا کسی سے نہیں پوچھا، کہیں نہیں کھوجا۔

اور چھوٹے ماموں تڑخ کر بولے تھے "وہ کوئی بچہ تو نہیں جو کھو جائے گا۔"

بڑی ممانی کو سرے سے جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ عبید بھیا جاب کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ اسد اور زین نے تو کبھی زندگی میں شاید اس سے کلام کیا ہو۔ ہاں محب ہوتا تو شاید۔۔۔ ماہین نے طویل سانس لے کر کھڑکی بند کی اور رتو کے برابر آ بیٹھی وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"بہت برا ہوا ہے رتو! بہت برا۔" وہ خود کو روک نہ پائی۔ چاند بھیا کے بارے میں بتاتی چلی گئی۔

"بیماری، بھوک اور موسم کی شدت نے انہیں کیا کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں انہیں پہلی مرتبہ اپنے ماں باپ کے لیے روتے دیکھا تھا۔ ذرا سوچو رتو! وہ بائیس سالہ نوجوان جس کی آنکھ میں تم نے کبھی آنسو بھی نہ دیکھا ہو، وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رو دے تو تمہیں کیسا محسوس ہوگا۔ میرا دل چاہ رہا تھا، میں انہیں کسی ننھے بچے کی طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لوں۔ ان کے بال سنواروں، انہیں بہلاؤں، اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کروں۔ بالکل ایسے ہی رتو جیسے ایک ماں اپنے بچے کو خاموش کرواتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بچپن سے چاند بھیا مجھے بہلاتے آئے ہیں لیکن میں تو ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی رتو! وہ بیمار تھے۔ بھوکے تھے۔ زخمی تھے۔ کہاں گئے ہوں گے وہ۔ یونہی شہر کی کسی سڑک پر لاوارثوں کی طرح پڑے ہوں گے یا کوئی سہارا دینے والا بھی ہوگا؟ لیکن کون دے گا سہارا رتو، سہارا دینے والے کون ہوتے ہیں، کہاں ہوتے ہیں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

رتو اسے چپ کرانے کے بجائے خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔

"اللہ سہارا دینے والا ہے بٹی! وہی آسرا دے گا۔ تو فکر نہ کر۔" یہ نکی بوا تھیں اسے تسلی دینے والی۔

"نکی بوا! آپ نے بھی تو ان کا خیال نہ کیا۔" وہ شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیا خیال کرتی بٹیا! پہلے بھی کبھی وہ گھر پہ نظر آیا تھا؟ کبھی اس کام، تو کبھی اس کا کام، یہ سوچا کہ کسی کام سے لگا ہوگا جو دکھائی نہیں دیا۔ پہلے بھی خود ہی آ کر بچا کھچا کھا جایا کرتا تھا۔ کبھی اس کے کمرے تک لے جانے یا اسے پکارنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اس روز بھی میں یہ ہی سمجھی کہ مجھے کام میں مصروف دیکھ کر خود ہی کھا پی گیا ہوگا۔ معلوم ہوتا تو وہیں اس کی کوٹھڑی میں جا کر اس کی خبر لے آتی۔ بن ماں کا بچہ تھا۔ کیا ہمارا دل نہ دکھتا ہوگا۔" نکی بوا بڑی وضاحت سے بری الذمہ ہو گئی تھیں۔ ماہین خود کو کوستی رہ گئی۔

رات بھر یونہی کروٹیں بدلتی رہی، ذرا سی آہٹ پر کھڑکی میں سے جھانکنے لگتی، ہو سکتا ہے پلٹ آئے ہوں مگر امید امید ہی رہی انہیں نہ آنا تھا نہ آئے۔ صبح تک صبر جواب دے گیا تھا، وہ یونہی تلملاتی ہوئی نجمہ خالہ کے کمرے میں جا پہنچی اور پھر اس کے جو منہ میں آیا تھا اس نے کہا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو نجمہ خالہ! تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی آپ نے۔ انتقام کی آگ اب تو سرد ہو گئی ہو گی ناں۔ دل میں گڑا کانٹا آج نکل جو گیا۔ بہت پُرسکون ہوں گی آپ لیکن یاد رکھیے،

یہ سکون محض چند روزہ ہے، اسی سکون، اسی اطمینان سے ایسا اضطراب اٹھے گا جو آپ کو جینے دے گا نہ مرنے دے گا کتنا ستایا تھا خالہ آپ نے اس غریب کو لمحہ لمحہ تڑپایا، اذیت دی لیکن اب آپ اس سے زیادہ تڑپیں گی۔ یونہی سسکیں گی۔"

نجمہ خالہ اس کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔ پہلے اسے گھورتی رہیں پھر ڈپٹ کر چپ کرانا چاہا مگر اس کی آگ اگلتی زبان خاموش نہ ہوئی تھی۔

"آپ نے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بنایا تھا خالہ! چاند بھیا کے خلاف سازش تیار کی تھی آپ نے۔ چاند بھیا کے سارے ہمدرداں سے دور کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ آپ انہیں تنہا کر دینا چاہتی تھیں جس طرح آپ نے اس رات انہیں کر دیا تھا۔ کبھی سوچا آپ نے اس وقت جب انہیں بھوک لگی ہوگی اور انہیں کھانا نہیں ملا ہوگا تو انہوں نے کیا سوچا ہوگا ہم سب کے بارے میں اور اس وقت جب ان کے بوسیدہ کمبل میں سے سردی نوکیلے کانٹوں کی طرح ان کے لرزتے وجود میں گھس گئی ہوگی تب ان کے پاس ہمارے لیے کیا ہوگا اور تاریک کوٹھڑی میں جلتے بدن کے ساتھ انہوں نے تنہائی کا عذاب سہا ہوگا تو تب ان کے ہونٹوں پر، ان کے دل میں ہمارے لیے کیا ہوگا، صرف بددعائیں ہوں گی، ان کی ایک ایک آہ بددعا بن کر عرش تک گئی ہوگی بلکہ وہ تو سر تا پا بددعا بن گئے ہوں گے۔ آپ کے لیے، میرے لیے، رتو کے لیے انہوں نے اللہ سے ہمارے لیے تباہی و بربادی مانگی ہوگی، ہمارے لیے تکلیف اور اذیت کی خواہش کی ہوگی، انہوں نے ہمارے لیے ہر اس ظلم و زیادتی کو چاہا ہوگا جس کا وہ خود شکار ہوئے تھے۔ وہ ایک رات، وہ ایک کوتاہی مجھے ہمہ وقت ڈرائے رکھتی ہے میں کانپ جاتی ہوں، یہ سوچ کر کہ جب خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئے گی تو ہم سب کو کہاں پناہ ملے گی مجھے تو وہ ایک رات ہی مضطرب کیے رکھتی ہے خالہ۔ پھر آپ کے دل میں اتنا سکون کیسے بھرا ہے؟ آپ کس طرح ایک ظلم کے بعد دوسرے ظلم پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اتنے اطمینان سے اتنا ظلم کیسے کما لیا خالہ؟ لیکن اب آئندہ کیا ہوگا؟ سوچا ہے آپ نے۔ وہ تو چلا گیا شاید ہمیشہ کے لیے، آپ کی آرزو پوری ہو گئی۔ اسی خواہش کے تحت وہ منصوبہ بنایا تھا جس میں بھانجی کی عزت کی پروا بھی نہیں کی آپ نے اور اس کے کردار پر بھی حرف گیری کی مگر ہوا کیا؟ وہ آپ کے منہ پر طمانچہ مار کر چلا گیا ہے خالہ! اس نے ثابت کیا کہ وہ ایک باکردار شخص ہے، مجھے پھانسنا ہوتا تو یہیں رہتا، اسی گھر میں۔ اپنے شیشے میں اتارنے کی کوشش جاری رکھتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ہر ظلم، ہر مار برداشت کرنے والا اپنے کردار پر انگلی اٹھتے نہیں دیکھ سکا۔ مجھے نہیں معلوم وہ اس وقت کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا؟ زندہ ہوگا یا کسی ٹرک تلے آ کر کچلا گیا ہوگا۔ لیکن دعا کیجیے خالہ کہ وہ زندہ ہو، کم از کم اس وقت تک جب تک ہم اس سے اپنے گناہ نہ بخشوا لیں کہ اس کی معافی کے بغیر تو اوپر بھی چھوٹ نہیں ملے گی اور آپ کو تو اس کی ضرورت سب سے زیادہ پڑے گی کیونکہ میں جانتی ہوں آپ کی زندگی میں پچھتاوا آئے گا اور بہت بری طرح آئے گا۔"

کاٹ دار، سرد طنزیہ، لہجہ لفظوں کے نشتر، نہیں معلوم نجمہ خالہ نے یہ سب کیسے برداشت کیا تھا۔ ماہین بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ نہیں پائی تھی۔ جس طرح آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور نجمہ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی ہی دیر تک یونہی ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھیں۔ پھر ہلکی

سی جھرجھری لے کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی نظریں کمرے کے بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے ابھی ابھی ماہین نکل کر گئی تھی۔



بالکل غیر ارادی طور پر ہی وہ محبت کے آنے کی دعا کرتی رہی تھی اور سرِ شام جب چھوٹی ممانی کی کھٹارا سی سلائی مشین کی آواز سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ وہ اچانک کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ حیرت سے گنگ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

''اے پتھر کی ہو گئی ہو کیا؟'' وہ اس کے چہرے پہ گری بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے اسے اپنے مخصوص لاابالی انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ بس ایک طویل سانس لے کر اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بال کانوں کے پیچھے اڑسنے لگی تھی۔

''اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی گھڑی قبولیت کی تھی تو میں چاند بھیا کی واپسی کی دعا مانگ لیتی۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر محبت کا ہاتھ پکڑ کر اسے باغ میں لے آئی۔

''مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

''جی جان سے حاضر ہوں۔'' اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر درخت کی اوپری شاخوں سے دو پکے ہوئے امرود توڑے اور اس کے عین سامنے بیٹھتے ہوئے نگاہیں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

''تمہیں معلوم ہے، چاند بھیا کہیں چلے گئے ہیں۔''

''کہاں چلے گئے ہیں؟'' اس کی حیرت بتا رہی تھی کہ وہ اس واقعہ سے یکسر لاعلم ہے۔

''مجھے نہیں معلوم بلکہ کسی کو کچھ بھی نہیں معلوم اور نہ کسی نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جس حالت میں گھر سے نکلے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ۔''

''ماہین! مجھے تفصیل سے بتاؤ۔'' وہ ادھ کھایا امرود ایک طرف اچھالتے ہوئے سیدھا ہوا تھا اور ماہین نے اسے تفصیل سے بتانا شروع کیا تو پھر ہر بات بتاتی چلی گئی۔ وہ سب باتیں بھی جو اماں نے اسے کسی سے بھی کہنے سے منع کیا تھا اور ساری بات سن کر محبت کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد اس سے گویا ہوا تھا۔

''اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''میں تم سے کیا چاہتی ہوں؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم میرے چاہنے کی بات کیوں کر رہے ہو محبت! کیا تم اپنے طور پر کچھ نہیں کرو گے۔'' اس کی بات سن کر وہ قدرے سنجیدگی سے آگے کو جھکا تھا۔

''میں اپنے طور پر بہت کچھ کر سکتا ہوں لیکن اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک تم نہیں چاہو گی۔''

''لیکن؟'' وہ جھنجھلا کر کچھ کہنے والی تھی کہ اس کی آنکھوں سے عیاں شوخی و شرارت اور ہونٹوں پہ پھیلی مسکراہٹ نے اسے سمجھایا کہ وہ بات کا مفہوم کس حد تک بدل گیا ہے اور اس بات کا ادراک ہوتے ہی اس کے چہرے کی رنگت ایک دم سرخ پڑ گئی تھی۔

''محبت تم۔'' اس نے اپنی بے اختیار کیفیت چھپانے کے لیے رخ موڑا تو محبت قہقہہ لگا کر ہنس دیا

تھا۔

''ٹھیک ہے، بھئی ٹھیک ہے۔'' وہ اس کے سر پہ چپت لگا کر وہاں سے چل دیا۔ وہ روہانسی ہو کر وہاں بیٹھی رہ گئی۔

''یہ بھی تو ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ میں نجانے کیوں امید لگا بیٹھی تھی۔'' وہ محبت کے اس طرح بات ٹالنے سے خفا تھی۔

پھر رات تک وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا اور اگلی صبح جب وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے لیے کچن میں آئی تو محبت اس سے بھی پہلے بیٹھا کباب اور پراٹھے اڑا رہا تھا۔

''جیو، نکی بوا، جیو۔'' وہ ہر نوالے کے ساتھ چٹخارے لے کر کہہ رہا تھا۔

''خدا کی قسم، ترس گیا میں اس ذائقے کو۔ ہاسٹل کے پھیکے سیٹھے کھانے کھا کر تو لگتا تھا، دنیا سے ذائقہ ختم ہو گیا ہے۔ لذت نامی چیز تو شاید عنقا ہو چکی ہے اور ماہین صاحبہ! آپ یوں کھڑی میرے کھانے کو نظر کیوں لگا رہی ہیں۔ آیئے، آپ بھی شریکِ طعام ہو جایئے۔''

وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ ماہین سوجی آنکھوں اور ستے ستے چہرے کے ساتھ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے ہاٹ پاٹ سے پراٹھے نکالنے لگی تھی۔ بقیہ چیزیں پہلے ہی ٹیبل پر موجود تھیں۔ وہ اس سے کافی ہٹ کر کرسی پہ بیٹھی تو محبت خوامخواہ ہی ہنس دیا۔ اس نے کڑوے تیوروں سے گھورا مگر وہ مکمل طور پر ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور کھیل رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر ناشتا کرنے لگی۔ چند لقمے زہر مار کرنے کے بعد وہ اٹھی تو محبت کی لمبی ٹانگیں راہ روکے ہوئے تھیں۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں۔۔۔'' وہ چائے کے گھونٹ پیتا ہوا یوں چونکا جیسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

''کسے مجھے کوئی تکلیف نہیں۔'' وہ کچھ لمحے بڑے ضبط سے اسے گھورتی رہی تب وہ کندھے اچکا کر قدرے سنجیدگی سے سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

''بیٹھو ذرا۔'' اس نے برابر کی کرسی کی طرف اشارہ کیا وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ سوچ کر وہاں بیٹھ گئی تھی۔

''تمام بڑے ہاسپٹلز میں پتا کروا چکا ہوں۔ چاند بھیا کا کہیں پتا نہیں چلا۔ پرائیوٹ کلینکس میں بھی وہ موجود نہیں ہیں، رتو سے ان کا شناختی کارڈ لے کر قریبی تھانے میں جمع کروا کے گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کروا دی ہے۔ چند ایک بڑے اخبارات میں بھی اشتہار دے دیا۔ اگر کسی کو معلوم ہوا یا خود انہوں نے پڑھا تو سیدھے یہاں چلے آئیں گے۔ یقین مانو، اشتہار کا مضمون اتنا دردناک ہے۔ میں اپنے طور پر بس اتنا ہی کر سکتا تھا۔ اب گلی گلی گھوم کر انہیں تلاش کرنا میرے بس میں نہیں، ہاں اگر تم کہو تو۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ محبت کا معنی خیز انداز اسے برا نہیں لگا تھا۔

''تھینک یو محبت! تمہاری اتنی مدد بھی بہت ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی تدبیر کارگر ہو جائے۔ وہ لوٹ آئیں اور۔۔'' اس کا دل فوراً ہی بھر آیا تو وہ پلکیں جھپک جھپک کر اپنے۔۔۔ آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''تمہیں بہت دکھ ہوا ہے چاند بھیا کے جانے کا؟'' وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے لمحہ بھر

کے لیے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں نہیں ہوا ان کے اس طرح چلے جانے کا دکھ۔"

"وہ اچھے انسان ہیں اور ان کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے۔ افسوس تو ظاہر ہے ہوتا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر نارمل سے لہجے میں بولا تھا۔

"تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ سب کے لیے بظاہر یہ عام سی بات ہے۔ ان کے چلے جانے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ لحاتی اور وقتی افسوس کے بعد سب نارمل ہو جاتے ہیں۔ مگر مجھ سے تو بہت کچھ چھن گیا ہے۔ محب! اتنا کچھ کہ میں تو وضاحت بھی نہیں کر سکتی۔ ایک باپ کی طرح مجھ سے محبت کی تھی انہوں نے۔ بھائی بن کر لاڈ اٹھائے۔ ہر خواہش پوری کی دوست بن کر ہر خوشی، ہر دکھ میں میرا ساتھ دیا تھا انہوں نے لیکن تم لوگ کس طرح سمجھو گے محب! کہ یہ سارے تعلق یہ سارے رشتے تو صرف مجھ سے قائم کیے تھے انہوں نے۔ تم لوگوں کے لیے تو وہ صرف چاند گر ہن تھے۔ اسکول لانے لے جانے والا ایک ڈرائیور۔ ادھر ادھر بھاگ بھاگ کر کام کرنے والا ایک ملازم۔ ایک فالتو پرزہ جس کی موجودگی تو فائدہ مند تھی لیکن غیر موجودگی بھی نقصان دہ نہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے آنسو بہانے لگی تھی۔ محب اسے تسلی دینے کے لیے لفظ ڈھونڈنے لگا تھا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ آنسو صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم کب تک ہو یہاں؟"

"آج شام کو چلا جاؤں گا۔" اس نے مختصراً بتایا تھا۔

"اور ہاں، تمہیں تو شاید اگلے ہفتے آنا تھا۔ کل اچانک کیسے آ گئے؟" وہ یونہی خیال آنے پر پوچھ بیٹھی۔

"بس دل نے گواہی دی، کوئی اداس ہے، پریشان ہے، سو میں چلا آیا۔" اس کے معنی خیز انداز پر وہ پھیکے سے انداز میں ہنس دی تھی، تب وہ شرٹ کا کالر درست کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سنو، کسی وقت اوپر جا کر اماں کی خاطر مدارات بھی کر آیا کرو، میرا بھلا ہو جائے گا۔" وہ شرارت کر رہا تھا مگر ماہین نے بالکل سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"ویسے تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماموں اور ممانی کی تنہائی کے خیال سے میں اکثر ان کے پاس چلی جایا کرتی ہوں اور تم اتنی فکر مت کیا کرو کیونکہ اب تو ممانی اپنی بھانجی کو مستقل یہاں لانے کا پروگرام بنا رہی ہیں تا کہ وہ جی بھر کے ان کی خاطر مدارات کر سکے۔"

اس نے بہت عام سے انداز میں جتاتے ہوئے اس پر بڑی ممانی کا نقطہ نظر واضح کیا تھا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"خاص طور پر تو کسی نے نہیں لیکن بات اڑتے اڑتے پہنچ ہی جاتی ہے ناں۔۔۔"

اس کے جواب پر محب کچھ دیر تک لب بھینچے اسے دیکھتا رہا تھا اور پھر سر جھٹک کر باورچی خانے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی ممانی کی اس خواہش سے بے خبر نہیں تھا۔



چاند بھیا کی گمشدگی کا واقعہ ایسا تھا کہ جس نے اس کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ دن

کا بیشتر حصہ وحشت اور اضطراب میں گزر جاتا۔ اخبار آتا تو اس کا ایک ایک صفحہ کھنگال ڈالتی۔ کالج آتے آتے ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتی اور کبھی یونہی رونے بیٹھ جاتی تو اماں ٹوک دیتیں۔

"مت یوں آنسو بہانے بیٹھ جایا کرو۔ دعا مانگا کرو، جہاں بھی ہو، ٹھیک ہو، خوش حال ہو۔"

"کیسے ہوں گے ٹھیک اور خوش حال۔ گھر سے نکلے تھے تو بخار سے پھنک رہے تھے۔ سر پہ زخم، جیب میں دھیلا نہیں۔ شہر میں کوئی دوست، رشتے دار نہیں۔ کہاں سے دوا لی ہو گی؟ کہاں سر چھپانے کو جگہ ملی ہو گی۔"

وہ دل کے سارے خدشے زبان پر لے آتی اور جب کبھی چھوٹی ممانی اسے روتا ہوا دیکھ لیتیں تو فوراً اسے اپنے سینے سے لگا لیتیں۔

"دل تو دکھتا ہے ناں آپا! آخر چاند نے گودوں کھلایا ہے اسے۔ اس کے ہاتھوں میں پلی بڑھی ہے۔ بھائی صاحب کی وفات کے بعد تمہیں تو اپنا ہوش بھی نہ تھا۔ ماہین کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟ کیا کھایا، پیا ہے، تمہیں خبر بھی نہ ہوتی تھی اور یہ سارا دن چاند کے کندھوں پر سوار پورے گھر میں مٹر گشت کیا کرتی تھی۔ وہ بھی سب بچوں میں سے اسی کا خیال زیادہ رکھتا تھا۔ کبھی سودا سلف لاتے ہوئے روپوں میں ڈنڈی مار جاتا اور ماہین کے لیے چاکلیٹ، ٹافیاں لے آتا۔ میں جانتی تھی۔ اپنی ذات پر تو کبھی ایک روپیہ بھی خرچ نہ کرے گا۔ اس لیے خاموش رہتی۔ آہ لیکن خیر اب کیا ہو سکتا ہے؟ تو فکر نہ کیا کر ماہین! وہ نیک بچہ ہے، اللہ نے چاہا تو سیدھی راہ پہ ہی چلے گا۔ تو اپنی پڑھائی پہ دھیان دیا کر۔" ممانی زبردستی اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیتیں۔

رتو کا اس سے بھی بڑھ کر برا حال تھا۔ ہنسنا بولنا، کھانا، پینا نکی بوا سے لڑنا جھگڑنا کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں تھا۔ وہ بس سرخ سرخ آنکھیں لیے ادھر سے ادھر بے چین روح کی طرح گھومتی رہتی یا پھر گھنٹوں نظر ہی نہ آتی، تب تنگ آ کر ماہین نکی بوا سے استفسار کرتی۔

"اے کیا معلوم اس اللہ ماری کو کیا بیماری ہے۔ نہ نہانے دھونے کا پتا ہے نہ کپڑے بدلنے کا ہوش، دل چاہے تو اٹھ کر ایسی کام میں لگتی ہے کہ گھنٹوں نہیں تھکتی نہ دل چاہے تو لاکھ کہتی رہوں ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اللہ جانے کیا روگ لگ گیا ہے اس کو۔" نکی بوا اس کے معمولات سے عاجز آ چکی تھیں۔

"بوا! ایسے مت کہو، ظاہر ہے چاند بھیا کے جانے کا اسے بھی افسوس تو ہوا ہو گا ناں۔" وہ افسردگی سے کہہ دیتی مگر نکی بوا کو اس کی بات پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔

"اے لو! جب وہ یہاں تھا تو اس نے کبھی سیدھے منہ اس سے بات نہ کی تھی۔ اب کیا غم لگا ہے کمبخت کو۔"

"کوئی کچھ بھی کہے، رتو اور ماہین کے سوا اور کوئی نہیں جو اس حادثے سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہو۔" یہ ماہین کا خیال تھا جسے آنے والے وقت نے مکمل طور پر غلط ثابت کر دیا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ یقیناً کوئی تیسرا فرد بھی تھا جو ان دونوں سے کہیں زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔



نجمہ خالہ کے انداز کتنے دنوں سے ہی بدلے بدلے لگ رہے تھے، ان کے معمولات میں اس قدر فرق آ گیا تھا کہ ماہین کے ساتھ ساتھ گھر کے باقی افراد بھی نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ معلوم نہیں کیوں

لیکن اب وہ خلافِ عادت زور زور سے بولنے لگی تھیں۔ جہاں صرف مسکرانے کی ضرورت ہوتی وہاں بھی قہقہہ لگانے لگتیں۔ ایک دم مصنوعی اور کھوکھلا قہقہہ اور کبھی تو یوں ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اچانک چونک جاتیں سب خاموش بیٹھے ہوتے اور وہ پوچھتیں۔

"کسی نے کچھ کہا کیا؟" کبھی بیٹھے بیٹھے خود ہی بڑبڑانے لگتیں۔ لباس پر بھی پہلے سی توجہ نہ رہی تھی ہر دوسرے روز کلف لگا کر سوٹ پہننے والی نجمہ خالہ اب اکثر ملگجے سے سوٹ میں دکھائی دے جاتی تھیں۔ گھر کے ہر کام میں مداخلت اور بے جا روک ٹوک میں بھی کسی حد تک کمی آ گئی تھی۔ ماہین سے ان کی بول چال چاند بھیا کے جانے سے لے کر اب تک تقریباً بند تھی لیکن اس روز ماہین کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب وہ اپنی کتابیں اٹھائے اس کے پاس آ بیٹھی تھیں اس نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا اور پھر کچھ بولے بغیر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی تب وہ خود ہی اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"ماہین وہ چاند گرہن کتنا عجیب انسان تھا ناں؟"

ماہین چونک کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔ بات کا جواب تو کیا دینا تھا وہ ان کے منہ سے چاند بھیا کا نام سن کر ہی حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"میں اسے کتنا ڈانٹا کرتی تھی۔ مارتی بھی تھی لیکن تعجب ہے کہ اس نے مجھے کبھی بھی روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے دوگنی قوت رکھتا تھا۔ میرا اٹھایا ہوا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک سکتا تھا۔ پلٹ کر جواب دے سکتا تھا مگر اس نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ، ہر بار باادب ہو کر میرے سامنے آیا کرتا تھا۔ جھکی آنکھوں اور جھکے سر کے ساتھ، کبھی نگاہ اٹھاتا بھی تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت، حقارت، غصہ نہیں بلکہ نرمی کا ایک تاثر ابھر آتا تھا مگر کیوں ماہین؟ کسی جانور پر بھی ظلم کرو تو وہ پلٹ کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ کیوں نہیں؟" وہ الجھے الجھے سے انداز میں بول رہی تھیں۔

"اس لیے نجمہ خالہ کہ وہ معاف کر دینے کا وصف رکھتا تھا اور جہاں معاف نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں معاملہ خدا کے سپرد کر دیتا تھا۔" اس نے دل ہی دل میں جواب دیا تھا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آخر میں اتنی دیر سے اس کی باتیں کیوں کر رہی ہوں بلکہ میں اس کے بارے میں سوچ بھی کیوں رہی ہوں؟"

وہ بہکے بہکے سے انداز میں بول رہی تھیں پھر یکا یک ہی کتابیں اٹھا کر تیز رفتاری سے چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، ماہین حیران پریشان سی کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اور کچھ روز بعد اسے حیرت کا شدید جھٹکا اس وقت لگا تھا جب اس نے نجمہ خالہ کو چاند بھیا کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا وہ بجلی کی سی تیزی سے ان کے پیچھے لپکی تھی۔ خلافِ توقع اسے دیکھ کر انہوں نے کسی ناگوار ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ بہت ہی نرم لہجے میں اس سے بات کرنے لگی تھیں۔

"دیکھو ذرا یہ کمرا، یہ کسی انسان کے رہنے کے لائق ہے۔ تو بہ اس نے کس طرح اپنی زندگی کے بائیس سال یہاں اس اصطبل میں گزارے ہوں گے اور بلب بھی تو نہیں ہے یہاں، لیکن نہیں۔" انہوں نے جیسے کچھ سوچا تھا۔

"بلب تو تھا یہاں لیکن میں نے اتروا دیا تھا۔ ایک، دو بار نہیں جتنی بار اس نے لگایا تھا، اتنی دفعہ میں نے بلب توڑ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کمرے میں روشنی ہو۔۔۔ مجھے اس کمرے میں پھیلا

اندھیرا سکون دیتا تھا لیکن ماہین! وہ، وہ اس اندھیرے میں کیسے رہتا ہوگا، تاریکی میں تو دم گھٹنے لگتا ہے ناں۔"

وہ روہانسے لہجے میں بولے چلی جا رہی تھیں۔ ماہین قدرے خوفزدہ سی ہو کر بھاگی بھاگی اماں کے پاس آئی۔ اس کے کہنے پر اماں فوراً نجمہ خالہ کے پاس چلی گئیں۔ ذرا دیر بعد آئیں تو الٹا اسے ہی ڈانٹنے لگیں۔

"وہ تو اچھی بھلی باتیں کر رہی ہے ماہین! تم نے تو مجھے خوامخواہ ہی ڈرا دیا۔"

اماں نے گویا سکھ اور سکون کا سانس لیا تھا لیکن یہ سکون اس وقت غارت ہو گیا تھا جب نجمہ خالہ کی ایک دوست نے آ کر بتایا۔

"معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا ہے اسکول میں خراب کارکردگی کے باعث اسے دو مرتبہ نوٹس دینے کے بعد بالآخر خارج کر دیا گیا ہے۔" یہ خبر سن کر گھر بھر کے افراد میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی نجمہ خالہ البتہ اس کے بعد اپنے کمرے میں تقریباً بند ہو کر رہ گئی تھیں۔



محب اس دفعہ پورے ڈیڑھ ماہ بعد آیا تھا اور اس نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اس بار ڈھیر سارا سونے، کھانے اور رہنے کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ پہلے کئی دن تک تو اس کی شکل ہی دکھائی نہ دی تھی ہر بار استفسار کرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ سو رہا ہے۔ کچھ روز جی بھر کے سو لینے کے بعد کھانے کی باری آئی تھی۔

نتیجتاً وہ چوبیس گھنٹے کچن میں نظر آنے لگا تھا۔ نکی بوا کی الگ شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی نت نئے تجربے کرتا اور ان سے بھی کرواتا۔ اس کی اس روٹین سے باقی سب کا تو پتا نہیں، چھوٹی ممانی البتہ بہت تنگ آ گئی تھیں۔ ایک روز چڑ کر کہہ دیا۔

"یہاں میرا راشن ختم کرنے سے بہتر ہے، نکی بوا کو اوپر لے جاؤ۔" اور وہ ان کی بات سن کر برا ماننے کے بجائے ہنستا ہوا پیچھے سے آ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔

"ارے واہ چچی! اتنے بڑے وجود میں اتنا چھوٹا سا دل اور پھر میں تو اپنے چچا کا کھاتا ہوں۔"

"کھاؤ بیٹا! چچا کا جس طرح چاہے کھاؤ مگر میں کہتی ہوں۔ کبھی کبھی باپ کا بھی کھا لینا چاہیے۔"

چھوٹی ممانی جان بوجھ کر چوٹیں کرتیں اور اس کے قہقہے بلند سے بلند ہوتے چلے جاتے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی آمد سے نہ صرف اوپر بلکہ نیچے کے پورشن میں بھی رونق سی آ گئی تھی۔

اس کے قہقہوں نے گھر میں پھیلے سناٹے کو چٹخا دیا تھا۔ پہلے بھی ماہین اور رتو کے سوا کون تھا گھر میں جو اودھم مچائے رکھتا۔ ان دونوں کے دم سے رونق تھی مگر چاند بھیا کے جانے کے بعد رتو کو تو چپ سی لگ گئی تھی۔ جتنی بات پوچھو، اتنا جواب آ جاتا تھا۔ ماہین تھی تو وہ چاند بھیا کے لاپتا ہونے کے بعد نجمہ خالہ کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر گم صم سی رہنے لگی تھی۔ اس دن بھی وہ صحن میں بیٹھی کتاب سامنے رکھے نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی جب وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پڑھائی کیسی ہو رہی ہے، او، ہو رتو بی بی! آپ کا یہ ہتھوڑا تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہو سکتا۔" اس نے پلٹ کر رتو سے کہا جو چھوٹی ممانی کے کہنے پر سارے بادام لیے چھوٹے سے ہتھوڑے سے توڑ رہی تھی اور اس کی بات پر یونہی ہتھوڑا روک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میرا مطلب ہے اگر ایک کپ کافی۔" اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی رتو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"رتو! میرے لیے بھی بنا لینا۔" ماہین نے کہا تو محب حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ تم نے کب سے کافی پینی شروع کر دی؟"

"آج سے بلکہ ابھی بھی یونہی دل چاہ رہا ہے پینے کو۔"

"ہوں ویری انٹرسٹنگ۔" وہ کرسی جھلانے لگا تھا۔

میرے رنگ میں رنگنے والی
پری ہو یا پریوں کی رانی

اس نے یونہی لکیریں کھینچتے ہوئے نگاہ اٹھا کر دیکھا، وہ اسی پر نظریں جمائے گنگنا رہا تھا۔

"رتو! میرے لیے کافی مت بنانا، میں نہیں پیوں گی۔" اس نے وہیں سے تلملا کر ہانک لگائی تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"ہائی واوے، تم اتنا چڑتی کیوں ہو؟" وہ اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہاری حرکتیں ہی اتنی لوفرانہ ہوتی جا رہی ہیں کہ۔۔۔"

ایک دم عجیب و غریب قسم کی آوازیں سنائی دیں تو وہ فوراً خاموش ہو گئی اور اسی دم چہرے کی بدلتی رنگت کے ساتھ نجمہ خالہ کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ محب نے پلٹ کر ایک نظر چھوٹی ممانی کو دیکھا جو اپنے کمرے سے نکل کر نجمہ خالہ کے کمرے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سیدھا ہوا تو ماہین اضطرابی انداز میں اپنے ناخن چبا رہی تھی۔

"میرا خیال تھا، میں اس دفعہ گھر آؤں گا تو سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو چکا ہو گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور ٹوٹے پھوٹے ناخنوں کا جائزہ لینے لگا۔ ماہین نے شرمندہ ہوتے ہوئے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

"پتا ہے محب! نجمہ خالہ کی یہ حالت بعض اوقات مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے۔ اتنی شدت سے انہیں دورے پڑنے لگتے ہیں کہ لگتا ہے اب یہ خود کو زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ اپنا چہرہ نوچ لیتی ہیں، بال کھینچتی ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے ساتھ ہر وہ ظلم کرتی ہیں جو کبھی انہوں نے چاند بھیا پر کیا تھا۔ کبھی خود کو اندھیرے کمرے میں بند کر لیتی ہیں۔ اور پھر خود ہی خوفزدہ ہو کر چلانے لگتی ہیں، کبھی پہروں بھوکی بیٹھی رہتی ہیں کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ اتنی عجیب سی حالت ہو گئی ہے ان کی۔ یقین مانو میں تو سب کچھ بھول کر دن رات یہی دعا کرتی ہوں کہ کاش ایک۔۔۔"

"کسی سائیکاٹرسٹ کو نہیں دکھایا۔۔۔؟"

"ماموں کے جاننے والے ہیں ایک سائیکاٹرسٹ ان ہی سے رابطہ کیا ہے ابھی تو وہ گھر آ کر نجمہ

خالہ کو دیکھ گئے تھے۔ آئندہ شاید ان کے کلینک پر لے جانا پڑے گا۔ لیکن سائیکاٹرسٹ کیا کرے گا۔ محب! یہ تو ان کا احساس جرم ہے جو اب پچھتاوے میں بدل چکا ہے۔ تمہیں پتا ہے جب بچپن میں، میں چاند بھیا کو نجمہ خالہ کی کسی زیادتی کا شکار ہوتے دیکھتی تو کہتی

"اللہ انہیں ضرور سزا دے گا۔" اور چاند بھیا فوراً مجھے ٹوک دیا کرتے تھے۔

"نہیں گڑیا! ایسے نہیں کہتے۔ دعا کیا کرو، اللہ ہر کسی کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے۔ کسی انسان کی کیا مجال کہ اللہ کی ناراضی کا سامنا کر سکے۔"

اس وقت ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن اب نجمہ خالہ کو دیکھتی ہوں تو رو رو کر یہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہر کسی کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے۔"

"آمین۔" محب نے فوراً ہی اس کی بات کے جواب میں کہا تھا اور پھر نجمہ خالہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔



وہ نکی بوا کے کہنے پر رتو کو سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ چاند بھیا کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو سیدھی ادھر ہی چلی آئی رتو نے آہٹ پر گھبرا کر پلٹ کے دیکھا لیکن پھر اسے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتی ہوئی دوبارہ چپکے چپکے صفائی کرنے لگی۔

"کیوں ہلکان کرتی رہتی ہو خود کو، اب کون آئے گا یہاں اس آلائش سے پاک کمرے میں رہنے کے لیے۔ پنچھی تو کسی اور ہی دیس کی جانب اڑ گیا۔" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سرخی مائل زرد شعاعیں براہ راست کھڑکی کے ذریعے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

رتو اب جھاڑو چھوڑ کر جھاڑن پکڑ چکی تھی۔ اسے اتنے انہماک سے صفائی ستھرائی میں مصروف دیکھ کر اسے ہلکے سے افسوس نے آ گھیرا۔

"کیا ہوتا رتو بی بی! جو تم اتنی زحمت ان کی موجودگی میں کر لیا کرتیں اور کچھ نہیں تو بے چارے چاند بھیا اس کے احسان مند ہی ہو جاتے۔"

وہ چاند کی ایک کتاب اٹھا کر کھڑکی میں بیٹھ گئی تھی اور یونہی اس کی ورق گردانی کرتی رہی۔ کتاب میں جگہ جگہ چاند بھیا نے سیاہ روشنائی سے اپنے دستخط کیے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ادھورا چاند بنا ہوا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے رتو! چاند بھیا لوٹ کر آئیں گے؟" اس نے کتاب بند کر کے گود میں رکھی اور نارنجی آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے رتو سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رتو کا جواب ملا تو وہ بے اختیار ہی پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ زرد شعاعوں کی زد میں کھڑی رتو بہت مضمحل اور اداس لگ رہی تھی۔ ماہین سر جھٹک کر ہلکا سا مسکرا دی۔

"تم ہمیشہ سے ہی گھنی اور سیسنی ہو، دل کے معاملات کی خبر ہی کہاں ہونے دیتی ہو۔" رتو حسب توقع خاموش سی رہ گئی تھی اور ماہین سوچ میں ڈوب گئی۔

کتنا بدل گئی تھی رتو چاند بھیا کے جانے کے بعد۔ بالکل خاموش اداس مٹی کی کسی مورت کی طرح

اوراس کی اس تبدیلی پر سب ہی حیران تھے۔ اب نہ محلے کی خبریں سننے کو ملتی تھیں نہ نکی بوا کے ساتھ جھگڑنے کی۔ چھوٹی ممانی اس کی دلچسپ اور چکنی چپڑی باتیں سننے کو ترس گئی تھیں۔ بڑے ماموں آتے جاتے اس سے پوچھتے کہ اب وہ گھر بھر کی شکایتیں لے کر ان کے پاس کیوں نہیں آتی اور اس کی اسی حالت نے تو ماہین کو سمجھایا تھا کہ اس کا چاند بھیا کے ساتھ کیا رشتہ، کیا تعلق تھا اور رتو کے خاموش بہتے آنسوؤں نے ہی اس ہمدرد کا نام ماہین پر عیاں کیا تھا اور اتنے عرصے کے بعد ہی تو ماہین سمجھ پائی تھی کہ چاند بھیا کو بیسن کے لڈو کون پہنچاتا تھا؟ ان کے تکیے کے نیچے رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھے رومال کون رکھتا تھا اور کون تھا جو سردی کی راتوں میں اندھیری کوٹھری میں بیٹھ کر چاند کی کرنوں میں ان کے لیے سویٹر بنا کرتا تھا اور جب اس نے اپنے شک کی تصدیق کے لیے رتو سے پوچھا تھا۔

''رتو! تم چاند بھیا سے محبت کرتی تھیں۔''

تو رتو نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا، بس اس کے کاندھے سے سر ٹکا کر بے آواز رونے بیٹھ گئی تھی اور اس کے جدائی کی بے قرار خوشبو سے مہکتے آنسوؤں نے اس کے دل کی ساری خبر ماہین کو کر دی تھی۔

''چاند بھیا تمہاری محبت سے بے خبر نہیں تھے۔ ہے ناں رتو! اپنے ہمدرد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اتر آتی تھی اور محبت میں تو بہت کشش ہوتی ہے ناں رتو! تم دعا کیا کرو دیکھ لینا اگر کبھی وہ لوٹے تو صرف اور صرف اسی محبت کی خاطر لوٹیں گے۔''

اس نے رتو سے کہا تھا۔ حالانکہ رتو سے کہنے کی ضرورت ہی کب تھی وہ تو سرتاپا دعا بن کر رہ گئی تھی۔



معلوم نہیں کتنا عرصہ بیت گیا تھا۔ چاند بھیا کو اس گھر سے گئے ہوئے۔

دو سال، تین سال، چار سال یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔ ماہین نے تو حساب کتاب ہی رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی بہرحال اپنی ڈگر پہ آ ہی گئی تھی۔ لیکن ان کی یاد تھی کہ اب بھی کسی صورت بھلائے نہیں بھولتی تھی اور وہ جو ایک سلسلہ تھا ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ ان کے لوٹ آنے کی دعاؤں کا تو اب اس میں بھی وہ شدت اور باقاعدگی کہاں رہی تھی۔

''آجائیں گے خود ہی اگر آنا ہوا؟'' وہ اپنی دعاؤں کے رد ہونے پر چڑ جاتی۔ سوچ لیتی، اب ان کے آنے کی کبھی دعا نہیں مانگے گی۔ لیکن پھر بھی امید کا دوسرا سرا ہمیشہ دعا سے جڑا رہتا تھا۔

اور ایک وہ رتو بھی جواب بھی انگلیوں پر دن گنتی تھی اور ہر بار گنتی میں اضافے پر بھی تھکتی نہیں تھی۔ پہلے سے زیادہ پُر امید ہو جاتی تھی۔ دعاؤں میں کچھ اور شدت آنے لگتی اور زندگی میں کبھی نماز نہ پڑھنے والی رتو کو وہ تہجد کی نماز کے لیے اٹھتے دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔

''یا اللہ! کیسی لگن ہے یہ؟ جو کسی طور کم ہونے میں نہیں آتی۔''

اور پھر رتو کی ریاضتوں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں چاند بھیا سے شکوہ کرنے بیٹھ جاتی۔

''کس دیس ٹھکانہ کر لیا چاند بھیا؟ کیا ایک بار بھی پلٹ کر آنے کو دل نہیں چاہا۔۔۔؟'' اور پھر ایک وہم سا دل میں کنڈلی مارے بیٹھ جاتا۔ وہ گھبرا کر رتو سے پوچھتی۔

''رتو! چاند بھیا زندہ تو ہوں گے ناں؟'' اور جواباً رتو یوں دہل کر اس کی طرف دیکھتی کہ وہ بری

طرح شرمندہ ہو کر رہ جاتی۔

''اب کبھی چاند بھیا ادھر آئے تو وہ بہت حیران ہوں گے اس گھر کو دیکھ کر، اس کے در و دیوار کو دیکھ کر اور سب سے بڑھ کے اس گھر کے مکینوں کو دیکھ کر سب ہی کچھ تو پہلے سے بہت بدل گیا ہے ناں؟''

وہ بات بدل دیتی اور واقعی سب ہی کچھ تو پہلے سے بدل گیا تھا۔ خود ماہین بھی پہلے جیسی کب رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، چاند بھیا گئے تو اس وقت وہ فرسٹ ایئر میں تھی۔ کاندھوں پر جھولتے بالوں کی دو پونیاں بنا کر رکھتی تھی اور اب وہ بی اے کے بعد گھر میں بیٹھی تھی بالوں کی چوٹی گھٹنوں کو چھونے لگی تھی اور اماں اس کے رشتے کے لیے چوبیس گھنٹے فکرمند رہنے لگی تھیں۔

بڑی ممانی کے جوڑوں کا درد بڑھ گیا تھا۔ اب وہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کے چکر محض خواب بن کر رہ گئے تھے، ان کی تنہائی کے خیال سے نکی بوا سارا دن ان کے پاس رہتیں۔

بڑے ماموں کی اپنی کاروباری مصروفیات تھیں۔ چھوٹے ماموں البتہ مزے میں تھے۔ عبید بھیا کی جاب کے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور آج کل دوستوں کی محفل ہی ان کا مستقل ٹھکانا تھا۔ عبید بھیا کی شادی کے بعد نہ صرف سیما بھابھی اس گھر میں آ چکی تھیں بلکہ اب تو ننھا فراز بھی اس گھر کی رونق میں اضافہ کر چکا تھا۔ زین کو اسلام آباد میں جاب مل گئی تھی۔ چھوٹی ممانی سب کچھ سیما بھابھی کے سپرد کر کے اسلام آباد کے موسموں سے لطف اندوز ہونے کو زین کے پاس جا پہنچی تھیں۔ اسد اپنا باکسنگ کلب کھول چکا تھا اور اس کی غیر مستقل مزاجی اور آوارہ گردی ہنوز دہی تھی۔

نجمہ خالہ مثالِ عبرت بنی اپنے کیے کی سزا کاٹ رہی تھیں۔ مسلسل نفسیاتی علاج سے ان کے دوروں میں کمی تو آ گئی تھی مگر پھر بھی ان کی حالت کو نارمل ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

باقی رہ گیا محبّ تو وہ ایم بی اے کی ڈگری لینے یونیورسٹی جا پہنچا تھا مگر اس کے انداز و اطوار میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ماہین کا کترایا کترایا سا انداز بھی اس کی وارفتگی میں کمی کا باعث نہیں بن سکا تھا۔ ماہین چونکہ بڑی ممانی کے تیور پہچانتی تھی۔ اس لیے وہ کسی صورت اس کی پذیرائی کے لیے تیار نہیں تھی۔

''امی صرف اس لیے اپنی بھانجی کے لیے کہہ رہی ہیں کیونکہ ابھی تک میں نے انہیں اپنی پسند کے بارے میں آگاہ نہیں کیا۔ تم اگر ذرا سا اشارہ دے دو تو میں آج۔''

ایک بار ممانی نے واشگاف انداز میں محبّ اور اپنی بھانجی کی شادی کا ذکر کیا تو محبّ نے وضاحت کی تھی، وہ تب بھی بات کو مذاق میں ٹال گئی تھی۔

''کیسے دے دوں اشارہ اگر کل کلاں تم سے بہتر شخص مل گیا مجھے تب۔۔۔'' اور اس کی بات سن کر محبّ کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا تھا۔

''اور تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' وہ بظاہر بڑے ضبط سے بولا تھا۔ ''اور بالفرض ہو بھی گیا تو کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں جان لے لوں گا اس ''بہتر شخص'' کی اور شاید تمہاری بھی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا راہ میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکر لگا کر وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ خوف زدہ سی اپنی جگہ پر بیٹھی رہ گئی تھی۔



سمیعہ کا جدہ سے خط آیا تھا۔ وہ لے کر اوپر ممانی کے پاس گئی تو انہوں نے وہیں بٹھا لیا۔

"پڑھ کر سنا دو، اب پہلے جیسی نظر نہیں رہی۔" انہوں نے کہا تو وہ خط پڑھنے لگی۔ خاصا طویل خط تھا جس میں بچوں کی شرارتوں سے لے کر اکلوتی نند کی چالاکیوں اور میاں صاحب کی ناانصافیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ آخر میں البتہ چند سطریں لکھ کر یقین دہانی کرا دی گئی تھی کہ یہ خط اس وقت لکھا گیا تھا جب کھانا پکنے میں دیر ہونے پر میاں سے جھگڑا ہوا تھا۔ لیکن اب سب خیریت ہے۔ دوبارہ خط لکھنے کا وقت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہی خط بھیجا جا رہا تھا جیسے تیسے ماہین نے تین پرچوں پر مشتمل یہ خط مکمل کیا تھا مگر ممانی کی نجانے کیوں تشفی نہ ہو سکی تھی۔ مجبوراً اسے دوبارہ یہ عمل سرانجام دینا پڑا۔ وہ تو شکر ہوا کہ تیسری مرتبہ فرمائش نہیں کی گئی صرف اتنا کہا۔

"جانے سے پہلے میری عینک ڈھونڈ کر مجھے دے جاؤ۔"

اسے معلوم تھا۔ اب تیسری دفعہ یہ خط وہ خود پڑھیں گی، لہٰذا عینک ان کے ہاتھ میں تھما کر وہ فوراً نیچے چلی آئی تھی۔ ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا مگر برآمدے میں نجمہ خالہ کو ٹہلتے دیکھ کر وہ بے اختیار ہی ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ ننگے پاؤں، عام سے لباس میں کسی بھی سویٹر، جرسی کے بے نیاز وہ برآمدے میں دیوانوں کی طرح ادھر سے اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ بے اختیار ہی ان کی طرف بڑھی۔

"نجمہ خالہ! نجمہ خالہ۔" اس کے پکارنے پر بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئیں تو وہ فوراً ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"نجمہ خالہ کیا کر رہی ہیں یہاں؟" اس نے پوچھا تو وہ بغیر جواب دیے اسے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھنے لگیں تب اس نے دونوں ہاتھ ان کے کاندھوں پہ رکھ کر انہیں روک دیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے خالہ آپ کو، اتنی سردی ہے اور آپ۔۔۔ آیئے میرے ساتھ کمرے میں چلیں۔"

وہ زبردستی ان کا بازو تھام کر انہیں کمرے میں لے آئی پھر دروازہ بند کر کے پلٹی تو وہ مضطرب سے انداز میں کمرے میں یوں گھوم رہی تھیں جیسے کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہی ہوں۔

"ادھر بیٹھیں۔ آپ مجھے بتائیں، کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟" اس نے انہیں بیڈ پہ بٹھا کر لحاف ان پر ڈالا۔

"ماہین! ماہین! وہ کہاں چلا گیا؟" وہ ایک دم ہی اس کا ہاتھ تھام کر روہانسے لہجے میں بولیں تو ماہین بے اختیار ہی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی تھی۔

"وہ اب آ کیوں نہیں جاتا، پہلے تو کبھی اتنا ناراض نہیں ہوا تھا مجھ سے۔ میں اسے مارتی تھی۔ برا بھلا کہتی تھی مگر وہ کبھی نہیں گیا تھا۔ پھر اب کیوں چلا گیا اور چلا گیا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا۔"

وہ بے قراری سے اپنا ہاتھ بستر پہ مار رہی تھیں۔ ماہین بس چپ چاپ انہیں دیکھے گئی۔ وہ جانتی تھی، نجمہ خالہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں مگر پھر بھی اس کے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا۔

"پتا نہیں ماہین! میں رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں پاتی۔ طرح طرح کے وہم ستاتے ہیں مجھے، اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں ماہی! ڈرنے لگتی ہوں، تب وہ قہقہے لگانے لگتا ہے۔ میں رونے لگوں تو وہ بھی رونے لگتا ہے اور پھر اس کی سسکیوں کی آواز رات بھر میرے کمرے میں گونجتی رہتی ہے۔" نجمہ خالہ اب بے آواز رو رہی تھیں۔

"میں نے اس پر بہت ظلم کیے تھے ناں۔ بہت زیادہ لیکن اب میں رات رات بھر اس کی سلامتی کی، واپسی کی دعائیں کرتی ہوں۔ لمحہ لمحہ انتظار کرتی ہوں اس کا۔ وہ بس ایک بار آ جائے، صرف ایک بار، میں اس سے معافی مانگ لوں پھر اس کا جہاں دل چاہے وہ چلا جائے اور اگر وہ نہ آیا۔۔۔ اگر وہ نہ آیا ماہین! تو خدا کی قسم نہ میں مر سکوں گی نہ جی سکوں گی۔" نجمہ خالہ کے بدن پر لرزہ طاری تھا اور ماہین گنگ بیٹھی تھی۔

"جاؤ اسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤ۔ میں نے اس کے ساتھ بہت برا، کیا تھا۔ بہت برا معلوم نہیں وہ کہاں گیا ہوگا۔ کس حال میں ہوگا۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہوگا یا۔" نجمہ خالہ خود ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

"وہ تمہاری ہر بات مانتا تھا ماہین! خدا کا واسطہ ہے جاؤ اور اسے ڈھونڈ لاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ دامن پھیلاتی ہوں۔ اس سے کہو صرف ایک بار آ جائے۔ صرف ایک بار آ کر مجھے معاف کر دے۔ صرف ایک بار۔"

وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی تھیں۔ ماہین لب بھینچے انہیں بازوؤں میں لیے تھپکتی رہی۔ نجانے کتنی دیر گزر گئی، تھک کر نجمہ خالہ نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ وہ پُر شفقت انداز میں ان کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ بند آنکھوں سے پھسلتے بے رنگ آنسوؤں کو اپنی انگلیوں میں سمیٹتی رہی۔ جب نجمہ خالہ کی بوجھل پلکیں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں تب وہ ان کا لحاف درست کر کے باہر نکل آئی۔ انہیں اب بہت دیر تک سونا تھا۔



محبّ اپنے فائنل ایگزام سے قبل گھر آیا تھا۔ ماہین لاشعوری طور پر اس کے نیچے آنے کی منتظر رہی مگر اسی شام نکی بوا کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ واپس بھی چلا گیا ہے۔ ماہین حیران سی رہ گئی۔ اس طرح آج سے پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ چاہے کھڑے کھڑے اس کے پاس آتا لیکن اس طرح بغیر ملے کبھی واپس نہیں گیا تھا۔

"لگتا ہے، بڑی صاحبہ کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ میں تو اس کے لیے مرغ کی کڑاہی بنا رہی تھی۔ پلاؤ دم پر تھا۔ وہ بڑی صاحبہ کے کمرے سے نکلا۔۔۔ تن فن کرتا اپنے کمرے میں گھسا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلتا بنا، دو چار کتابیں پڑھنے کو میز پہ رکھی تھیں۔ وہ بھی جوں کی توں دھری رہ گئیں۔ بات کیا ہوئی؟ اس کا مجھے علم نہیں۔" اس نے نکی بوا کو کہتے سنا تو وہ ٹھٹھک سی گئی۔ دل میں شک سا ابھرا۔

"کہیں اس نے ممانی کے سامنے میرا نام تو نہیں لے دیا۔ وہ تو دن رات ڈاکٹر بھانجی، ڈاکٹر بھانجی کا راگ الاپتی رہتی تھیں۔ محبّ کے انکار کا سن کر تو بھڑک اٹھی ہوں گی۔"

دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے تو اس نے رتو کو اوپر بھیجا اور خود اس کی جگہ ہنڈیا بھوننے لگی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد رتو واپس آئی تھی۔

"صورتِ حال کافی گمبھیر لگ رہی ہے۔" رتو نے چمچہ اس کے ہاتھ سے لے کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

"بڑی صاحبہ خاصے خراب موڈ میں ہیں۔ سرتاپا چادر تانے دھوپ میں لیٹی ہیں۔ میری تو کسی بات

کا ڈھنگ سے جواب بھی نہیں دیا۔"

"محبّ کے بارے میں نہیں پوچھا تم نے؟ اتنی جلدی کیوں چلا گیا؟" رتو نے آنچ دھیمی کرتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے میز کی سطح کو اپنے ناخن سے کھرچتی گویا خود سے الجھ رہی تھی۔

"تم اس کے اتنے جلدی جانے سے پریشان ہو؟" وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔

"نہیں۔ میں اس وجہ سے پریشان ہوں جس نے اسے اتنی جلدی جانے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"تم جانتی ہو؟" رتو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اندازہ ہے اور سوچتی ہوں اگر اس معاملے میں وہ میرا نام لے بیٹھا تو میرے لیے اس گھر میں رہنا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ سب کہیں گے، ماہین کی وجہ سے محبّ ماں کے سامنے اٹھ کھڑا ہوا۔" وہ واقعی پریشان تھی۔

"لیکن اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے ماہین! پھر کوئی تمہیں کیوں قصوروار ٹھہرائے گا۔" رتو نے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے تسلی دی تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی۔

"ہاں، بظاہر میرا کوئی قصور نہیں نکلتا لیکن کل کو جب ممانی کو احساس ہوا کہ وہ اپنی ڈاکٹر بھانجی کو اپنے ہاں اس لیے بیاہ کر نہیں لا سکتیں کہ ان کا اکلوتا بیٹا میری محبت میں پور پور ڈوب چکا ہے تو یقین مانو، سارے قصور میرے ہی نام نکلیں گے۔ حالانکہ میں نے کتنی کوشش کی ہے محبّ کو اپنی طرف بڑھنے سے روکنے کی۔ ہمیشہ ہی اس کے جذبات کے سامنے بند باندھتی آئی ہوں بچپن سے اس گھر میں رہی ہوں، جانتی ہوں کہ ممانی کا جھکاؤ ہمیشہ ہی اپنے میکے والوں کی طرف زیادہ رہا ہے اور پھر محبّ ان کا اکلوتا بیٹا سارے ارمان اسی سے تو وابستہ ہیں لیکن محبّ۔۔۔ محبّ اسرار اپنے ارادوں سے ٹل جائے ایسا پہلے کبھی ہوا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی تھی۔

"ماہین۔۔۔! اگر محبّ ممانی کی ضد سے مجبور ہو کر ان کی بات مان گیا۔۔۔ تو۔۔۔؟" رتو جھجکتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"تو۔۔۔؟" ماہین نے رتو کو جواب دیے بغیر ہی یہ سوال اپنے دل سے کیا تھا۔ وہاں مہیب چپ کے سوا اور کوئی جواب اسے نہیں مل سکا تھا۔



دسمبر کا آغاز تھا مگر سردیاں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھیں۔ ابر آلود آسمان پر سورج اپنی چھب دکھلاتا نہ چمکیلی دھوپ منڈیروں پر اترتی۔ کہر میں ڈوبے پھول، بوٹے، درخت ساکت و صامت کھڑے رہتے۔ بس ایک آنگن کی چڑیاں تھیں جنہیں کسی صورت چین نہیں تھا۔ جس وقت سردی کے ستائے ہوئے لوگ نیم تاریک کمروں میں دروازے، کھڑکیاں بند کیے سلگتے کوئلوں پر ہاتھ سینکتے یا لحافوں میں دبکے رہتے۔ یہ چڑیاں بیری کے درخت سے اتر کر صحن میں آ جاتیں اور اتنا شور مچاتیں کہ ماہین کمرے میں ٹک ہی نہ پاتی۔ جوتے، موزے پہن کر وہ شال لپیٹتی ہوئی باہر آتی اور باسی روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑے کر کے انہیں ڈالتی رہتی۔ کبھی اماں ڈانٹ ڈپٹ کرتیں تو کبھی نکی بوا۔ وہ ان دونوں کے خوف سے جلدی جلدی روٹی ختم کر کے وہاں سے اٹھ جاتی۔

اسکول، کالج جانے والا گھر میں کوئی فرد نہیں تھا سو ناشتا نو، دس بجے سے پہلے نہیں کیا جاتا تھا۔ رتو تو بستر سے اٹھتی ہی نہ تھی۔۔۔ دودھ والا گھنٹیاں بجا بجا کر تھک جاتا، تب نکی بوا کانپتی، ٹھٹھرتی، بکتی جھکتی باورچی خانے میں آتیں۔ دودھ لے کر بڑے ماموں کے لیے چائے بناتیں اور انگیٹھی میں کوئلے سلگا کر بڑے ماموں کے پاس اسٹڈی میں لے آتیں۔ انگیٹھی میں دہکتے سرخ سرخ کوئلے دیکھ کر وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تو یونہی ہاتھ سینکتے ہوئے مسلسل دانت کٹکٹائے جاتیں۔ بڑے ماموں کچھ دیر تو برداشت کرتے مگر پھر تنگ آ کر ٹوک دیتے۔

"نکی بوا! جاؤ کہیں اور جا کر یہ طبلہ بجاؤ۔ ہمارے پڑھنے میں خلل آتا ہے۔"

"ارے کہاں جاؤں میاں! وہ کوٹھڑی تو مانو برف سے بنی ہوئی ہے۔ لحاف، بستر سب کے سب برف۔" ان کے دانت کٹکٹانے میں مزید تیزی آ جاتی۔ بڑے ماموں کچھ اور چڑ جاتے۔

"نکی بوا! یہ انگیٹھی لے جاؤ کوٹھڑی میں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ بس ایک کپ چائے کا اور دے جاؤ۔" نکی بوا ان کے ماتھے پر پڑی تیوریوں کو دیکھتیں اور خالی کپ اٹھا کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل آتیں۔

اس رات تو ہلکی ہلکی بارش بھی ہوتی رہی۔ رتو نے سونے سے پہلے کوئلے سلگا کر نکی بوا کی چارپائی کے پاس رکھ دیے تھے مگر نکی بوا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انگیٹھی اٹھا کر لحاف میں رکھ لیں یا لحاف سے نکل کر انگیٹھی پر ہی جا بیٹھیں۔ ادھر ماہین اپنے بستر میں ساری رات بے چین رہی۔ لحاف تو یوں نم تھا گویا کسی نے پانی میں ڈبو رکھا ہو۔ اماں تو جرسی، جرابیں چڑھائے پھر بھی چین سے سو رہی تھیں مگر اسے تو اس وقت تک نیند نہیں آتی تھی جب تک ان تمام لوازمات سے جان نہ چھڑا لے۔

"صبح ہی بڑے ماموں سے کہہ کر ہیٹر منگواؤں گی۔" ہر بار کروٹ بدلتے ہوئے اس نے مصمم ارادہ کیا تھا۔ صبح ہونے پر بڑے ماموں کے بعد ایک وہی تھی جو نماز کے لیے اٹھی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ کچھ دیر بستر میں لیٹی رہی اور پھر جیسے اکتا کر باہر نکل آئی۔ آسمان ابھی بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن بارش بہرحال رک گئی تھی۔ وہ گیلے صحن میں سے ہوتی ہوئی باورچی خانے تک آ گئی اور ابھی چائے کا پانی چولہے پر رکھا ہی تھا کہ سیما بھابھی چلی آئیں۔

"اتنی سردی میں باہر نکلنے کی ہمت کیسے کر لی ماہین۔" انہوں نے آتے ہی اسے دیکھ کر پوچھا۔

"بس چائے کی طلب کھینچ لائی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بھئی۔۔۔ جوانی کے چونچلے اور عیاشی یہ ہی تو ہوتی ہے۔ جس چیز کو دل چاہا۔۔۔ کرنے کی ٹھان لی۔" انہوں نے دوسرا چولہا جلاتے ہوئے کہا۔ "ہماری عمر تک پہنچتے پہنچتے تو عیاشیاں مجبوریوں میں بدل جاتی ہیں۔ رات بھر صاحبزادے نے ڈھنگ سے سونے نہیں دیا۔ صبح ہونے پر شوہر نامدار نے چین نہیں لینے دیا۔ باپ، بیٹا دونوں بھوک بھوک چلا رہے ہیں۔" وہ دودھ گرم کر کے فیڈر میں ڈال رہی تھیں۔

"تو یہ فیڈر آپ کس کے لیے لے جا رہی ہیں۔" اس کے معنی خیز انداز پر وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

"فی الحال تو بیٹے کے لیے لے جا رہی ہوں۔ تم فارغ ہو جاؤ پھر میں اپنے اور عبید کے لیے چائے

بنالوں گی۔"

"میرا خیال ہے، میں بہت بری چائے نہیں بناتی۔" اس نے کہا تو وہ جاتے جاتے پلٹیں۔

"ارے میں تو تمہاری تکلیف کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ بنا دو گی تو مہربانی ہوگی۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنی چائے کپ میں نکالنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سیما بھابھی دوبارہ چلی آئیں۔ گاجر کا حلوہ نکال کر گرم کیا اور ایک پلیٹ فوراً اس کی طرف بڑھادی۔

"خالی چائے مت پیو۔ یہ لے لو۔ اور تم جاؤ۔۔۔ چائے میں خود نکال لوں گی۔"

انہوں نے اس کی سہولت کے خیال سے کہا تو وہ حلوہ کھا کر چائے کا کپ لیے باہر آ گئی۔ کمرے میں جانے کو دل نہیں چاہا تھا، سو وہ پائیں باغ میں آ گئی۔ سبز گھاس پر سجے بارش کے سفید قطروں کو دیکھتے ہوئے نظریں یونہی بھٹک کر چاند بھیا کے کمرے کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ پائیں باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی اس وقت بند تھی۔ اداسی کی دھند میں لپٹا یہ الگ تھلگ کمرا اور اس کا وہ مانوس، ہمدرد مکین۔۔۔

آن واحد میں اس نے چاند بھیا کے تصوراتی پیکر کو کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے۔ دروازے سے نکلتے۔ باغ میں ٹہلتے دیکھا تھا۔

ان کا اپنائیت بھرا خوبصورت لہجہ سماعتوں میں جاگا تو نجانے کیوں آنکھیں بھر آئیں۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا انہیں یہاں سے گئے ہوئے۔ اس نے انگلیوں پر گنا۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔ پورے تین سال پہلے اس نے چاند بھیا کو دیکھا تھا، سنا تھا اور پھر پورے تین برس اس نے انہیں صرف یاد کیا تھا۔ ہر دن میں ایک مرتبہ نہیں۔ کئی مرتبہ۔

کبھی روتے ہوئے۔ جب کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں ہوتا تھا۔

کبھی ہنستے ہوئے۔ جب کوئی اس کی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔

کبھی ان کلیوں کو دیکھ کر۔۔۔ جنہیں سمیٹنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

کبھی کسی کو چاکلیٹ کا گفٹ دیتے دیکھ کر۔

اور کبھی یونہی۔۔۔

کسی آہٹ پر۔۔۔

کسی مانوس خوشبو پر۔۔۔

کسی گمان پر۔۔۔

کون سا لمحہ کس وقت ان کی یاد میں ڈھل جاتا۔۔۔ اسے خبر ہی نہ ہو پاتی۔ وہ یونہی گم صم سی چاند بھیا کو سوچے جاتی یا کبھی دل بھر آتا تو رتو سے باتیں کرنے لگتی۔ اپنی یادیں اس کے ساتھ بانٹ لیتی۔

اسے یاد دلاتی کہ کس طرح ان دونوں نے چھوٹی ممانی کی پکائی ہوئی کھیر رات گئے چوری کر کے چاند بھیا کو دی تھی اور کس طرح رتو سے ایک قیمتی برتن ٹوٹ جانے پر انہوں نے آرام سے سارا الزام اپنے اوپر لے لیا تھا۔

"آہ۔ کاش چاند بھیا۔ ایک بار، صرف ایک بار اس زندگی میں آپ مجھے مل جائیں۔ اتنا سکون تو نصیب ہو کہ آپ زندہ ہیں۔ سلامت ہیں۔۔۔ یہ جو ایک وہم ہے۔۔۔ ایک کسک سی دل میں رہتی ہے۔ اس سے تو نجات ہو۔"

ٹھٹھرتے ہوئے درختوں کے منجمد پتوں سے قطرہ قطرہ گرتی بارش پر نظریں جمائے اس نے بہت دل سے دعا کی تھی۔

"محب آیا ہے۔" رتو اوپر کپڑے پھیلا کر اتری تو آتے ہی اسے خبر کی۔ وہ سوکھے ہوئے کپڑوں کو تہہ کرتے ہوئے رک سی گئی تھی۔

"بلکہ بوا بتا رہی تھیں، وہ خود نہیں آیا۔ بڑے صاحب نے بڑی صاحبہ کے پُر زور اصرار پر بلایا ہے۔"

"اچھا" وہ خاموش ہو گئی تھی۔ گزشتہ کئی ہفتے سے اوپر کے پورشن میں پھیلا سناٹا اور وحشت وہ اپنے دل میں بھی محسوس کر رہی تھی مگر نجانے کیوں اس طرف دھیان دینے سے ڈرتی تھی۔

اور اگلی صبح وہ فراز کو گود میں لیے اسے کیاری کے پانی میں نہاتی چڑیوں کا کھیل دکھا رہی تھی جب وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آیا۔ اسے سامنے کھڑا دیکھ کر اس کے قدم آخری سیڑھیوں پر کچھ سست سے پڑ گئے تھے۔ تمام تر حسیات اس کے اٹھتے گرتے قدموں پر مرکوز ہونے کے باوجود اس نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اور اس کے گریز پر وہ جیسے تپ سا گیا تھا۔

"رتو! اوپر امی کو بتا دینا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔" وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں رتو سے کہہ رہا تھا۔ تب وہ بے اختیار پلٹی تھی شاید یہ پوچھنے کے لیے کہ پیپر ختم ہو گئے ہیں تو اب وہ کیوں جا رہا ہے لیکن وہ اس کے بولنے سے قبل ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازہ پار کر گیا تھا۔ وہ طویل سانس لے کر پلٹتے ہوئے فراز کے ہاتھ سے بالی چھڑانے لگی جو وہ اس کے کان سے کھینچنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا اور اسی شام بہت دنوں بعد بڑی ممانی بمشکل سیڑھیاں اتر کر نیچے اماں کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا، کیا خنّاس سمایا ہے اس کے دل و دماغ میں۔۔۔ اب پڑھائی ختم ہو گئی۔ لڑکے بالے اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے اور یہ وہیں ہاسٹل میں ڈیرا جمائے بیٹھا ہے۔" وہ خاصی دکھی لگ رہی تھیں۔

"بات کیا ہوئی بڑی آپا۔ صبح جاتے ہوئے دیکھا تھا میں نے۔ چہرہ بھی اترا اترا سا لگ رہا تھا؟" اماں نے کریدا تو وہ طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

"بس کیا بتاؤں تمہیں تو پتا ہے۔ شروع سے میں نے عفت کو پسند کر رکھا ہے محب کے لیے۔۔۔ ماشاءاللہ سے ڈاکٹری کے آخری سال میں ہے۔ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ۔۔۔ لیکن اس لڑکے نے تو میرے سارے ارمانوں پر خاک ڈال دی۔ بتاتا کچھ نہیں لیکن مجھے لگتا ہے، وہیں یونیورسٹی میں ہی کسی ڈائن نے اپنے چنگل میں پھنسا لیا ہے۔ بس ایک ہی رٹ ہے، مجھے عفت سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ کسی صورت نہیں کرنی۔ یقین مانو، میری تو راتوں کی نیند ہی اڑ گئی ہے۔ ٹھیک ہے، باقاعدہ کبھی میں نے اپنی بہن سے اس بارے میں بات نہیں کی لیکن پھر بھی فطری طور پر میرا اس طرف جھکاؤ زیادہ دیکھ کر اس نے تو دل میں امید باندھ لی ہوگی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اماں ان سے اتفاق کر رہی تھیں لیکن نگاہیں صحن میں ادھر سے اُدھر جاتی ماہین پر ٹک گئی تھیں۔

''بڑی صاحبہ! آپ کی بات اپنی جگہ سو فیصد درست۔۔۔مگر یہ بھی تو دیکھیے، بچے کی خوشی کس چیز میں زیادہ ہے۔ آپ کی بھانجی ڈاکٹر ہے۔ ایک چھوڑ دس رشتے مل جائیں گے اس کو۔ آپ کا بیٹا تو اکلوتا ہے، اس کا من مار کر بھانجی کو بیاہ کر لائیں تو بھی کیا فائدہ۔۔۔؟ اس سے اس کی رائے پوچھیں۔ اگر کوئی اور پسند ہے تو اس کو بھی دیکھیں بھالیں۔ ہوسکتا ہے، وہ اپنے خاندان سے میل کھاتی ہو۔ بیٹے کی آرزو پوری ہوگئی تو عمر بھر آپ کا احسان مند رہے گا۔'' نکی بوا نے عمر کا تجربہ گھول کر پی رکھا تھا۔ اب بھی پتے کی بات کی تھی۔

''خدا جانے کیا ہوگا آگے۔۔۔؟ رات بھی اس موضوع پر بات ہوئی۔ تو ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس کے ابا تو دم سادھے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال تھا۔ تھوڑا غصہ دکھا کر۔۔۔ضد کر کے اس کو منا ہی لوں گی۔ لیکن وہ تو الٹا مجھے چکر دے گیا ہے۔ کہتا ہے، ویزے کے لیے درخواست دے دی ہے۔ ایک بار باہر چلا گیا تو لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں۔ میرا اکلوتا بیٹا۔۔۔'' وہ دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھے سسکنے لگیں۔

''سمیعہ کا ٹیلی فون آئے گا تو اس سے کہوں گی۔ سمجھائے اس بے وقوف کو۔۔۔ ہوسکتا ہے، اسی کی کوئی اس کے پلے پڑ جائے۔''

تھوڑی دیر بعد بڑی ممانی اٹھ کر اوپر چلی گئیں۔ باورچی خانے میں بیٹھی ماہین نے ان کی ساری بات سنی اور سن کر سوچا تھا۔

''اب کے محبّ آئے گا تو میں خود اس سے بات کروں گی۔''



وہ باورچی خانے میں بیٹھی گاجریں کش کرنے کے ساتھ ساتھ رتو کو ایک ہزار ایک گالیوں سے نواز رہی تھی۔ جو اس ٹھٹھرتے ہوئے موسم میں اسے اس کے ہیٹر لگے کمرے سے نکال کر یہاں باورچی خانے میں لے آئی تھی۔ اس نے لاکھ انکار کیا تھا مگر اس کی منتیں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہ آرہی تھیں۔

''آجاؤ ناں۔ اکیلے میں میرا جی گھبرا رہا ہے۔ اتنی تو خاموشی ہے گھر میں۔ بوا اپنے بستر سے نہیں نکل رہیں۔۔۔تم آجاؤ ناں۔۔۔کوئی کام مت کرنا۔۔۔بس میرے پاس بیٹھی رہنا۔۔۔''

اور یوں وہ اس کے اصرار پر کانپتی لرزتی کچن میں آگئی تھی۔ کچھ دیر تو یونہی وہ کھڑکی میں لگی جالی سے باہر بوندیں گراتے آسمان کو دیکھتی رہی پھر رتو کو پانی میں گاجریں دھوتے اور چھیلتے دیکھا تو چڑ گئی۔

''اتنی سردی میں تمہیں گاجر کا حلوہ بنانے کی کیا سوجھی۔''

''ارے۔۔۔گاجر کا حلوہ سردی میں ہی تو بنایا جاتا ہے تاکہ وقت بے وقت بھوک لگے تو سردی میں کمرے سے نکل کر باورچی خانے تک نہ آنا پڑے۔ بس بیڈ کے نیچے سے ڈبا گھسیٹو اور۔۔۔'' اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ جانتی تھی اس کا اشارہ سیما بھابھی کی طرف تھا جنہوں نے بیسن اور حلوہ بنا کر اپنے بیڈ کے نیچے رکھ چھوڑا تھا اور اس سخت سردی میں جبکہ آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا اور چرند پرند درختوں کی برفاب شاخوں میں دبکے رہتے، وہ اپنے کمرے میں محصور ہوجاتی تھیں۔

''اصل میں چھوٹے صاحب نے منڈی سے بڑی تازہ تازہ گاجریں خرید کر بھجوائی تھیں۔ دودھ

والا دودھ بھی دے گیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا۔ یہ کام نمٹا ہی لوں۔''

اور ماہین اسے یوں اکیلے ہلکان ہوتے دیکھ کر رہ نہ سکی تو خود بھی اس کے ساتھ مل گئی اور اب برف ہوتے ہاتھوں کے ساتھ وہ مسلسل رتو کو کوس رہی تھی۔ تب رتو کام چھوڑ کر اٹھی اور چولہا جلا دیا۔

''بہتر ہوگا۔ تم اس چولہے پہ ہاتھ گرم کرلو۔۔۔ ہمارا کیا ہے، سخت جان ہیں۔ موسم گرمی کا ہو یا سردی کا۔۔۔اس کی سختی ہم پہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ لیکن اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو تمہاری اماں مجھے نہیں چھوڑیں گی۔'' رتو ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ تب ہی بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ رتو ایک لمحے کے لیے بری طرح چونک کر ماہین کو دیکھنے لگی تھی۔

''کیا ہوا؟'' ماہین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔'' اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے گویا اپنے کسی خیال کو جھٹلایا۔

''میں ذرا باہر دیکھ آؤں۔'' وہ ہاتھ دھو کر خشک کرتی ہوئی باہر لپکی۔ اتنی دیر میں دوبارہ دستک ہوئی تھی۔ ماہین نے بڑا سا پتیلا اٹھا کر چولہے پہ رکھا اور کش کی ہوئی گاجریں اس میں ڈالنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ سیدھی ہوئی ہی تھی جب پیروں کی بہت ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ اس نے یونہی ایک گاجر کترتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ رتو تھی۔۔۔دروازے کے عین وسط میں کھڑی۔۔۔ باورچی خانے میں پھیلے اندھیرے میں ہلکا سا اضافہ ہوگیا تھا۔ کہ رتو کا وجود باورچی خانے میں آتی روشنی کے بیچ حائل ہوگیا تھا۔

''کیا ہوا۔۔۔؟ یہاں جم کر کیوں کھڑی ہوگئی ہو؟'' اسے ساکت و صامت دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''ماہین! وہ آگیا ہے۔'' اس نے رتو کی سرسراتی ہوئی آواز سنی۔

''کون۔۔۔کون آگیا ہے؟'' اسے رتو کے احساسات غیر معمولی لگے تھے۔

''وہ۔۔۔وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے ماہین۔ جس کے لیے میرے جسم کا رواں رواں دعا کرتا تھا۔''

وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ لگی تو بیٹھتی ہی چلی گئی۔ ماہین کے دل و دماغ میں جھما کا ہوا تھا۔

''چاند بھیا۔۔۔رتو! چاند بھیا آگئے؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

''ہاں۔۔۔ہاں وہ آگیا۔'' رتو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ماہین بے یقینی سے دو قدم اس کی طرف بڑھی۔ مگر پھر اسے وہیں چھوڑ کر تیر کی طرح باورچی خانے سے نکلی تھی۔ لاؤنج پار کر کے بے احتیاطی سے برآمدے کے چکنے فرش پر بھاگتی ہوئی وہ صحن تک آئی تھی۔ قطرہ قطرہ برستی بارش میں بھیگتے۔۔۔ ڈیوڑھی سے نکل کر صحن کے عین وسط میں کھڑے وہ، وہی تو تھے۔ اس کے چاند بھیا۔۔۔ جن کے بالوں پر بارش کے بے حد باریک قطرے چمک رہے تھے اور جو روشن چہرے پر منتظر سی مسکراہٹ لیے اس پہ نظریں جمائے ہوئے تھے۔

''اوہ میرے خدا۔'' ماہین کو لگا، وہ اپنی ساری توانائیاں کھو چکی ہے۔ اس نے اس ایک منظر کو سینکڑوں بار اپنے تصور میں سجایا تھا۔۔۔ دہرایا تھا مگر اب یہ تصور حقیقت بن گیا تھا تو یقین کا کوئی سرا ہاتھ میں ہی نہ آرہا تھا۔ دل۔۔۔دماغ۔۔۔خوشی۔۔۔آنسو۔۔۔جذبے۔۔۔ہر چیز جیسے برف بن گئی

تھی۔

"ماہین گڑیا۔۔۔ پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے کیا۔۔۔؟" ان کی آواز۔۔۔ان کا لہجہ، وہ چھ برس پیچھے لوٹ گئی تھی۔

"چاند بھیا۔" اس کے ہونٹ لرزے تھے اور اگلے ہی پل وہ ان سے لپٹی دھواں دھار رو رہی تھی۔

"مجھے معلوم تھا، آپ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ مجھے یقین تھا۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی اور چاند بھیا آنکھوں میں نمی لیے اس کی محبتوں اور آنسوؤں کی برسات میں بھیگتے رہے تھے۔



"نہیں معلوم۔۔۔ کس جنون کے تحت گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ بس ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی دل میں۔ ہر الزام برداشت کرتا رہا مگر وہ ایک بہتان میری رگوں میں لہو کی جگہ شرارے بھر گیا تھا۔ نجانے کون سا راستہ تھا۔ کون سا مقام تھا۔ چلتے چلتے یونہی ساری کائنات اندھیرے میں ڈوب گئی۔ ہوش و حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگا۔ لیکن وقت ڈیڑھ مہینے کے عرصے پر محیط ہو گیا تھا۔ بخار بھی بگڑ گیا تھا اور سر کا زخم بھی۔ معلوم ہوا، کسی ہسپتال کے برآمدے میں لاوارث پڑا تھا۔۔۔ مکھیاں پورے وجود پہ چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک ڈاکٹر صاحب وہاں سے گزرے۔ میری یتیمی پر ترس آیا یا شاید میری گھائل ہوتی ہوئی جوانی پر کہ مجھے اٹھا کر اپنے ذاتی کلینک لے آئے۔ ڈاکٹر حیات ایسے جوانوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے جو خود اپنے ہاتھوں مختلف ذرائع سے اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ وہ مجھے بھی کوئی نشئی کوئی ہیروئنچی سمجھ بیٹھے تھے لیکن ہوش میں آنے پر جب ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ گھر میں اپنے مددگار کے طور پر لے گئے۔ غلامی کی مجھے عادت تھی تو یہ عادت اس گھر میں بہت کام آئی۔ ڈاکٹر صاحب تنہا آدمی ہیں۔ وہاں رہنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ابتدا میں دو تین سال ان کے کلینک میں ملازم رہا۔ اب جوڑ توڑ کر کے اپنا ایک بڑا میڈیکل اسٹور کھول چکا ہوں۔"

یہ چھ سالوں پر مشتمل وہ جدوجہد تھی جس نے چاند بھیا کو اپنی ذات کی پہچان میں مدد دی تھی اور جسے انہوں نے بمشکل چھ منٹ میں سمیٹ کر اس وقت ماہین کے سامنے پیش کیا۔ جب چھوٹے ماموں نماز کے لیے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ عبید بھیا کا کوئی دوست آ گیا تھا اور اماں بڑی ممانی کو سہارا دے کر اوپر چھوڑنے گئی تھیں اس ساری کہانی میں سے گھر والوں کو صرف رٹے رٹائے چند جملے سنا کر چاند بھیا نے مطمئن کر دیا تھا۔

"زندگی پہلے سے بدل گئی ہے ماہین۔۔۔ وہ سب جو اپنی بائیس سالہ زندگی میں، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ان چھ سالوں میں بہت زیادہ سوچ لیا ہے۔ وہ سب جو پہلے کبھی دیکھا تھا، نہ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اب اسے نہ صرف دیکھ رہا ہوں بلکہ پرکھ اور برت بھی رہا ہوں۔ زندگی ایک نئے ڈھب سے گزر رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آنکھوں پہ ایک پردہ پڑا ہوا تھا جو اب اٹھ گیا ہے۔ ڈاکٹر حیات کمال کے انسان ہیں۔ وہ جس زاویہ سے اس دنیا کو دیکھتے ہیں، وہ غیر معمولی ہے۔ میں نے انہیں کبھی کسی عام انسان کی طرح سوچتے اور بولتے نہیں دیکھا۔ وہ اگرچہ دیکھنے میں بہت عام سے انسان ہیں لیکن ہر فرد سے ان کا خاص رویہ انہیں بہت اونچے مقام پر بٹھا دیتا ہے۔ یوں سمجھو، سوچ کے ایک ایک زاویے کو بدل کے رکھ دیا ہے انہوں نے۔"

وہ بہت متاثر لگ رہے تھے ڈاکٹر حیات سے۔ اسی لیے اتنی عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کر رہے تھے۔ ماہین بھی دل ہی دل میں ڈاکٹر حیات کی شکر گزار ہوتی ان کی بات سنتی رہی۔ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے تو ماہین کو احساس ہوا، رتو ابھی تک چائے لے کر نہیں آئی تھی۔

"میں ابھی اسے دیکھ کر آتی ہوں۔"

وہ کچن میں آئی تو رتو چائے بنانے کے ساتھ رونے کا شغل ابھی بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ ماہین نے بے اختیار ہی ہنستے ہوئے پیچھے سے جا کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"اب کس بات کا رونا ہے بھئی۔۔۔ اتنا تو تم ان کے جانے پر بھی نہ روئی تھیں۔" رتو روتے میں ہنس دی تھی۔

"اور یہ تم چائے بنا رہی ہو یا انہیں ٹالنے کے لیے یونہی خالی دیگچی اوپر رکھ چھوڑی ہے۔" ماہین نے دیگچی کا ڈھکن اٹھایا۔ پانی کھول کھول کر آدھا رہ گیا تھا۔

"میں ابھی بناتی ہوں۔" رتو جلدی سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی اٹھی۔

"بنالو۔ مگر خیال رہے۔ چائے زیادہ نمکین نہیں ہونی چاہیے۔" وہ اس کے آنسوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ تب ہی چاند بھیا کچن کے دروازے پر کھنکھارے تھے۔

"اچھا بھئی۔ ماہین! اب میں چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی۔" رتو کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ جھینپ کر ماہین کے پیچھے ہو گئی تھی۔

"یہ رتو بی بی کیا کہہ رہی ہیں؟" چاند بھیا بھی مسکرا رہے تھے۔

"کہہ رہی ہیں، شوق سے جائیے۔۔۔ بلکہ کہہ رہی ہیں، میں دروازے تک چھوڑ آتی ہوں۔۔۔ ہائے۔" اس زور سے چٹکی کاٹی تھی رتو نے کہ بات کے خاتمے پر وہ چیخ اٹھی تھی۔

"کتنی بدتمیز ہو تم۔۔۔؟" ماہین اسے گھورتی ہوئی چاند بھیا کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جائیں گے آپ۔۔۔؟"

"جہاں پچھلے چھ برس سے رہ رہا ہوں۔" انہوں نے آرام سے کہا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"اب آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ آپ کا کمرا آپ کا منتظر ہے۔"

"وہ کمرا۔۔۔ ہا۔۔۔ اس کمرے کو تالا لگا کر اس کی چابی کہیں گم کر دو۔ وہ تاریک کوٹھڑی اب میرے قابل نہیں رہی۔" وہ بہت اعتماد سے کہہ رہے تھے۔ ماہین کو اچھی خاصی حیرت ہوئی لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"ہم آپ کا کمرا بدل دیں گے۔۔۔ لیکن یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ کیا معلوم اب جائیں تو پھر کتنے عرصے بعد واپس آئیں۔" ماہین ان کا ہاتھ تھامے ضدی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ارے۔۔۔" وہ اسے اپنے ساتھ لیے باہر کی طرف چل دیے۔

"بے وقوف لڑکی! خود کو سنبھالنے میں لگا اتنا عرصہ۔ اپنے قدم جما رہا تھا باہر کی دنیا میں۔۔۔ اتنی بڑی کائنات میں اپنے حصے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔ اپنا مقام تلاشنے میں اتنا وقت تو لگنا ہی تھا نا۔۔۔ لیکن ہر بار ایسا تھوڑی ہو گا۔"

وہ اب صحن میں پہنچ گئے تھے۔ بارش رک گئی تھی لیکن سرمئی بادل ابھی بھی بڑی تمکنت سے آسمان کو اپنی جاگیر سمجھے ہوئے تھے۔ ہوا بھی پہلے سے تیز ہوگئی اور اب ہلکا ہلکا اندھیرا زمین پر اترنے لگا تھا۔ وہ اپنے سرد ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے جرسی کی جیبوں میں ڈال کر ڈیوڑھی تک آ گئی۔

''لیکن پھر بھی آپ وعدہ کریں۔ آپ بہت جلدی آئیں گے ہم سے ملنے۔''

''وعدہ رہا۔۔۔'' انہوں نے اپنی بھاری جیکٹ کی زپ بند کی اور کالر کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں قسم کھائیں۔۔۔'' ماہین کی بے اعتباری پر وہ ہنس دیے اور دو قدم آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں اس کے سر پہ رکھ دیے۔

''زندگی رہی تو انشاء اللہ کچھ ہی دنوں میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟'' ہاتھ ہٹاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ پہلی بار آپ کو یوں ''دل'' سے ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔۔۔ اور ویسے بھی میں دیکھ رہی ہوں، آپ پہلے سے کافی اسمارٹ ہوگئے ہیں۔'' اس نے سرتاپا انہیں دیکھا تو وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔

''چلتا ہوں اب۔۔۔'' وہ بیرونی دروازہ کھول رہے تھے پھر اچانک کچھ یاد آنے پر پلٹے۔

''ہاں وہ محبت۔ محبت کیا کر رہا ہے آج کل۔۔۔؟''

''آپ دوبارہ آیئے گا۔۔۔ میں اس کے بارے میں آپ سے تفصیل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اور ہاں اپنے ڈاکٹر حیات کو بھی ساتھ لے کر آیئے گا۔''

''ضرور لاؤں گا۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہاں میرے ساتھ کیا ''سلوک'' ہوگا۔''

''ویسے سب لوگ بہت اچھے طریقے سے ملے، ہے ناں؟'' ماہین گھر والوں کے اچھے رویے سے خوش تھی۔

''ہاں۔۔۔ لیکن یہ لوگ اگر اچھے طریقے سے نہ ملتے تب بھی مجھے فرق نہیں پڑنا تھا۔ میں جن لوگوں سے ملنے آیا تھا، ان کی خوشی کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔''

''رتو نے آپ کی واپسی کی بہت دعائیں کی تھیں۔''

''جانتا ہوں۔''

''اور پتا ہے ان چھ سال میں۔۔۔'' وہ بے اختیار ہنسی۔

''ان چھ سالوں میں وہ چھ سوئیٹر بن چکی ہے آپ کے لیے۔''

چاند بھیا کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے لمحہ بھر کے لیے۔۔۔ پھر وہ سیدھے ہوئے، اپنے جیکٹ کی زپ کھولتے ہوئے انہوں نے جیکٹ ایک سائیڈ سے ہٹائی۔ سفید دھاریوں والا سوئیٹر جگمگا رہا تھا۔

''ایک سوئیٹر تو اپنی جان سے لگا رکھا ہے۔ اس سے پوچھنا، چھ سوئیٹر کہاں رکھوں گا۔''

''اللہ چاند بھیا۔ کتنے گھنے میسنے ہیں آپ۔ بالکل رتو کی طرح۔۔۔ میں ابھی جا کر اس کو بتاتی ہوں۔'' وہ چلاتے ہوئے پلٹی تھی جب چاند بھیا نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔

''بعد میں بتا لینا۔ ابھی دروازہ بند کرلو۔ میں جا رہا ہوں۔'' انہوں نے دروازہ کھولا۔ چند لمحے

یونہی گزر گئے۔ وہ ایک پاؤں دہلیز پہ رکھے تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے۔ ماہین کو ان کے انداز پر حیرت ہوئی۔

''ماہین! وہ۔۔۔ تمہاری نجمہ خالہ نظر نہیں آئیں؟'' وہ خاصے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ماہین ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

''میں تو بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی اور آپ نے اب کیا یہ سوال۔۔۔؟ وہ بہت برے حال میں ہیں چاند بھیا! ان کے دل و دماغ نے جس طرح پلٹا کھایا، وہ ناقابل بیان ہے۔ بس چند دن۔۔۔ صرف چند دن تھے جو آپ کے جانے کے بعد انہوں نے نارمل انداز میں گزارے۔۔۔ اب آپ آگئے ہیں تو ختم کر دیجیے ان کی یہ سزا۔۔۔ انہیں معاف کر دیجیے۔۔۔ ان کی ہر زیادتی۔۔۔ ان کا ہر ستم۔۔۔ ہوسکتا ہے تب ہی انہیں سکون مل جائے۔''

چاند بھیا ہکا بکا سے سن رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صورتِ حال یہ بھی ہوسکتی ہے۔ وہ تو سمجھ رہے تھے انہیں چاند کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ ہمیشہ کی طرح تن فن کرتی آئیں گی۔ ان پر طنز کریں گی۔ ان کی تحقیر کریں گی اور مضحکہ اڑا کر چلتی بنیں گی۔

''ایک عرصہ ہوا، لوگوں سے میل ملاقات چھوڑ رکھی ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہوکر رہ گئی ہیں۔'' ماہین بتا رہی تھی۔

''اور میں سمجھا، شاید انہیں میری آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی۔'' انہوں نے دروازے کا پٹ پوری طرح کھول دیا تھا۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا ان کے چہرے سے آ کر ٹکرایا تھا۔

''آپ۔۔۔ چاند بھیا۔۔۔ انہیں دیکھیں گے نہیں۔'' ماہین پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور پاؤں دہلیز سے باہر نکالا۔

''آپ ایک دفعہ ان سے مل لیں۔ ہوسکتا ہے، آپ کو دیکھ کر۔۔۔'' ماہین کی آواز سرسراتی ہوا میں ضم ہوکر کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔

انہوں نے دوسرا قدم اٹھایا تو پھر پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ ان کے دل کی کیفیت اس وقت بہت عجیب تھی۔ شاید وہ نجمہ خالہ کے بارے میں سن کر خوش ہوگئے تھے یا شاید۔۔۔ وہ اداس تھے۔

رتو کو تو جیسے ساری کائنات مل گئی تھی۔ ادھر ماہین چاند بھیا کو رخصت کر کے باورچی خانے میں داخل ہوئی، ادھر رتو نے اسے بازوؤں میں لے کر گھما ڈالا۔

''ایے۔۔۔ ایے۔۔۔ چھوڑو مجھے۔ رتو کی بچی۔۔۔'' وہ بری طرح چیخی تھی مگر رتو تو آج دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے چکر پہ چکر دے ڈالے اور جب سب در و دیوار گول دائرے میں گھومنے لگے تب رتو نے ایک دم اسے آزاد کر دیا وہ سیدھی میز سے ٹکرائی اور اسٹول پر ڈھے گئی۔ خود رتو نے گھومتی گھامتی دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا اور وہیں دیوار کا آسرا لے کر بیٹھی تو پھر ہنستی چلی گئی تھی اور اتنا ہنسی تھی۔ اتنا ہنسی تھی کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا اور چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ پڑ گیا تھا۔ ماہین اس کی بے تحاشا ہنسی سے خوف زدہ ہوکر اسے ٹوکنے کی غرض سے بولی تھی۔

''کیسے ہنسی کے فوارے پھوٹ رہے ہیں ابھی چار گھنٹے پہلے اپنی شکل دیکھنی تھی۔ مردے کی طرح پیلی ہو رہی تھیں اور اب۔۔۔ اب دیکھو کیسے رنگ ہی رنگ ہیں چہرے۔۔۔ یوں پل کے پل کیسے بدل

لیتی ہو خود کو۔''

''ارے تم کیا جانو۔۔۔؟ رتو اس پھول کا نام ہے جس پر محبت بارش بن کر برسے تو وہ کھل جاتا ہے۔ نہ برسے تو مرجھا جاتا ہے۔ ارے رتو تو ہوا ہے۔ ہوا۔۔۔ اپنے محبوب کے بدن کو چھو لے تو لہرا اٹھتی ہے۔ نہ چھوئے تو ٹھہر جاتی ہے۔۔۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لہرانے لگی تھی۔

''اور میں تو آج جی اٹھی ہوں۔۔۔ پھر کیوں نہ رنگ برسیں مجھ پر۔''

ڈالی انار کی گوری کا رنگ روپ ہے

رچنا بہار کی ڈالی انار کی

وہ جھوم جھوم کر گا رہی تھی اور خوشی کے اس غیر معمولی اظہار پر ماہین مسکرانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں حیرت بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔

کرنیں اِدھر اُدھر گریں سولہ سنگھار کی

ڈالی انار کی

گوری کا رنگ روپ ہے۔۔۔

''تمہیں پتا ہے ماہین۔'' وہ ایک دم سیدھی ہو کر بھاگتی ہوئی اس تک آئی تھی اور جوشِ جذبات میں اس کے ہاتھ جکڑتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

''تمہیں پتا ہے۔۔۔ میرا دل میرے کانوں میں دھڑکنے لگا تھا جب میں نے اس کی دستک کی آواز سنی۔۔۔ اللہ کی قسم۔۔۔ اور پھر میرا دل میری انگلیوں کی پوروں میں دھڑکنے لگا تھا جب میں نے دروازہ کھولا تھا۔'' وہ اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے کہہ رہی تھی۔

''اور پھر۔۔۔ پھر میرا دل میری آنکھوں میں سما گیا تھا جب میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھا۔ اور۔۔۔ اور جب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔۔۔ مجھے دیکھ کر۔۔۔ اور اس نے اپنی انگلی میرے ماتھے پہ مارتے ہوئے کہا تھا'' میں آ گیا ہوں۔۔۔ تجھے لے جانے کے لیے۔۔۔ تو اللہ کی قسم ماہین! اس لمحے اس پوری کائنات میں اس کے اور میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔'' رتو اپنے تیز ہوتے تنفس کے ساتھ آنکھیں بند کیے بتا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب اس کی بساط سے بڑھ کر ہوا ہے۔

''اور ماہین! آج اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنے اللہ پر یقین آ گیا۔ جو اوپر آسمانوں میں موجود ہے۔ یہ سب اسی کی دین ہے۔ سب اسی کی دین ہے۔

''یہ سب تمہارا کرم ہے آقا۔۔۔''

رتو دونوں ہاتھوں کو جوڑتے آسمان کی جانب چہرہ اٹھائے جھوم رہی تھی۔۔۔ اور ماہین رشک بھرے انداز میں اسے دیکھے چلی گئی تھی۔

''کتنی صاف اور کھری لڑکی ہے یہ۔۔۔ چاند بھیا چلے گئے تھے تو اس نے جی بھر کے سوگ منایا تھا۔ کسی کی باتوں کی پروا نہیں کی۔ اب خوش ہے تو اپنی اس خوشی کا بھرپور اظہار کرے گی۔ میری طرح سات پردوں میں چھپنا نہیں پڑتا اسے، جہاں انسان خود پر بھی اپنا آپ ظاہر کرنے سے ڈرتا ہو۔'' اس کے دل میں کوئی احساسِ محرومی چٹکیاں بھرنے لگا تھا۔



''تم آ گئے ہو چاند۔۔۔'' دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی نجمہ خالہ نے بہت نارمل انداز میں کہا تو ڈرائنگ روم میں بیٹھے سب نفوس اپنی اپنی جگہ چونک سے گئے تھے۔ چائے سرو کرتی ہوئی ماہین نے خاموش نظروں سے اماں کو دیکھا۔ کتنی بار وہ کہہ چکی تھی کہ نجمہ خالہ کو چاند بھیا کے لوٹ آنے کی خبر سنا دیں مگر اماں ہر بار ہی جھجک جاتیں۔

''اتنی مشکل سے سنبھلی ہے وہ۔ ڈرتی ہوں، اس کا نام سن کر دوبارہ سے دیوانگی کے دورے نہ پڑنے لگ جائیں۔''

''اور اب معلوم نہیں، یہ کس ردِعمل کا اظہار کریں گی۔'' ڈاکٹر حیات کی موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔

''اکیلے آئے ہو؟'' انہیں متوازن چال سے چاند بھیا کی طرف آتے دیکھ کر ماہین کو حیرت ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی، ان کا ردِعمل بہت شدید ہو گا مگر حیرت انگیز طور پر وہ بہت نارمل دکھائی دے رہی تھیں۔

''وہ ساتھ نہیں آیا۔۔۔؟'' وہ چاند بھیا کے عین سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ چاند بھیا نے مضطرب سے انداز میں اٹھنا چاہا مگر ڈاکٹر حیات کے مبہم سے اشارے نے انہیں اٹھنے سے باز رکھا تھا۔

''کون۔۔۔؟ کس کی بات کر رہی ہو نجمہ۔۔۔؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''وہی۔۔۔ جو بہت بد دیانت تھا۔۔۔ اپنے وعدوں میں۔۔۔ اپنے رویوں میں۔۔۔ اور اپنی محبتوں میں۔۔''

وہ قالین پر چاند بھیا کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی تھیں اور اپنا سر ان کے گھٹنے سے یوں ٹکایا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنے لاڈ اٹھوانے کو کسی بہت ہی ''اپنے'' کے پاس بیٹھتا ہے اور چاند بھیا ساکت ہو گئے تھے گویا اپنی جگہ سے ہلنے سے قاصر ہوں۔

''وہی جو کہا کرتا تھا'' میں تمہارے لیے پوری دنیا سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔'' لیکن اپنے جھوٹے رسم و رواج سے لڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکا اور وقت آیا تو چپکے سے اپنی بچپن کی منگ کو بیاہ لایا۔۔۔ جو لال سوٹ پہنے۔۔۔ سنہری چوڑیاں چھنکاتی سارے گھر میں اِدھر سے اُدھر گھوما کرتی تھی۔''

نجمہ خالہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہی تھیں۔ تب ہی اس نے دیکھا، چھوٹے ماموں اسے نجمہ خالہ کو وہاں سے لے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ اٹھنا چاہ رہی تھی مگر ڈاکٹر حیات نے فوراً اسے ٹوک دیا تھا اور پھر ماموں سے سرگوشی کرنے لگے تھے۔

''ایکسکیوزمی۔۔۔ مجھے دخل دینے کا حق تو حاصل نہیں لیکن پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ اس وقت انہیں مت چھیڑیں۔ مجھے یہ قطعی نارمل نہیں لگ رہیں۔ انہوں نے غیر معمولی طور پر خود کو کمپوز کر رکھا ہے۔ ارتکاز ٹوٹ گیا تو ان کا ردِعمل بہت شدید بھی ہو سکتا ہے۔''

ڈاکٹر حیات کے مشورے پر ماموں نے عمل تو کیا تھا مگر خود وہاں بیٹھے رہنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا تو بہت آہستگی سے ان سب کے درمیان سے اٹھ گئے تھے۔

''کوئی تصور نہیں کر سکتا۔۔۔ اس دکھ۔۔۔ اور اذیت کا جس سے ان دنوں میں دو چار ہوئی۔ وہ

لمحہ کیسا قاتل ہوا کرتا تھا میرے لیے۔۔۔ جب وہ اس کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام لیتا تھا۔ اس کے لیے گیت گنگنانے لگتا تھا، وہی گیت جو وہ کبھی میرے لیے گایا کرتا تھا۔ اور جانتے ہو چاند؟" وہ سر اٹھا کر چاند کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تھیں۔

"ایک قیامت اتر آتی تھی میرے وجود میں جب میں کلیوں کے جھنڈ کے پاس اس کی سنہری چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے دیکھا کرتی تھی۔ ان کی سرگوشیاں۔۔۔ ان کی کھلکھلاہٹیں۔۔۔ وہ تو اپنی دنیا میں پوری طرح مگن ہو گیا تھا اور میں۔۔۔ میں جس لمحہ جیتی تھی، اسی لمحہ مرجاتی تھی۔ میری رات میرے آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی اور میرا دن میری ناتمام خواہشات کی قبر پہ پڑا سسکتا رہتا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر اس نے تمہیں جنم دیا اور خود مرگئی۔ سن رہے ہو چاند؟" انہوں نے۔۔ بے چاند کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔

"تمہاری ماں مرگئی اور مجھے پھر سے امید بندھ گئی لیکن وہ پھر بھی لوٹ کر میری طرف نہیں آیا۔ اس کے غم میں دیوانہ ہو کر نکلا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا اور تم یہیں پر رہ گئے۔ میرے کرب میں اضافہ کرنے کے لیے۔ جانتے ہو جب تم میرے سامنے آتے تھے تو وہ تم نہیں ہوتے تھے۔ غیاث ہوتا تھا۔۔۔ اور جب تم مسکراتے تھے تو تم نہیں۔۔۔ غیاث مسکراتا تھا۔۔۔ تمہاری پیشانی۔۔۔ تمہاری آنکھیں۔۔۔ تمہارے ہونٹ۔۔۔ تمہارے نہیں تھے۔۔۔ غیاث کے تھے اور جب جب میں تمہیں دیکھتی۔۔۔ مجھے وہ یاد آجاتا۔ جس نے ہمیشہ ہر مقام پر مجھے دھوکا دیا تھا۔ جو مجھ سے کہتا تھا۔ "میں تم سے شادی کروں گا۔" لیکن اس نے مجھ سے نہیں۔۔۔ کسی اور سے شادی کی تھی۔

وہ مجھ سے کہتا تھا۔۔۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" لیکن اس نے محبت بھی مجھ سے نہیں۔۔۔ کسی اور سے کی تھی اور وہ مجھ سے کہتا تھا "تمہاری جدائی مجھے پاگل کردے گی۔" لیکن میری جدائی نے اسے پاگل نہیں کیا، وہ کسی اور کی جدائی میں پاگل ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ مجھے دھوکے دیے اور جب میں تمہیں دیکھتی تھی تو یہ سارے فریب ایک ایک کر کے میرے سامنے آکھڑے ہوتے تھے۔ اس کے سب وعدے یاد آتے تھے جو اس نے میرے ساتھ کیے لیکن وفا نہیں کیے۔ تم مجھے وہ ذلت نہیں بھولنے دیتے تھے جو اس نے میری محبت کا مذاق اڑا کر میری جھولی میں ڈالی تھی۔ میری حسرتیں مجھے ڈسنے لگتیں اور میں اپنے دل کا سارا زہر تمہارے وجود میں انڈیلنے لگتی۔ تمہیں مارتی پیٹتی۔۔۔ سزائیں دیتی۔۔۔ تمہیں بھوکا رکھتی لیکن یہ سب میں تمہارے ساتھ نہیں کرتی تھی چاند۔۔۔ یہ سب تو میں غیاث کے ساتھ کرتی تھی لیکن ہر بار ہی غیاث کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹتا تو مجھے تم نظر آنے لگتے۔ تمہارے معصوم چہرے پہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے نشان مجھے میری نظروں سے گرا دیتے۔۔۔ تمہارے گالوں پر بہتے آنسو مجھے گھنٹوں پشیمان رکھتے، میں عہد کرتی۔۔۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن ایسا ہو جاتا۔۔۔ تم غائب ہو جاتے۔۔۔ غیاث سامنے آجاتا۔۔۔ اور میں غیاث سے نفرت کرتی تھی چاند۔۔۔ تم سے نہیں۔۔۔ تم سے تو میں نے کبھی نفرت نہیں کی چاند کبھی بھی نہیں۔۔۔ تم سے تو میں محبت کرتی تھی۔ بہت زیادہ محبت۔۔۔ اتنی شدید جتنی ایک ماں اپنے بچے سے کرسکتی ہے۔"

وہ اب سیدھی ہو بیٹھی تھیں اور انہوں نے دونوں بازو اٹھا کر چاند کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ کمرے کی سرد فضا میں ایک وحشت ناک سا سناٹا در آیا تھا اور اس تمام عرصے میں شاید پہلی بار

چاند بھیا نے نگاہ اٹھا کر نجمہ خالہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا جہاں انہیں بے رنگ پانی کی دبیز تہہ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے کبھی لگا ہی نہیں تھا کہ تمہیں میں نے جنم نہیں دیا۔۔۔ میں تم سے پیار کرنا چاہتی۔۔۔ تمہیں چھونا چاہتی لیکن تم خوفزدہ ہو جاتے۔۔۔ تم ڈر کر مجھ سے دور بھاگنے لگتے اور جب تم مجھ سے دور جانے لگتے۔ تب۔۔۔ تب تمہارا وجود ایک بار پھر غیاث کے پیچھے چھپ جاتا اور غیاث سے تو مجھے نفرت تھی ناں۔۔۔ لیکن میں تم سے تو نفرت نہیں کرتی۔۔۔ میں نے تم سے کبھی بھی نفرت نہیں کی چاند۔۔۔"

ان کی آواز یک لخت ہی ڈوب گئی تھی۔ چاند بھیا نے چونک کر سر اٹھایا وہ لب بھینچے ساکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ذرا بھی نہیں روئی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں مچلتا سمندر چاند بھیا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے۔ نجمہ خالہ نے ایک طویل سانس لی تھی اور پھر ہلکی سی جھرجھری لے کر وہیں قالین پر ہی ڈھیر ہو گئی تھیں۔ چاند بھیا کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ماہین اور اماں بجلی کی سی تیزی سے انہیں سنبھالنے کو ایک ساتھ اٹھی تھیں اور چاند بھیا اپنی جگہ ساکت بیٹھے نجمہ خالہ کی بند آنکھوں سے گرتے پانی کے قطروں کو دیکھ رہے تھے۔



بہت دنوں بعد اس نے کسی سے محبّ کے آنے کی اطلاع سنی تھی۔ دل کی دھڑکن کا تیز ہونا اسے حیران کر گیا تھا مگر اس حیرت کو اندر ہی اندر کہیں دفن کرتے ہوئے وہ نجمہ خالہ کے کمرے سے باہر آگئی تھی۔ اماں تو مستقل طور پر ہی نجمہ خالہ کے کمرے میں آگئی تھیں جو ڈاکٹر حیات کی تجویز کردہ مسکن ادویات کے تحت دن کا بیشتر حصہ سونے میں ہی گزار دیتی تھیں۔

باہر ہلکی ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور بہت دنوں بعد اس نے چڑیوں کو پانی میں دوبارہ کھیلتے دیکھا تھا۔ سیما بھابھی دھوپ میں گرم پانی کی بالٹی رکھے فراز کو نہلا رہی تھیں۔ نکی بوا سر تا پا چادر تانے لیٹی ہوئی تھی۔ رتو کو بھی پائیں باغ کی صفائی ستھرائی میں مصروف دیکھا تو پھر وہ سیدھی اوپر چلی آئی۔ ممانی اپنے بیڈروم میں تھیں۔ وہ آہستگی سے قدم اٹھاتی محبّ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ پھر اس کی اجازت پر ماہین نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ آڑا ترچھا بیڈ پہ لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

"باہر آؤ۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ اتنا کہہ کر پلٹی اور خود دھوپ میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ ایک دو منٹ بعد وہ باہر نکلا تھا اور بجائے اس کی طرف آنے کے صحن میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھا تھا۔ گویا ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر خود بھی اس کے سامنے جا بیٹھی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم آج کل۔۔۔؟" اس نے بیٹھتے ہی سوال کیا تھا۔

"باہر جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔۔۔ بس کچھ دن لگیں گے ویزا ملنے میں۔۔۔"

اس کی طرف سے قطعی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ٹانگیں بدتمیزی سے سامنے میز پہ رکھیں اور نیم دراز ہو کر اپنی جیب تھپتھپانے لگا۔ پھر مطمئن ہو کر سوئیٹر کے نیچے شرٹ کی جیب سے سگریٹ

اور ماچس کی ڈبیا نکالی۔ سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور پھر سلگا کر بڑے پُرسکون انداز میں لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔ اس کی ایک ایک حرکت دل جلانے اور اسے چڑانے والی تھی۔ جانتا تھا، اسے سگریٹ پیتے ہوئے مرد بالکل اچھے نہیں لگتے۔

''محب! تم سگریٹ پینے لگے ہو۔۔۔؟'' وہ بہت دکھ سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں مجبوری ہے۔۔۔ پینی پڑتی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے چیونگم کی طرح چبایا جاسکے اور لالی پاپ کی طرح چوسا جاسکے۔''

''ماموں کو علم۔۔۔''

''فار گاڈ سیک محترمہ۔۔۔! میں آٹھ دس سال کا بچہ نہیں ہوں جس کی کسی غلطی کو تم بڑوں کے سامنے لے جا کر پیش کرو گی اور وہ مجھے فوراً سزا دینے پر تل جائیں گے۔'' اس کا لہجہ سخت ہی نہیں بے گانہ بھی تھا۔

''یہ۔۔۔ یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو مجھ سے۔'' اسے بھی غصہ آنے لگا تھا۔

''تم کس لہجے میں سننا چاہتی ہو مجھے۔۔۔'' بڑا چبھتا ہوا انداز تھا اس کا۔ ماہین سر تھام کر رہ گئی۔ ہر سوال کا الٹا جواب۔۔۔ ہر بات کا الٹا مطلب۔۔۔ وہ تو بڑے سبھاؤ سے اس سے بات کرنے آئی تھی مگر محب بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ تب وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بڑے نرم لہجے میں بولی تھی۔

''محب! تم ماموں، ممانی کے اکلوتے بیٹے ہو۔''

''اچھا۔۔۔ خاصی نئی اطلاع ہے یہ۔۔۔'' وہ جیسے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا تھا۔

(بدتمیز۔۔۔ گدھا۔۔۔ الو۔۔۔ میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے) وہ دل میں جی بھر کے اسے گالیاں دے کر دوبارہ مسکرائی۔

''اگر تم چلے گئے محب۔۔۔ تو تم جانتے ہو۔ وہ کس قدر اکیلے ہو جائیں گے۔''

''جانتا ہوں۔۔۔'' سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے عمل میں بہت اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔

''تو پھر تم کیوں ایک فضول سی ضد کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔۔۔ محب! بات منوانے کا یہ طریقہ بالکل درست نہیں جو تم نے اختیار کیا ہے۔ ممانی کتنی پریشان ہیں۔ تمہیں اس بات کا اندازہ تک نہیں۔ ماموں الگ نیندیں گنوائے بیٹھے ہیں۔ تم ان کی آخری اور واحد امید ہو محب۔۔۔ پلیز ان دونوں کو اس طرح تنگ مت کرو۔''

اس کی بات کے اختتام پر اس نے خاموشی سے اپنی ٹانگیں میز سے ہٹالی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ یہی سمجھی تھی کہ وہ وہاں سے اٹھ کر جا رہا ہے لیکن دوسرے پل وہ کرسی آگے کی طرف گھسیٹ کر دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھی اسے گھورتی رہی لیکن پھر جلد ہی الجھ کر بولی۔

''تم مجھے پزل کر رہے ہو محب۔۔۔''

''ماہین! اگر تم مجھے روکو گی تو میں رک جاؤں گا'' وہ بڑے فیصلہ کن انداز میں کہہ رہا تھا۔ ماہین اپنی جگہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔

''میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔'' اس کے انداز نشست میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے محب۔۔۔ تمہیں اپنے والدین کی محبت کا کوئی احساس نہیں اور تم۔۔۔''

''میں تم سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر تم مجھے روکو گی تو میں رک جاؤں گا۔۔۔''

وہ اس کی بات کاٹ کر قطعی انداز میں اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں بولا تو وہ بری طرح چیخ گئی تھی۔

''پہلے مجھے وہ حق تو دلوا لو جس کے تحت میں تمہیں روک سکوں۔''

وہ بالکل بے سوچے سمجھے انداز میں بول گئی تھی لیکن اپنے اس جملے کے جواب میں اس نے محب کے تنے ہوئے چہرے پر جو سکون اترتے دیکھا تھا، وہ اسے سر پکڑنے پر مجبور کر گیا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ پہلے کے سے انداز میں سنجیدہ بیٹھا سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہا تھا۔ وہ چپکے سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ محب نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلی سیڑھی پر اس نے یونہی غیر ارادی طور پر پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑے کو جوتے کی نوک سے مسل رہا تھا اور ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ بھی کہ جسے روکنے میں وہ قطعی طور پر ناکام ہو رہا تھا۔

''یہ کیا کیا ماہین۔۔۔؟'' یقین کا سرا اس کے ہاتھ میں دے آئیں۔ اب وہ اپنی سی منوانے کے لیے کون سا انتہائی قدم نہ اٹھائے گا'' وہ مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔



''ذاتی و سماجی زندگی میں محرومی ہمیشہ ہی جارحیت کو جنم دیتی ہے یا پھر جب انسان کی اندرونی کشمکش بڑھ جائے تب وہ جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ نجمہ کو ان دونوں صورتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کی پوری زندگی میں ایک نہیں کئی محرومیاں ہیں جنہوں نے ان کی شخصیت کو بننے نہیں دیا۔ پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ اس نے رشتوں سے محرومی کا سامنا کیا۔ والدہ اس وقت فوت ہو گئیں جب اولاد کو، خصوصاً لڑکیوں کو ماؤں کی بے حد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

غیاث ان کا دور پرے کا رشتہ دار تھا جس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ باپ تو بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ ماں نے اسے محنت مزدوری کر کے پالا۔ ماں کے مرنے کے بعد گاؤں میں اس کا کوئی نہ رہا تو بابا جان اسے اپنے ساتھ شہر لے آئے۔ غیاث نے اسی گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ نجمہ نے ہوش سنبھالا تو غیاث کو اسی گھر میں پایا۔ ان کی محرومی نے انہیں غیاث کی طرف مائل کیا۔ غیاث نے انہیں اپنی محبت کا یقین دلایا۔ ساتھ جینے اور مرنے کے وعدے کیے۔

تعلیم مکمل کر کے غیاث نے شہر میں ہی سروس کر لی۔ نجمہ سوچ رہی تھیں۔ اب ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی غیاث بابا جان سے ان کا ہاتھ مانگے گا۔ وہ غیاث کی دلہن بننے کے سپنے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن غیاث ایک دن گاؤں گیا تو واپسی میں اس کے ساتھ نئی نویلی بنی سنوری دلہن تھی۔ اس نے گاؤں میں اس لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے بچپن میں اس کی ماں نے رشتہ طے کیا تھا۔ نجمہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گھر میں کسی کو ان کے جذبات سے آگاہی نہ تھی۔ نہ وہ کسی سے کچھ کہہ سکتی تھیں۔ غیاث کی بے وفائی اور سنگ دلی نے ان کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

یہاں انہیں محبت سے بھی محرومی حاصل ہوئی۔ کچی عمر کی اولین محبت۔۔۔ جو ناکامی سے دوچار ہو گئی۔۔۔ یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا المیہ تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہہ لیتیں، سن لیتیں تو شاید نارمل

ہو جاتیں۔۔۔لیکن وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی رہیں۔

باپ سخت گیر طبیعت کا تھا۔۔۔ بھائیوں کی کاروباری مصروفیات۔۔۔ بھابیاں بچوں کے مستقبل میں مگن۔۔۔بہن ازدواجی زندگی میں گم۔

وہ توجہ سے محروم تھیں۔محبت و شفقت سے محروم تھیں۔کسی سنگی ساتھی سے محروم تھیں جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے اندر کا غبار نکال سکتیں۔کوئی سہارا انہیں مل سکا کہ وہ مضبوطی سے قدم جماتی ان اونچی نیچی راہ گزاروں سے گزر جاتیں اور سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ غیاث شادی کے بعد اسی گھر میں رہا۔۔۔ان کی نگاہوں کے سامنے اپنی خوشیوں میں مگن۔۔۔نتیجتاً وہ نہ تو اس کی محبت سے پیچھا چھڑا سکیں اور نہ اس کی بے وفائی کے احساس کو بھلا سکیں۔پھر ہوا یوں کہ وہ اپنی ذات کے گنبد میں قید ہوتی چلی گئیں۔ان کی نا تمام خواہشات بند کمرے میں زہریلی تنہائی کا شکار ہوتی گئیں تو پھر ان کے وجود میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ بھر گئی۔ایک غصہ۔۔۔احتجاج۔۔۔احساسِ محرومی ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کو حد درجہ مسخ کر دیا تھا اور پھر ان کے وجود میں پھیلے زہر کو باہر نکلنے کے لیے کوئی راستہ بھی تو درکار تھا ناں۔ سو یہ راستہ چاند کی صورت ان کے سامنے آ گیا اور چاند کی شخصیت نے انہیں مزید الجھا دیا۔۔۔ان کی اندرونی کشمکش میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

چاند کے لیے وہ بیک وقت مثبت اور منفی جذبات رکھنے لگی تھیں۔وہ عمر کے اس دور میں تھیں جب فطری طور پر ایک عورت میں ممتا کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔۔۔کسی اور وجود کو اپنے وجود میں پرورش دینے اور کسی ننھے منے انسان کو اپنی گود میں کھلانے کی خواہش فطری طور پر دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔لہٰذا ایک طرف تو اس خواہش کے تحت اور غیاث کی ایک نشانی ہونے کی وجہ سے انہیں چاند سے بے حد محبت محسوس ہونے لگتی تھی اور دوسرے طرف غیاث سے نفرت انہیں چاند پر تشدد پر آمادہ کرتی تھی۔۔۔جب چاند ان کی وجہ سے یہ گھر چھوڑ کر گیا تو ان کے اندر احساس جرم جنم لینے لگا۔چاند کی غیر موجودگی میں غیاث کہیں پس پشت چلا گیا تھا اور چاند کی شخصیت جیسے ابھر کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔۔۔یہ تھی وہ ساری حقیقت جس نے انہیں نارمل سے ابنارمل بنا دیا۔اس نفسیاتی علاج کی ضرورت انہیں آج نہیں بلکہ آج سے کئی برس پہلے تھی۔''

ڈرائنگ روم میں سب لوگوں کی موجودگی میں ڈاکٹر حیات نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں نجمہ خالہ کی کیس ہسٹری بیان کی تھی اور ماہین کو احساس ہوا۔آنسو بہت دیر سے اس کے گالوں پر بہتے چلے آ رہے تھے۔اس نے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا۔ہر فرد سر جھکائے اپنی سوچوں میں غلطاں تھا۔

''ماہین! باہر آؤ۔'' چاند بھیا اس کے برابر سے اٹھ کر سرگوشی کرتے ہوئے باہر نکلے تو وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔

''کتنی عجیب بات ہے ناں چاند بھیا۔۔۔ہم لوگوں نے کبھی یہ سوچنے اور سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ نجمہ خالہ ایسی کیوں ہیں۔۔۔یا وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔۔۔بس ہر بات پر انہیں الزام دیتے رہتے تھے۔۔۔حالانکہ انہوں نے کتنی مشکل زندگی گزاری ہے۔۔۔''

''ہوں۔۔۔'' چاند بھیا کسی گہری سوچ میں تھے۔

''چاند بھیا۔۔۔کیا نجمہ خالہ کی ساری زندگی ان ہی محرومیوں کی نذر ہو جائے گی۔'' وہ حقیقتاً ان

کے لیے پریشان تھی۔

''خدا نہ کرے۔۔۔'' چاند بھیا نے فوراً اسے ٹوک دیا۔''میں نے تو ان کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''آپ نے کیا سوچ رکھا ہے۔۔۔؟'' ماہین کو حیرت ہوئی۔

''ڈاکٹر حیات کو دیکھ رہی ہو۔۔۔وہ نجمہ خالہ کے کیس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔''

''تو۔۔۔؟'' ان کے پُراسرار انداز پر وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''تو یہ کہ نا سمجھ لڑکی۔۔۔جوانی میں ڈاکٹری کے پیشے سے عشق نے انہیں کسی عورت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیا۔شادی نہیں کی۔۔۔لیکن اپنی تنہائی اور گھر کی ویرانی انہیں اکثر پریشان کر دیتی ہے اور میں نے سوچ لیا ہے۔نجمہ خالہ کو ایک مریضہ کے طور پر تو وہ قبول کر ہی چکے ہیں۔میں انہیں نجمہ خالہ کو بطور ہم سفر قبول کرنے پر بھی آمادہ کر ہی لوں گا۔''

''لیکن کیسے۔۔۔؟ آپ کیسے آمادہ کریں گے انہیں۔'' ماہین الجھ رہی تھی۔

''پہلے انہیں ان کی تنہائی کا خوب احساس دلاؤں گا اور پھر نجمہ خالہ کی تنہائی کا رونا روؤں گا۔وہ عقل مند انسان ہیں۔اس عمر میں ایک ایم۔اے انگلش پاس خوبصورت لڑکی کو چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکیں گے۔'' چاند بھیا بہت پرامید تھے۔وہ ایک ٹک انہیں دیکھے گئی۔

''چاند بھیا! آپ ان کے لیے اتنا اچھا سوچ رہے ہیں۔۔۔کیا آپ سب کچھ بھول گئے۔۔۔جو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا؟''

''جب انسان کو اپنا مستقبل بہت خوبصورت نظر آ رہا ہو ناں تو اسے اپنے بدصورت ماضی کو بھول جانا چاہیے اور جو کچھ ابھی ڈاکٹر حیات نے تمہیں بتایا۔کیا اس کے بعد نجمہ خالہ تمہیں ظالم کے بجائے مظلوم نہیں لگنے لگیں اور پھر ڈاکٹر حیات کہتے ہیں۔۔۔معاف کرنا خدائی وصف ہے۔۔۔میں نے اس وصف کو اپنانے کی کوشش کی ہے ماہین۔۔۔''

''اوہ۔۔۔چاند بھیا۔۔۔یو آر گریٹ۔۔۔'' وہ ان سے حد درجہ متاثر ہوئی تھی۔

''اچھا بس بس۔۔۔آؤ اب ذرا رتو کی خبر لے لیں۔'' وہ اسے ساتھ لیے باغ میں آ گئے۔رتو نکی بوا کے سر میں تیل ڈال رہی تھی۔

''نکی بوا! اب تیاری پکڑ لیں آپ بھی۔رتو جیسی چالاک بہو کے لیے ایک کٹر ساس کا ہونا بہت ضروری ہے۔۔۔'' چاند بھیا، نکی بوا کا ہاتھ تھامے کہہ رہے تھے۔

''ارے واہ خوامخواہ ہتھیانے آ گئے۔میری نکی بوا کو۔۔۔'' رتو بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔فوراً لڑنے لگ گئی۔نکی بوا اسے ڈانٹنے لگیں۔

''ہونے والا شوہر ہے۔۔۔خبردار جو آئندہ ایسے بات کی۔۔۔''

ماہین کو اس تکون میں اپنا آپ غیر اہم لگا تو وہ فوراً وہاں سے اٹھ آئی۔



''اے نئے سال بتا تجھ میں نیا پن کیا ہے۔''

''ماہین۔۔۔ماہین۔۔۔'' وہ ابھی ڈائری پر چند حروف ہی لکھ پائی تھی جب رتو بھاگتی ہوئی اس

کے سر پہ آ پہنچی۔

"کیا ہو گیا ہے رتو۔۔۔! کیوں خوامخواہ تنگ کر رہی ہو۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ سیما بھابھی نے نئے سال کے موقع پر گھر میں ہی ملے گلے کا پروگرام بنایا تھا۔ عبید بھیا اور اسد ان کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی اپنے کمرے میں آئی تھی اور اس دوران رتو کئی مرتبہ اسے ڈسٹرب کر چکی تھی۔ پہلی مرتبہ اسے غبارے نہیں مل رہے تھے۔ دوسری مرتبہ پٹاخے کہیں رکھ کر بھول گئی تھی اور اسد سے ڈانٹ کے خیال سے بھاگی بھاگی اس کے پاس چلی آئی تھی، اس پر رحم کھاتے ہوئے ماہین نے سارا گھر چھان مارا تھا، تب کہیں جا کر واشنگ مشین میں کپڑوں کے ڈھیر سے پٹاخوں کا لفافہ ملا تھا۔

"ہائے ربا۔۔ میں نے کہا، کسی بچے کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر اس کے سامنے سے غائب ہو گئی تھی اور اب جبکہ وہ بڑے انہماک سے ڈائری پر ۳۱ دسمبر کی تاریخ لکھ کر حسبِ حال یہ نظم لکھنے والی تھی تو وہ چیختی ہوئی ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

"اے ماہین! سنتی ہو کہ نہیں۔۔۔" وہ اس کے کان کے پاس آ کر چیخی۔

"کیا مصیبت ہے رتو۔۔۔؟" اس نے جھنجھلا کر ڈائری بند کی۔

"کوئی مصیبت نہیں۔۔۔ لیکن بتاؤں۔۔۔ وہ بڑی صاحبہ آئی ہیں۔۔۔"

"تو۔۔۔؟ کیا پہلی مرتبہ آئی ہیں۔" وہ چیخی لیکن پھر اس کے رازدارانہ لہجے پر چونک گئی۔

"ہائیں! لیکن اس وقت کیا کرنے آئی ہیں۔۔۔؟"

"ہاں اب پوچھی ہے اصل بات۔۔ چلو جا کر سنتے ہیں۔۔۔" اس نے ماہین کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ بھی اٹھ کر ساتھ ہو لی۔ بڑی ممانی چھوٹے ماموں کے کمرے میں بیٹھی تھیں کیونکہ زین اور چھوٹی ممانی بھی چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے اماں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ یہ دونوں دروازے سے لگ کر اندر سے آتی آوازوں کو سننے لگی تھیں۔

"ارے کہنا کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ آج ہی تو منہ سے پھوٹا ہے۔ کہتا ہے۔ مجھے نوکری پیشہ لڑکی سے شادی نہیں کرنی اور اتنی تعلیم کے بعد لڑکی کو نوکری نہ کرنے دینا بھی اس پر ظلم ہوگا۔ بس اتنی ہی بات تھی۔۔۔ باقی میرا بچہ آپ کے سامنے ہے۔۔۔ آپ کے ہاتھوں پلا بڑھا ہے۔۔۔ عادات و اطوار سے واقف ہیں۔ ماشاءاللہ بہت سلجھا ہوا ہے۔ آج تک برے دوستوں کی صحبت میں نہیں بیٹھا۔ پانچ سال یونیورسٹی میں پڑھتا رہا۔ اللہ کا شکر ہے، کسی لڑکی کے چکر میں آج تک نہیں پڑا۔"

"لڑکی تو گھر میں موجود تھی۔ یونیورسٹی میں چکر کس سے چلاتے۔" رتو نے اس کے کان میں سرگوشی کی جبکہ وہ اس کا یا پلٹ پر حیران تھی۔

"وہ سب ٹھیک ہے آپا! گھر کا بچہ ہے۔۔۔ لیکن میں کیا جواب دے سکتی ہوں؟ آپ ہی اس کی سرپرست ہیں یا پھر بھائی صاحب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں ان ہی سے۔۔۔"

اماں آنسو بہانے لگی تھیں۔ انہیں یقیناً ابا یاد آ رہے تھے۔ کمرے کی فضا بوجھل سی ہو رہی تھی۔ وہ رتو کو وہیں دروازے سے چپکا چھوڑ کر صحن میں آ گئی۔ وقفے وقفے سے چلتی ہوئی ہوا بدن کو کپکپائے دے رہی تھی۔ اس نے لاؤنج میں جھانکا، وہاں سیما بھابھی اور اسد غبارے پھلانے میں مصروف تھے۔ عبید

بھیا، فراز کو ساتھ لیے لاؤنج کی مختلف جگہوں میں گفٹ چھپاتے پھر رہے تھے۔ اپنا اپنا گفٹ سب کو خود ہی تلاش کرنا تھا۔ سب کو اپنی اپنی جگہ مصروف دیکھا تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اوپر آ گئی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا اور محب غالباً ابھی اپنے لیے چائے بنا کر کچن سے نکلا تھا۔ اسے دیکھ کر بے اختیار ہی ٹھٹھک گیا۔

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" اس نے صحن کی لائٹ روشن کی۔

"چائے کا کپ سر پہ انڈیل کر دیکھ لو۔۔۔ خود ہی پتا چل جائے گا۔" وہ بڑے اطمینان سے کہتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ چائے کی دیگچی خالی پڑی تھی۔

"آدھی۔۔۔ آدھی کر لیں۔۔۔" اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے فوراً تجویز پیش کی۔ تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پوری لے لو۔" اس نے فوراً اپنا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ ماہین نے دیکھا، وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا اور اس خوشی کو چھپانے کے لیے اسے خوامخواہ الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماہین نے خاموشی سے کپ اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ پہ رکھ دیا۔

"یہ سب کیسے ممکن ہوا۔۔۔ اور وہ بھی اتنی جلدی۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھتے ہوئے براہِ راست سوال کیا تو لمحہ بھر کے لیے وہ گڑبڑا سا گیا۔

"کیسے ممکن ہونا تھا۔۔۔؟ میں نے کہہ دیا، میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا جو گھر گرہستی کو بھول کر اپنے کلینک اور مریضوں کی ہو کر رہ جائے۔ پھر ابا نے تمہارا نام تجویز کر دیا اور امی رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔"

"بس اتنی سی بات۔۔۔؟" خاصا گھڑا گھڑایا جواب ملا تھا۔ اسے مطمئن نہیں کر سکا۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔؟ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ تم آج اشارہ کرو۔۔۔ امی آج تمہارے ہاں پہنچ جائیں گی۔"

"مجھے لگتا ہے۔۔۔ تم مجھے بنا رہے ہو۔۔۔؟" وہ اس کے مشکوک انداز پر اسے گھورنے لگا تھا۔

"ممانی عفت کے لیے اس قدر جذباتی ہو۔۔۔"

"محترمہ! ممانی کا بیٹا آپ کے لیے ممانی سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس معاملے کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ میں پسٹل پکڑا، دوسرے ہاتھ میں سلیپنگ پلز اور ایک تگڑی قسم کی دھمکی دے دی کہ جس سے چاہیں شادی کر دیں۔ بس ایک عفت سے نہیں کروں گا۔ اماں کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔۔۔ ابا میرے ہم نوا تھے۔ لوہا گرم دیکھا تو فوراً چوٹ لگا دی۔ 'ماہین کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔؟' میں نے کہا۔ آپ کا فرمانبردار ہوں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔۔۔ بس ظاہر ہے، امی کو بھانجی سے زیادہ بیٹا عزیز تھا۔ اس لیے پہنچ گئیں نچلے پورشن میں۔" اس نے چٹکیوں میں بات ختم کی۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔ تم نے اس طرح بلیک میل کیا انہیں۔۔۔؟" وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بالکل۔۔۔ وہ کسی اور طرح بلیک میل ہونے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ لیکن اب تم کیا اس بات پر

اظہارِ افسوس کرتی رہو گی۔"

"نہیں۔ میں کیوں اظہارِ افسوس کروں گی۔ میں تو جا رہی ہوں نیچے۔۔۔" وہ ہاتھ جھاڑتی ہوئی کچن سے باہر آئی۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"اپنا انکار بھی تو پہنچانا ہے ناں بڑوں کو۔۔۔" وہ بڑی سنجیدگی سے آگے بڑھی تھی۔ محبت نے لپک کر اسے بازو سے پکڑ کر روکا اور حد درجہ حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماہین۔۔۔؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے ایسے شخص کا ہاتھ ہرگز نہیں قبول جو اتنا بڑا چیٹر ہو۔ جو سگریٹ پیتا ہو۔۔۔ میز پہ ٹانگیں رکھ کر بیٹھتا ہو۔۔۔ اور لڑکیوں سے خراب لہجے میں بات کرتا ہو۔۔۔ بلکہ بچپن میں مجھے تنگ بھی کیا ہو۔"

وہ جان بوجھ کر اسے ستا رہی تھی لیکن محبت ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تم ایسے شخص کا ساتھ تو قبول کر سکتی ہو ناں جو تمہارے دل کی آواز پر تمہارے پاس پہنچ جاتا ہو۔ مشکل میں تمہاری مدد کر سکتا ہو اور تمہاری محبت میں ساری دنیا سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔"

"مجھے آج پتا چلا ہے کہ تمہاری آواز اتنی خوبصورت ہے۔" ماہین اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"آئندہ بھی مزید انکشافات ہوں گے۔۔۔"

"اب چلتی ہوں۔۔۔" اسے رومانٹک ہوتے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی مگر وہ راستے میں حائل تھا۔

"اپنی محبت کی طویل عمر میں، میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا۔ آج صرف یہ آدھا گھنٹہ مانگ رہا ہوں۔"

وہ گھڑی کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بڑی امید سے کہہ رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ ماہین چلتی ہوئی دیوار کے پاس آ رکی اور نیچے جھانکنے لگی۔

"انسان کی زندگی میں بعض گھڑیاں ایسی بھی آتی ہیں جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے خوبصورت ترین ماہ و سال کا آغاز ہونے والا ہے۔ یہ گھڑیاں مجھے کوئی ایسا ہی سندیسہ دیتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔۔۔"

محبت اس کے برابر میں کھڑا تھا۔ ماہین نے ٹھنڈی یخ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔ خوشی کا بھرپور عکس اس کے چہرے پہ جھلملا رہا تھا۔ ماہین کو اس لمحے وہ بہت خوبصورت لگا تھا۔

"یا شاید یہ ہے ہی خوبصورت۔۔۔ میں نے کبھی غور سے دیکھا بھی کہاں ہے؟" وہ سوچنے لگی۔

محبت اسے ایک منٹ رکنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ واپس آتے ہوئے اس نے صحن کی لائٹ بجھا دی تھی۔

"ارے۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ میں تمہیں یہ گفٹ دینا چاہتا ہوں۔۔۔" وہ بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔

"کھول کر دیکھو۔۔۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، اس کی روشنیوں میں تمہارا خوشی سے دمکتا چہرہ کیسا

لگتا ہے۔" کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ چڑ جاتی۔ مگر اب غالباً ماحول کا اثر تھا کہ وہ خاموشی سے گفٹ کھولنے لگی تھی۔ گفٹ کھولنے پر محبت نے ہاتھ بڑھا کر کوئی چھوٹا سا بٹن پُش کیا تھا اور اگلے ہی پل وہ مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔

"اوہ میرے خدا۔ یہ۔۔۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔۔۔ بہت خوبصورت۔"

وہ کرسٹل کا بنا ہوا ایک ڈیکوریشن پیس تھا۔ چھوٹے سے گلدان میں دو ادھ کھلے گلاب جو بٹن دبانے سے سرخ روشنی منعکس کرنے لگے تھے اور کرسٹل کی ہی نہایت مہارت سے تراشی گئی پتیوں میں سبز روشنی سی بھر گئی تھی۔ رات کے اس پہر جب آسمان پر چاند ستارے روشن تھے اور سرد موسم میں دل جذبات کی گرمی سے معمور تھے، یہ تحفہ اسے زندگی کی طرح خوبصورت لگا تھا۔

"سنو۔۔۔ کوئی نظم تو سناؤ۔۔۔ بہت اچھی اور خوبصورت۔۔۔" محبت نے اس سے پہلی بار فرمائش کی تھی۔

وہ صرف چند لمحے سوچنے کے بعد اسے نظم سنانے لگی تھی۔

آنکھوں کو چھو رہے ہیں ستاروں کے نرم ہاتھ
پلکوں پہ آ رکی ہے تمنائے کہکشاں
زلفوں کے تار تار سے پھوٹی ہیں مستیاں
ہونٹوں کو چومتی ہے شرارت سے چاندنی
پیروں کی لغزش ہیں صراحی کی ہچکیاں
رستوں میں ہر طرف ہیں گل یاسمین کھلے
خوشبو میں کیوں نہ گوندھ لیں کرنوں کے ہار ہم
سنتے ہیں چاندنی یونہی برسے گی رات بھر
مجھ کو پکارئیے تو ذرا احتیاط سے
ایسا نہ ہو کہ کانچ کی دیوار گر پڑے
میں خواب کے سفر میں ہوں
آہستہ بولیے

وہ بند آنکھوں سمیت خوبصورت لہجے کے ساتھ نظم سناتی چلی گئی۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے سجے خوابوں کی ملائمت محبت نے اپنی پلکوں پر بھی محسوس کی تھی۔ وہ اسے یونہی اپنے آپ میں گم کھڑے دیکھتے رہنا چاہتا تھا لیکن عین اسی وقت اطراف سے زوردار دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ چونک گئے۔

"نیا سال مبارک۔" ماہین نے ابتدا کی تھی۔

"تمہیں بھی۔۔۔"

"ماہین۔۔۔ ماہین۔۔۔" نیچے رتو چیخ رہی تھی۔

"توبہ ہے، یہ رتو سارے جہان کو خبر کر دے گی۔" وہ فوراً نیچے کی طرف لپکی۔ وہ بھی اتنی ہی تیزی

سے اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

''ارے۔۔۔'' وہ ٹھٹھکی۔

''میرا داخلہ ابھی تک نچلے پورشن میں ممنوع نہیں ہوا۔۔۔'' اس نے فوراً وضاحت کی۔

ماہین کچھ لمحے دیکھتی رہی اور پھر کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے نیچے اترنے لگی۔ جہاں ایک ہنگامہ گرم تھا۔ خوشیاں اور رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ آسمان پر دمکتا چودھویں کا چاند اور درخشاں ستارے نئے سال کی ان اولین ساعتوں میں ان کی دائمی خوشیوں کی دعا کرتے ہوئے کائنات پر جھک آئے۔ چاندنی میں نہایا ہوا ہر منظر بہت واضح اور روشن تھا۔

چاندنی میں نہار ہی تھی رات
اور جگنو دعائیں کرتا تھا
آج آنکھوں سے نیند اڑ جائے

✠ ✠ ✠ ✠ ✠

ان ہی کے دم سے چراغاں

دادی اماں کہتی تھیں ان کی اس گھر میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ سو اس نے زمانے بھر کی جھوٹی نمبر ایک دادی پر یقین کر لیا۔ بالکل دل سے۔۔۔ اور یہیں اس سے غلطی ہوئی تھی۔ خیر یقین کر لیا، آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چل دی۔ یہاں اس سے دوسری غلطی ہوئی تھی، آنکھیں کھلی رکھتی تو معلوم ہو جاتا کہ دادی کہاں جا رہی ہیں بلکہ اسے بھی لیے جا رہی ہیں۔

اور اب۔۔۔

جب کہ وہ اسے یہاں لے کر آ چکی تھیں ایک دھوبی گھاٹ میں تو وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے بٹر بٹر اپنے سامنے کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ کھلا سا صحن تھا۔ جس میں تنی ہوئی تاروں پر دھلے کپڑے یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے اور سب کے سب مردانہ۔

مردانہ جرابیں، مردانہ قمیصیں، مردانہ شلواریں، مردانہ بنیانیں۔۔۔

نہ کوئی فراک۔ نہ چوڑی دار پائجامے، نہ کرتے، نہ دھنک رنگ دوپٹے، لال، سبز سبز، پیلا سب رنگ غائب، عجیب بلیک اینڈ وائٹ سا منظر تھا۔

وہ تو سہم کر دادی کے پیچھے چھپنے لگی۔

ان کی ململ کی قمیص مٹھی میں دبوچی۔ چٹکیاں کاٹیں، کانوں میں گھسی۔

مگر دادی تو ٹس سے مس نہ ہوئی تھیں۔

وہ تو ہمیشہ ہی چڑتی تھی دادی کی ڈھٹائی سے مگر آج تو حد ہو گئی تھی۔

خالی مکان۔۔۔ بالکل ویران۔۔۔ بیابان۔۔۔ نہ آدم بو نہ آدم ذات۔

''اگر'' یہاں کوئی رہتا تھا، تو اس وقت ہرگز گھر میں موجود نہ تھا۔ اور دادی۔۔۔ کس قدر رازداری سے دبے پاؤں چلتی ہوئی پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اگر کوئی آجائے تو کیسی سبکی ہوگی۔۔۔" اس کے ماتھے پہ پسینہ نمودار ہونے لگا۔

"چوروں کی طرح گھر میں گھس گئے۔۔ نہ گھنٹی بجائی، نہ دستک دی۔ آواز بھی نہیں لگائی اور۔۔۔"

وہ بے چینی سے دو قدم آگے بڑھی۔ دادی نجانے کون سے کمرے میں گھس گئی تھیں بلا اجازت، اسے وہیں صحن میں تنہا چھوڑ کر۔

"اللہ کہیں یہ گھر آسیب زدہ نہ ہو۔ اتنی خاموشی ہنستے بستے گھر میں تو نہیں ہوتی۔"

وہ ہاتھ مسلنے لگی۔ صحن میں اترتی ہلکی ہلکی شام میں عجب وحشت بھری تھی۔ اسے چہار اطراف پھیلی تنہائی سے خوف آنے لگا۔ تار پہ سوکھے کپڑے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔

"ہوا تو نہیں چل رہی۔۔۔" اس نے پسینہ خشک کیا، تھوک نگلنے کی کوشش کی۔۔۔

خود کو بہادر بنانا چاہا لیکن خوف کے پاؤں نہیں ہوتے، وہ سامنے سے نہیں آتا، عقب سے حملہ آور ہوتا ہے۔ چھلانگ لگا کر آتا ہے لمحوں میں۔۔۔ اور حاوی ہو جاتا ہے۔

اور اسے اس آسیب زدہ شام میں، صحن کی تنہائی میں لگ رہا تھا کہ کپڑے ہل رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہل رہے ہیں بلکہ تاروں سے نیچے اتر رہے ہیں۔

سب سے پہلے جرابیں دھم دھما دھم، اچھلتی کودتی اس کے آس پاس رقص کرنے لگی ہیں اور وہ قمیص۔۔۔ جس کے بازو سب سے لمبے ہیں وہ آئے گی اور اس پر تابڑ توڑ حملے کر دے گی۔ دھن دھنا دھن۔

اور وہ سفید ازار بند، جو دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ آئے گا اور پھندے کی صورت اس کے گلے کے گرد لپٹ جائے گا اور اسے کسی پھانسی دیے ہوئے مجرم کی طرح صحن کے عین وسط میں لٹکا دے گا، کسی ان دیکھے درخت کے ساتھ۔

آنے والے آئیں گے اور دیکھیں گے، اس کا نیلا پڑتا چہرہ گز بھر لمبی زبان منہ سے باہر۔

"اے لڑکی!" نہ جانے کس نے پکارا، کس نے چھوا۔۔۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔

"کون ہو تم۔۔۔؟"

آواز عقب سے آ رہی ہے۔ اس نے ذرا کی ذرا مڑ کر آنے والے کی طرف دیکھا اور اس عجیب و غریب وضع قطع رکھنے والے مرد کو دیکھ کر جہاں اس کے چہرے کا رنگ اڑا وہیں وہ بگٹٹ وہاں سے بھاگ لی تھی۔ سیدھی اس طرف جہاں سے اسے دادی ایک کمرے سے نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"کون ہو تم دونوں۔۔۔؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟" آنے والا مرد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کی طرف لپکا تھا۔

"اے خدا کی مار تجھ پر کلموہے۔۔۔ کیا قہر بن کر ٹوٹے پڑے ہو۔ دھیرج سے بات نہیں کر سکتے کیا۔ بچی کو ڈرا کر رکھ دیا خوامخواہ۔"

دادی نے لرزتی کانپتی بچی کو بانہوں میں سمیٹا جو خوف کھائی آنکھوں کے ساتھ اس مرد کو دیکھ رہی تھی جس کے کھچڑی بالوں میں برابر کی سیاہی اور سفیدی آپس میں گھل مل سی گئی تھی۔ وہ اپنے پورے قد سے کھڑا ہونے کے بجائے جھکا کھڑا تھا۔ اتنا کہ وہ پانچ فٹی دادی کے بالکل برابر ہو گیا تھا اور سب سے

عجیب چیز وہ کُب تھا جو اس کی پشت پر بہت نمایاں تھا۔ اتنا نمایاں کہ جیسے ایک چھوٹے سائز کا فٹ بال اس نے اپنی قمیص کے نیچے پشت کے عین درمیان میں باندھ رکھا ہو۔ صرف بچوں کو ڈرانے کے لیے اور اب اسے بھی ڈرا رہا تھا۔ اپنی میلی گدلی آنکھوں میں قہر بھرے۔ خونخواریت سے گھورتے ہوئے وہ مزید دادی کے بازوؤں میں سمٹنے لگی۔

تب ہی ایک پاٹ دار آواز گھر کے لحاتی سناٹے میں گونجی تھی۔

"کبڑے میاں! ارے کون چیخا تھا یہاں، بلکہ چیخی تھی۔ پڑوس میں آواز سن کر میں تو بھاگی چلی آئی۔"

اور بھاگنے والی اپنے جس بھاری بھرکم وجود کے ساتھ بھاگی چلی آ رہی تھیں تو وہ بھی اک معجزہ تھا اور ان کے بھاگنے کے باوجود گراں سب کے سروں پر چھت اور پیروں تلے زمین قائم تھی تو وہ ایک اور معجزہ تھا۔

"حسنہ آپا! گھر کھلا چھوڑ کر کہاں چل دی تھیں آپ۔۔۔ اب خدا جانے کب سے یہ دونوں۔۔۔" اس مرد کی آواز اس کی صورت سے زیادہ بھدی تھی۔

"اوئی اللہ۔۔۔ چورنیاں۔۔۔" حسنہ آپا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ ابھی حال ہی میں محلے میں ایسی واردات ہوئی تھی، دو نہایت شریف نظر آنے والی خواتین باتھ روم میں جانے کے بہانے کسی گھر میں گھس آئیں۔ چند لمحوں بعد گھر والے سب باتھ روم میں۔۔۔ اور خواتین قیمتی ساز و سامان کے ساتھ چمپت۔۔۔

"شاباش ہے حسنہ! شاباش۔۔۔ یعنی کہ اب ہم چور ہیں۔ ڈاکو ہیں، ارے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے کیا۔۔۔؟ ہمیں پہچان ہی نہ سکیں۔"

"لاحول ولا۔۔۔" وہ سٹپٹا کر دادی سے علیحدہ ہوئی۔ انہیں شوق تھا، ہر محاورے کو اپنی مرضی کے معنی پہنانے کا۔ وہ تو شکر ہوا کہ خاتون محاورے پر غور کرنے کے بجائے دادی پر غصہ فرما رہی تھیں۔

"اے بڑی بی! میں نے واقعی آپ کو نہیں پہچانا۔۔۔"

"لیجیے بات ختم۔۔۔ قصہ پاک۔۔۔" اس نے ہاتھ جھاڑے اور قریبی کرسی پر ڈھے گئی۔۔۔

"اور دادی کہتی تھیں۔ ان کی اس گھر میں بڑی عزت ہے۔ لیکن یہ لوگ لگتا ہے "عزت" کے بجائے "عزت افزائی" کرنے والے ہیں۔"

وہ دادی کو دیکھ رہی تھی جو بڑی چاپلوسی سے حسنہ آپا کو لیے کمرے میں چل دی تھیں اپنا تعارف کروانے کے لیے۔ حسنہ آپا شش و پنج میں مبتلا ان کے ساتھ ساتھ تھیں اور اسے خوب معلوم تھا دادی کا تعارف کیا ہے؟

"میں فلاں ابن فلاں ابن فلاں کی فلاں فلاں ہوں۔۔۔ کچھ یاد آیا۔۔۔ کوئی بھولا بسرا چہرہ؟ کوئی گمشدہ تعارف؟ کوئی کھویا ہوا رشتہ دار؟

"ہاں بس میں وہی ہوں جس سے پہلی مرتبہ تم ملی تھیں تو چہرے کا رنگ یوں جھلسا ہوا نہیں تھا۔ اس وقت قدرت مجھے بنا کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھے۔ بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور آج۔۔۔

مجھے مٹانے کے درپے ہے۔
ان دنوں آنکھ کا نور اپنے جوبن پر تھا اور آج۔۔۔
وہی نور میری پلکوں تلے دم توڑنے کو ہے۔۔۔
وہ وقت اور تھا جب زندگی میرا رنگ دیکھا کرتی تھی۔
یہ وقت اور ہے جب میں زندگی کے رنگ دیکھ رہی ہوں۔

ہاں میں وہی ہوں۔ جو ایک بوڑھے، خرانٹ مالک مکان کے دومرلے کے گھر میں گزارہ کرتی تھی۔ جس کے ایک کمرے میں، میں نے اپنی دکان کھول رکھی تھی اور اس دکان میں رکھے گھی، آٹے، دالوں اور بچوں کی ٹافیوں کی فروخت سے میں اپنا اور اپنی پوتی کا پیٹ پالتی تھی۔

وہ پوتی جو باہر برآمدے کی کرسی پر سر نیہوڑائے بیٹھی ہے اور جو بہت ہی سیاہ بخت ہے۔

وہ جب پیدا ہوئی تھی تو اپنی ماں کو کھا گئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا باپ اسے بخت آور کہتا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے باپ کو بھی کھا لیا تھا۔ اس وقت جب وہ اسے اسکول میں داخل کروانے کے لیے جارہا تھا اور ایک تیز رفتار گاڑی اسے کچل کر چلی گئی تھی وہ پھر بھی زندہ رہی تھی۔

اور پھر بھی۔۔۔ بخت آور کہلاتی تھی۔

اور اب میں اسے کچھ اور سیاہ بختیوں سے بچانے کے لیے اپنے بوڑھے پروں میں چھپائے بھاگ نکلی ہوں کہ وہ بوڑھا، خرانٹ مالک مکان کسی کالے منحوس بلے کی طرح ہمارے گھر کی دیواروں پر منڈلانے لگا تھا۔

یہ ہے ہمارا تعارف۔ ہم دونوں کی پہچان۔ ہاں ٹھیک ہے دور کی رشتہ داری ہے۔ لیکن ہے تو سہی نا۔۔۔ اور اب تو تم یہ نہیں کہہ سکتیں نا کہ تم نے ہمیں پہچانا نہیں۔"

"ارے سو گئی ہو کیا" اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

دادی اس پر جھکی ہوئی تھیں، اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور بھاری ہوتا سر جھٹک کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

نیند کہاں آرہی تھی؟ سوئی بھی نہ تھی۔ بس ایک غبار سا چھا گیا تھا گویا
جب آنکھ کھلی تو نہ زیاں تھا، نہ سود تھا۔

وہی آسیب زدہ گھر، وہی کبڑے میاں، جو اب سارے دھلے دھلائے، خشک کپڑے تاروں سے اتار کر انہیں تہہ کر چکے تھے اور اب چیزوں کو اٹھانے، رکھنے کے بہانے پورے گھر میں چکراتے پھر رہے تھے۔ ان کے بھاری جوتوں کی دھمک گھر میں پھیلی خاموشی پر خراشیں ڈال رہی تھی۔ اور پچھلے آدھے گھنٹے سے مسلسل انہیں چلتے پھرتے دیکھ کر اسے یقین ہو چکا تھا کہ ان کے کاندھوں کے درمیان بچوں کو ڈرانے کے لیے فٹ بال نہیں تھا بلکہ سچ مچ کا کب تھا۔ اونٹ کے کوہان کی مانند۔۔۔

اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر کبڑے میاں باورچی خانے کے دروازے پر رک کر یک لخت اس کی طرف پلٹے تو وہ فوراً ہی گھبرا کر دادی کی طرف متوجہ ہوگئی جو اب حسنہ آپا سے اس کا تعارف کروا رہی تھیں۔

"یہ ہے بخت آور۔۔۔"

حسنہ آپا اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے برابر آبیٹھی تھیں۔

"اے حسنہ! تم نے بتایا نہیں، تمہارے کتنے بچے ہیں۔۔۔؟" دادی نے فطری تجسس کے تحت پوچھا۔

"چار بیٹے ہیں ماشاء اللہ۔"

وہ دادی پوتی اس کے آگے کی تفصیل جاننے کی منتظر تھیں مگر حسنہ خاموش ہو چکی تھیں۔

"اور بیٹیاں؟"

"کوئی نہیں اماں۔۔۔ بس بیٹوں سے گھر بھرا ہے۔"

"ہائیں۔۔۔!" دادی نے گڑبڑا کر بخت آور کو دیکھا جس کی آنکھیں شرقاً غرباً حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ دادی کو بھاگ چلنے پر اکسا رہی تھیں۔

"اے حسنہ! پانی تو پلاؤ ذرا۔۔۔" دادی نے خشک گلے پر ہاتھ پھیرا۔ حسنہ کے چار جوان جہان بیٹے ان کی نگاہوں کے سامنے آ کر اودھم مچانے لگے تھے۔

"کبڑے میاں! ذرا پانی تو لانا۔ اور چائے کا پانی چولہے پر رکھ دو" حسنہ نے آواز لگائی۔

"چائے کا تکلف نہ ہی کیجیے۔" اس نے مروتاً کہنا چاہا مگر دادی کی کہنی اس کی پسلی میں کسی میزائل کی طرح لگی تھی۔

"نہیں بھئی، اگر وہ چائے پلانا چاہ رہے ہیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

دادی کا ندیدہ پن اسے ہمیشہ ہی چلو بھر پانی میں ڈوبنے پر مجبور کرتا تھا مگر اب وہ صرف اپنی پسلی سہلا رہی تھی کہ اس کی تو مروت بھی باعث افزائش 'درد' ہی ثابت ہوئی تھی۔

"ویسے اماں بی! ایک بات کہوں۔۔۔؟ برا مت ماننا۔۔۔ جوان لڑکی کو اب تک گھر میں بٹھائے رکھا۔ اچھا ہوتا کہیں دو بول پڑھوا دیتیں، تمہاری ذمہ داری تو ختم ہوتی۔" وہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں، بخت آور پہلو بدلنے لگی۔

"ہاں بھئی! دادی کی عزت ہے گھر میں۔۔۔ پوتی جائے بھاڑ میں۔۔۔"

شربت سے بھرا گلاس اس کی نظروں کے عین سامنے آ گیا تھا۔ اس نے چپ چاپ گلاس تھام لیا اور اس کی ٹھنڈک کو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کرتے ہوئے کن اکھیوں سے دادی کو دیکھنے لگی۔

پی جس قدر ملے، شب مہتاب میں شراب

کے مصداق غٹاغٹ گلاس پہ گلاس چڑھائے جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں انہوں نے حسنہ کی بات سنی بھی تھی یا پھر سن کر نظر انداز کر دی تھی۔ اس نے لمبی سی سانس کھینچتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

صحن کی دائیں دیوار کے ساتھ چھوٹے سے کمرے کا دروازہ سبز رنگ کا تھا۔ جسے عجلت میں کھول کر اس نے قدم اندر رکھا تو غڑاپ سے گھٹنوں کے بل کمرے کے فرش پر جا گری بغیر کوئی آواز نکالے۔

کیا ہوا تھا؟ یہ سوچنے کا اس کے پاس وقت ہی نہ تھا کیونکہ اس کے پیچھے دادی بھی اس کمرے میں داخل ہونے والی تھیں۔ وہ تو گرنے کے بعد خود ہی اٹھ جاتی لیکن اگر دادی گر جاتیں تو انہیں بس اللہ ہی اٹھاتا۔ سو اس نے فوراً ہی چیخ کر دادی کو خبردار کیا۔

دادی جو اس سے محض ایک قدم پیچھے کھڑی تھیں۔ ہکا بکا سی کمرے کی نیم تاریکی میں اپنی پوتی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جواب سے صرف ایک لمحہ قبل ان سے آگے کھڑی تھی اور دوسرے لمحے غائب ہو چکی تھی۔ آواز البتہ بدستور آ رہی تھی۔

''دادی! آگے مت آنا۔''

''کیوں۔۔۔ آگے شیر کھڑا ہے؟''

''نہیں دادی! آگے کنواں ہے۔'' اس نے اپنے زخم گزیدہ گھٹنے سہلاتے ہوئے کمرے کے فرش کو دیکھا جو صحن کے فرش سے کم از کم ایک ڈیڑھ فٹ نیچا تھا اور سیڑھی نام کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ وہ ہائے وائے کرتی بمشکل اٹھی اور اٹھتے ہی دادی کی کمر سے لپٹ گئی۔

دادی کسی نو عمر دوشیزہ کی طرح ''ہائیں ہائیں۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے'' کرتی ہوئی بری طرح مچلیں مگر اس دوران وہ انہیں کھینچ کھانچ کر کمرے کے فرش پر اتارنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

''لیجیے سنبھالیے اپنا مال۔۔۔'' اس نے اپنے مال و اسباب کی دونوں گٹھڑیاں دادی کی طرف اچھالیں اور خود چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔

ایک ہی شہتیر پر ڈالا گیا یہ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ دو چارپائیاں اور ایک چھوٹی سی میز رکھنے کے بعد اس میں کسی اور چیز کے رکھنے کی گنجائش ہی نہ بچی تھی۔

ان کی آمد سے قبل یہ کمرہ ایک اسٹور تھا اور اب جو قدرے معقول حالت میں نظر آ رہا تھا تو وہ سارا کا سارا تائی حسنہ کے بیٹوں اور کبڑے میاں کی کارکردگی کی بدولت تھا۔

''دادی! میں تو اب سونے لگی ہوں، اس لیے مجھے تنگ مت کرنا۔'' دادی گٹھڑیاں کھول کر سامان ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھیں سو اس نے پہلی ہی خبردار کیا اور خود سرتا پا دوپٹہ تان کر لیٹ گئی۔ کمرے کے در و دیوار سب دھلے ہوئے تھے لہٰذا ہلکی سی خنکی جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب وہ پرسکون حالت میں تھی ورنہ کل سے تو بہت بے زاری و بے آرامی سہہ رہی تھی۔ کل شام جوں ہی تائی حسنہ کے چاروں بیٹوں کی گھر میں آمد شروع ہوئی، دادی نے اسے ایک کمرے میں محصور کر دیا۔ وہ تو بعد میں خبر ہوئی کہ کمرہ بھی تائی حسنہ کے سپوتوں کا ہی تھا۔ دیواروں پر لگے بڑے بڑے پوسٹرز بھی اسی چیز کی نشاندہی کر رہے تھے۔ کوئی بیٹ پکڑے کھڑا ہے تو کوئی مکا تانے۔ ایک بہت بڑے بن مانس کی تصویر تھی۔

وہ سوچتی رہی ''یہ جانے کون سے نمبر کا بیٹا ہے؟''

اسی دوران ان کے دو عدد بیٹے بھی اپنا جلوہ کرا گئے تھے۔ اپنی دانست میں بہت معصوم بن کر دروازے سے ٹھوکر کھا کر اندر آئے تھے یوں جیسے آئے نہیں، بھیجے گئے ہوں اور کمرے میں آ کر اس کی موجودگی پر بھرپور اظہار حیرت۔۔۔ کچھ اس طرح کہ ان کی لاعلمی پر قربان جانے کو دل چاہے۔

''ارے آپ کون؟ اور یہاں۔۔۔؟''

دوسرے والے نے تو حد ہی کر دی تھی۔

''اف! یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟ لڑکی؟ یعنی کہ ایک لڑکی۔۔۔؟ ہمارے گھر میں۔۔۔ لڑکی۔۔۔؟''

اور اظہار حیرت کے بعد یوں بغیر اجازت اندر آ جانے پر معذرت۔۔۔

صاف صاف بہانہ تھا اس سے بات کرنے کا مگر اس قدر بھونڈی اداکاری کہ اس کا دل کھری کھری سنا دینے کو چاہا۔ پہلا پہلا دن تھا سو خاموش رہی ورنہ منہ کے اندر زبان تو مسلسل بل کھا رہی تھی۔ دادی اسے یوں خاموش بیٹھا دیکھ لیتیں تو مارے حیرت کے بے ہوش ہو جاتیں۔ شکل و صورت کے دونوں معقول تھے، دونوں باری باری اندر آئے تھے۔

''آپ کون۔۔۔؟'' ایک کی آنکھیں ذرا بڑی تھیں اور وہ کمبخت آدھی گفتگو آنکھوں کے ذریعے ہی کر رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اسے گھورتی رہی۔ جواب دینے کی زحمت نہ کی تو وہ خود ہی اپنا تعارف کروانے لگا تھا۔

''میرا نام شعیب ہے۔۔۔ پیار سے پیا کہتے ہیں۔'' ''پیار'' پر زور دیا گیا تھا۔

''یہ تصویر آپ کی ہے یا آپ کے بھائی کی۔'' اس نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

پیا صاحب نے پوری توجہ سے پی کیپ لیے ہوئے، کون کھاتے بن مانس کو دیکھا اور پھر ناک کی سیدھ میں جو منہ اٹھا کر بھاگے تو جاتے جاتے ہوئے دروازے کے پٹ سے یوں ٹکرائے جیسے اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

دوسرا بڑی بہادری سے آیا تھا۔ بات بات پر مسکرانا شاید اس کی عادت تھی۔ چنانچہ اس بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے بخت آور نے اس سے بھی اپنا سابقہ سوال پوچھا تو مسکراہٹ جیسے اس کے چہرے سے چپک سی گئی ہو، اسی مسکراہٹ کے ساتھ وہ دروازے کی طرف لپکا اور جاتے ہوئے اپنی ایک چپل بھی وہیں بھول گیا۔ ذرا سی دیر بعد ایک چھڑی دروازے سے اندر آئی تھی اور چپل گھسیٹ کر لے گئی تھی۔ اسے تو بھگانے کا ٹوٹکا مل گیا تھا۔ تیسرا آتا تو وہ اس سے بھی یہی سوال کرتی مگر تیسرے کی آمد سے قبل ہی دادی بھاگی چلی آئی تھیں، افتاں و خیزاں۔۔۔

''کم بخت مارے، ایک کے بعد دوسرا۔۔۔ اندر ہی گھسے جا رہے تھے۔ کیا کرنے آئے تھے، کچھ کہا تو نہیں تم کو۔۔۔؟''

اف دادی کے سوال و جواب۔۔۔ وہ چڑ گئی۔

''اگر کچھ کہتے، تو کیا اپنے پیروں پر چل کے جاتے وہ۔۔۔ کمال کرتی ہیں دادی آپ بھی۔''

''یہ درمیان والے دونوں مجھے پورے شیطان لگتے ہیں۔ چھوٹا پھر بھی معصوم لگ رہا ہے۔ بڑے کو ابھی دیکھا نہیں۔'' دادی اسے رپورٹ دے رہی تھیں جسے اس نے بڑی غیر دلچسپی سے سنا تھا۔

رات کا کھانا اسی کمرے میں تائی حسنہ کے ساتھ کھایا تھا۔ مٹر گوشت اور پھولی پھولی کشمش والی فرنی، دادی کی تو پانچوں گھی میں تھیں اور فرنی سے رغبت دیکھنے کے لائق۔ وہ کھاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ دادی کی اس گھر میں واقعی بڑی عزت ہے لیکن یہ خیال بھی چند لمحوں کا تھا۔ ذرا دیر میں ہی معلوم ہو گیا کہ یہ سارا اہتمام ان کے لیے نہ تھا بلکہ تائی حسنہ کے بڑے بیٹے کے لیے تھا جو اسلام آباد سے آج رات ہی میں واپس پہنچنے والے تھے۔

''لڑکوں سے کہا ہے کمرہ خالی کرنے کے لیے۔'' تائی حسنہ نے اکتائے ہوئے انداز میں بتایا

تھا۔

''آئے ہائے ان بیچاروں کو کیوں لگا دیا کام سے۔ خوامخواہ ہم بن بلائے مہمانوں کو کوستے ہوں گے۔ صبح ہوتی تو ہم دونوں مل کر خود ہی۔۔۔''

دادی نے اس پوری ملاقات کے دوران پہلی عقل مندی کی بات کہنا چاہی تھی مگر انہوں نے ٹوک دیا۔

''سارے گھر کا کاٹھ کباڑ رکھ چھوڑا ہے وہاں، آپ کے بس کی بات کہاں تھی اور پھر میرے بچے ایسے نہیں۔ بہت ہاتھ بٹاتے ہیں میرا اور پھر کبڑے میاں ہیں نا، وہ کروا لیں گے۔''

ان کا جواب سن کر دادی خاموش ہو رہیں۔ صاف ستھرا کمرہ مل جاتا تو بھلا وہ کاہے کو ناخوش ہوتیں، باہر خوب غل غپاڑا مچا ہوا تھا۔

شور ہنگامہ۔۔۔ بے ہنگم قہقہے، چیخم دھاڑ، معلوم نہیں صفائی ہو رہی تھی یا دنگل۔۔۔

بعد میں کبڑے میاں نے آ کر خبر دی تھی۔

''اسٹور روم میں اتنا کچھ پڑا ہے کہ صفائی کرنے کے بجائے خودکشی کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ تاہم اسے ایک صاف ستھرے کمرے کی شکل دیتے دیتے صبح تو ہو ہی جائے گی۔ لہٰذا مہمانوں سے درخواست کر دیں کہ وہ آج رات اسی کمرے میں قیام فرمائیں۔''

خبر نامہ ختم ہو گیا۔۔۔ کبڑے میاں اپنی چپل سے فرش کو گھستے واپس لوٹ گئے۔ دادی نے جھٹ سے ایک چارپائی سنبھال لی۔ وہ ٹکر ٹکر کمرے کی ایک ایک چیز اور اونگھتی ہوئی تائی حسنہ کا جائزہ لیتی رہی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو بتی بجھا کر دادی کے برابر جا لیٹی۔

''اے لڑکی! دوسری چارپائی خالی ہی تو پڑی ہے۔۔۔'' دادی نے گھر کا۔

وہ ممیانے لگی۔

''پرایا گھر۔۔۔ اجنبی جگہ۔۔۔ پہلی رات۔۔۔ ڈر لگا تو۔۔۔؟''

دادی کتنی ہی دیر بڑبڑاتی رہیں۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ سونے سے گھبراتی تھیں کہ وہ ان سے لپٹ کر سونے کی عادی تھی۔ اور دادی کے کبھی گدگدی ہونے لگتی اور کبھی دم گھٹنے لگتا۔

دادی کو شانت رکھنے کے لیے وہ کتنی ہی دیر تک چارپائی کے کنارے پر دبکی رہی۔ نیند کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ دادی کے خراٹے چند لمحوں میں ہی گونجنے لگے تھے۔ وہ کچھ دیر چپکی رہی پھر کروٹ پہ کروٹ بدلنے لگی حتیٰ کہ دادی نے کسمساتے ہوئے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

''ڈھنگ سے لیٹ جا۔ کیا کھٹمل کاٹ رہے ہیں تجھے؟''

وہ روہانسی ہو کر چھت کی کڑیاں گننے لگی تھیں۔ باہر سے آوازیں بہت دیر تک آتی رہیں رات میں اگر کبھی اس کی آنکھ لگی بھی تو عجیب وغریب خواب تنگ کرتے رہے۔ کبھی ایک ہی میدان میں کبڑے ہی کبڑے جمع ہو کر قہقہے لگاتے رہے اور کبھی چار مختلف شکلوں کے جن بھوت آ کر اسے ڈراتے رہے، اسی عالم میں صبح ہوئی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد دوبارہ اسی کمرے میں جا گھسی تھی۔ ناشتے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہوئے تو تائی حسنہ نے انہیں ان کے کمرے کی راہ دکھائی جو اگرچہ بہت چھوٹا تھا مگر اس کی نیم تاریکی میں پھیلی ٹھنڈک اور صاف ستھرے بے شکن بستر نے ایسا سکون پہنچایا تھا

کہ دوپہر تک وہ تھکن سے بے حال اپنی نیند پوری کرتی رہی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اجنبی ماحول اسے چونکا گیا تھا۔ تب اسے یاد آیا، وہ اپنی تھکاوٹ ختم کرنے کے لیے یہاں لیٹی تھی اور دوپہر کو دادی کے جگانے کے باوجود نہیں جاگی تھی۔ اب جب وہ خود سے جاگی تھی تو دادی اور تھکن دونوں غائب تھیں۔ اس نے چارپائی سے نیچے اتر کر اپنا جوتا تلاش کر کے پہنا اور دوپٹہ درست کرتی دروازے تک آ گئی۔

سہ پہر ڈھل گئی تھی، صحن میں بچھی چارپائیوں پر دادی اور تائی حسنہ بیٹھی تھیں۔ دادی سوال کرنے پر آمادہ، تائی حسنہ جواب دینے میں متردد۔۔۔

کسی اور کو وہاں نہ پا کر وہ باہر نکل آئی، قدموں کی چاپ پر تائی حسنہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، بڑی جانچتی، پرکھتی، تولتی ہوئی نگاہ تھی۔ وہ دادی کے پہلو میں سمٹ گئی۔ تب ہی صحن کے آخری کونے میں بنے غسل خانے سے کوئی برآمد ہوا۔ کاندھوں پر پھیلا تولیہ، گھٹنوں تک آتی نیکر۔۔۔ یہ غالباً نہانے کے بعد کا حلیہ تھا۔ وہ بڑی موج میں گنگناتے ہوئے نکلا تھا لیکن صحن تک آتے آتے ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

''یہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا۔۔۔ احمد۔۔۔'' تائی حسنہ نے تعارف کروایا۔

اور وہ چھوٹا بیٹا اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ دو اجنبی خواتین کے سامنے نیکر پہن کر آنے پر شرمندگی محسوس نہ کرتا۔ سو وہ پلٹ کر بھاگا اور غڑاپ سے دوبارہ غسل خانے میں گھس گیا پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر کبڑے میاں کو پکارنے لگا، ذرا دیر بعد وہ تھوڑی دیر پہلے کی شرمندگی کے آثار لیے باہر نکلا تو خاصے معقول حلیے میں تھا۔ انہیں ہلکی آواز میں سلام کہہ کر کمرے میں گھسا اور پھر گیلے گیلے بال جما کر کتابیں ہاتھ میں لیے باہر نکل آیا۔

''ٹیوشن پڑھنے جا رہا ہوں۔'' وہ ان کے قریب سے گزرتا باہر کو چل دیا تھا۔ تائی حسنہ کسی کام سے اٹھ کر باورچی خانے کی طرف گئیں تو وہ بھی منہ ہاتھ دھونے غسل خانے کی طرف آ گئی۔ باہر نکلی تو ایک اور شخصیت دادی کے پاس براجمان تھی۔

سرمئی ملگجی سی شلوار قمیص، ہلکی سی سرخی لیے ہوئے خمار آلود آنکھیں، کھلتی ہوئی گندمی رنگت، نقوش میں جاذبیت، تائی حسنہ کے سب سے بڑے بیٹے تیمور حسن۔۔۔

متعارف ہونے پر گرتی پڑتی نظر اس پر ڈالی، بہت بے ضرر سا انداز تھا دیکھنے کا۔ وہ کوئی بزنس شروع کر رہے تھے، اسی بھاگ دوڑ میں نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔ آج تڑکے اسلام آباد سے واپسی کے بعد اب تک نیند ہی پوری ہو رہی تھی اور اب جاگے تھے تو دادی کے ہاتھ لگ گئے۔

''کتنا پڑھا ہے؟''

''بزنس کون سا کر رہے ہو؟''

''پیسہ کہاں سے آئے گا؟''

بخت آور ہر سوال پر پہلو بدلتی رہی۔

''کیا سوچ رہے ہوں گے وہ بھی۔۔۔؟ بڑھیا جان ہی نہیں چھوڑ رہی ہے۔''

وہ کن اکھیوں سے تیمور حسن کا جائزہ لیتی رہی۔ اب منہ بگڑا، اب تیوری چڑھی۔ اب جھنجھلائے مگر

وہاں کمال کا صبر تھا۔ ہر سوال کا تفصیلی جواب، کوئی پریشانی، کوئی جلدی نہیں، بکھرے الجھے بالوں میں انگلیاں چلاتے، ہونٹوں پر مبہم مسکراہٹ سجائے۔

"اب تک یونہی پھر رہے ہو یا۔۔۔؟" دادی کا لہجہ معنی خیز تھا وہ تو بس سر پیٹ کر رہ گئی۔ بخت بری لگتی تھی دادی کی ٹوہ لینے کی عادت مگر دادی نے باقی عادتوں سے کہاں جان چھڑائی تھی جو اس کے برا لگنے پر اس عادت کا پیچھا چھوڑتیں۔

تیمور حسن ذرا چونکے، پھر مطلب سمجھے۔

"جی۔۔۔ منگنی ہو چکی ہے۔"

"چلو۔۔۔ قصہ ختم۔۔۔" بخت آور نے سکون کا سانس لیا۔ دادی کی بولتی بند ہو گئی۔ بھلا اب پوچھنے کو باقی کیا رہ گیا تھا۔ اسے دادی کا منہ دیکھ کر ترس آنے لگا۔

جھریوں زدہ چہرہ، لٹکا ہوا، مایوس، آنکھیں فضا میں لکھی کسی نادیدہ تحریر کو پڑھنے لگی تھیں، اس نے بے اختیار ہی اٹھ کر ان کا ماتھا چوم لیا۔ ساری فکر مندی اسی کی ذات کے لیے تو تھی۔ اسے اپنا آپ ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا تو اٹھ کر کمرے میں چلی آئی۔

"کھانا لے آؤں یا چائے؟"

وہ اپنا بستر درست کر رہی تھی جب کبڑے میاں بوتل کے جن کی طرح کھلے دروازے میں نمودار ہوئے۔ پوچھنے کا انداز ایسا عجلت بھرا تھا گویا جان چھڑانے آئے ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھنڈا کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ گرم کرنے کی زحمت نہ دینا چاہتی تھی سو چائے کا کہہ ڈالا۔ پھر یاد آیا، سفر کے دوران بسکٹ خریدے تھے جو کھائے بغیر یونہی گٹھڑی میں رکھ چھوڑے تھے۔

"چلو، کچھ تو بھوک مٹے گی۔۔۔" وہ اٹھ کر الماری میں رکھی چیزوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔

☆☆☆

مہینہ بھر ہو چلا تھا یہاں رہتے ہوئے مگر معمولات تھے کہ جوں کے توں۔۔۔ ایک کمرے میں پڑے پڑے جی اوب گیا۔ ماشاءاللہ لڑکوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ ایک آتا تو دوسرا جاتا۔ کبھی ان کی موجودگی میں کمرے سے باہر نکلتی تو تائی حسنہ کے تیور بدل جاتے۔ دادی الگ گھبراتیں۔ وہ خجل ہو کر دوبارہ کمرے میں گھس جاتی۔ مگر کب تک؟ جی چاہتا سب چھوڑ چھاڑ یہاں سے بھاگ نکلے۔ ایک روز زیادہ ہی اکتاہٹ محسوس ہوئی تو تنگ آ کر۔۔۔ سب بھول بھال کر کمرہ چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ ناشتے کے بعد سب لوگ اسکول، کالج کے لیے نکل چکے تھے۔ کبڑے میاں جھاڑو لے کر کمرے میں گئے تو وہ بھی ان کے پیچھے ہی گھس گئی۔

اتنے دن ہو گئے تھے یہاں رہتے ہوئے، سب دیکھ رہی تھی۔ تائی حسنہ بہت کام کرتی تھیں مگر اس کے باوجود سب کام نہیں کر سکتی تھیں۔ خصوصاً صفائی ستھرائی کے معاملات تو سب کبڑے میاں کے ہاتھ میں تھے۔ ہفتے بھر بعد جی چاہتا تو جھاڑو اٹھا کر کمروں میں گھس جاتے، ہر طرف گرد اڑاتے۔ چھینکیں مارتے اور باہر آ جاتے۔ چارپائیوں، پلنگوں کے نیچے دھول مٹی سب جوں کا توں، ان کے نیچے گھسنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا کوہان تھا اور چارپائیاں اٹھانے کی زحمت وہ خود سے نہیں کرتے تھے۔

کبھی زیادہ ہی صفائی کا شوق ہوتا تو شبیب اور منیب اٹھ کھڑے ہوتے خوب ہاہا کار مچتی۔ ایک ایک چیز کی صفائی دھلائی اور پھر دو دنوں میں سب برابر۔ ایک دم ویسے کا ویسا۔ سو اس روز وہ آنکھیں اور کان دونوں بند کر کے میدان عمل میں کود گئی تھی۔

کبڑے میاں نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا مگر اس کا منہ ان سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔ موٹے موٹے ہونٹوں اور پیلی پیلی گدلی آنکھوں والا یہ شخص اسے قدرت کی کوئی بھیانک سی غلطی لگنے لگا تھا۔

"اگر آپ کو نگرانی کرنی ہو تو بھلے سے کھڑے رہیے ورنہ آپ کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔"

اس نے جھاڑو ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ سر منہ دوپٹے سے لپیٹ کر جھاڑن ہاتھ میں لے کر وہ تن دہی سے مصروف ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیر توڑ کر مفت کی کھاتے رہنا اسے منظور نہ تھا۔

"جو لوگ ہمارے قیام وطعام کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں انہیں بھی تو ہماری ذات سے کچھ فائدہ ہو۔"

اس نے سوچ لیا تھا۔ سو دیواروں، چھتوں سے جالے صاف کیے۔ بستر جھاڑے، چادریں، غلاف دھوئے۔ پلنگوں کو دھوپ لگوائی۔ بند الماریوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ کھلی الماریوں کی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھی۔ فرش پہ جھاڑو کے بعد دو، دو تین بار پوچا لگایا۔ فرنیچر جھاڑا۔ دروازے کھڑکیوں کو رگڑ ڈالا۔ شام تک دونوں کمرے صاف ستھرے، چمکدار اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر رہے تھے۔ خود وہ دھول مٹی سے اٹ کر بھوت لگ رہی تھی۔ سو نہا دھو کر خود کو مانجھا رگڑا۔۔۔ اور برآمدے سے الم غلم سمیٹ کر دوبارہ اپنے کمرے میں جا گھسی۔

تائی حسنہ سب دیکھ رہی تھیں۔ منہ سے اچھا، برا کچھ نہ پھوٹیں۔ دادی خوش تھیں بلکہ بہت خوش تھیں پوتی کی کارکردگی پر۔۔۔ وہ چاہتی تھیں اسی گھر میں بخت آور کا ٹھکانہ بن جائے مگر بخت آور تائی حسنہ کے لیے دیے انداز دیکھ رہی تھی۔ وہ خوش فہم نہ تھی، اپنی حیثیت جانتی تھی۔ یہ سب اگر کیا تھا تو کوئی مقصد، کوئی پلاننگ نہ تھی اس کی۔

شام کو لڑکے واپس آئے تو حیران پریشان۔

"جادو کی چھڑی گھمائی ہے کیا؟"

"کسی پری کا کارنامہ ہے۔" قیاس آرائیاں، جگت بازی، شبیب اور منیب دونوں مزہ لے رہے تھے۔

"اماں نے ڈپٹی نذیر احمد کا کوئی ناول پڑھ لیا ہوگا۔"

"کبڑے میاں کو سلیقہ مند بننے کا شوق چرایا ہوگا۔"

یہ سب تائی حسنہ کے سامنے کی باتیں تھیں۔ ادھر وہ منظر سے ہٹیں، ادھر انہیں یاد آنے لگا۔

"ارے لڑکی!"

"ہاں۔۔۔ ہاں، یقیناً لڑکی۔"

"اب پتا چلا ہمارے گھر میں ہے آئی اک لڑکی۔"

"اسی کا کارنامہ ہے۔"

"واہ، واہ شکریہ، نوازش، کرم، مہربانی۔" بلند آواز میں راگ الاپا جا رہا تھا۔

وہ سب سنتے ہوئے بھی انجان تھی۔

''کیا ہوتا جو ہماری بھی کوئی بہن ہوتی۔ یوں چھپ چھپ کر کمروں میں نہ بیٹھتی۔'' احمد کی حسرت بھری آواز سن کر اس کا دل بھر آیا۔

''آہ! کیا ہوتا۔۔۔ جو میرا بھی کوئی بھائی ہوتا۔ اس کے لاڈ اٹھاتے، ناز نخرے برداشت کرتے، دھڑلے سے اس کی چیزوں کو چھیڑتے۔ کمرے کو سنوارتے۔ وقت گزر تا وہ ہوتا تو یوں کسی کے گھر میں کاہے کو پڑی رہتی۔ کیوں میں اور دادی چوروں کی طرح چھپتے پھرتے۔'' وہ تکیے میں منہ چھپا کر رو دی تھی۔

☆☆☆

باورچی خانے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ تائی حسنہ کی ''ہائے'' البتہ کبھی کبھار سنائی دے جاتی تھی۔ رات انہیں ہلکا ہلکا بخار تھا، اب ناشتا بنانے کی ہمت ان میں نہ تھی۔ سو بازار سے ناشتا منگوانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھی ساری صورتحال سے باخبر بخت آور کو غصہ آ گیا۔

''دیکھ رہی ہیں آپ؟ یہ عزت ہے ہماری، آپ کے یا میرے ہاتھ کا پکا، کھانا نہیں کھا سکتے یہ لوگ۔''

''ارے واہ۔۔۔ مہمانوں کو کون زحمت دیتا ہے؟''

دادی جیسی خوش فہم وہ کہاں؟ فوراً تنک کر بولی۔

''مہمان نہیں بلائے جان سمجھتی ہیں وہ ہمیں۔ ڈر ہے انہیں کہ اس گھر کے لوگوں میں گھل مل کر اس گھر کے معاملات میں دخیل ہو کر ہم ہمیشہ کے لیے یہاں نہ رہ جائیں اور میں آپ سے کہہ رہی ہوں دادی! آپ ان لوگوں سے کہہ کر جلد از جلد کسی چھوٹے موٹے کرائے کے مکان کا بندوبست کروالیں۔ میں ایسی ذلت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ دوپٹے کی بکل مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ہونہہ چھوٹا موٹا کرائے کا مکان، دماغ خراب ہے اس لڑکی کا۔ بھول گئی ہے کہ مکان ہمارے پاس پہلے بھی تھا اور اسے کیوں چھوڑنا پڑا۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں، مجھ بڑھیا کا کیا ہے۔ خود اسی کی ذات کا دھڑکا لگا رہتا ہے مجھے۔۔۔'' دادی کروٹ کے بل لیٹی خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھیں۔

بخت آور جلتی بھنتی سیدھی باورچی خانے میں گئی تھی، جہاں تائی حسنہ کبڑے میاں کو ناشتے کی تفصیل سمجھا رہی تھیں۔ اس نے جاتے ہی پرات میں آٹا نکالنا شروع کیا تو تائی حسنہ کے ماتھے پر کئی بل ایک ساتھ پڑ گئے۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''آٹا گوندھ رہی ہوں۔''

تائی حسنہ اس دیدہ دلیری پر اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ تب وہ ان کی طرف پلٹی۔

''گھبرا کیوں رہی ہیں؟ چرانے چھپانے کی عادت نہیں ہے مجھ میں۔ ''قبضہ کرنے'' یا کچھ ''چھین'' لینے کی حسرت بھی نہیں ہے۔ معدے کے ذریعے دل میں اترنے کا راستہ بھی نہیں آتا۔ اس لیے ایسا کوئی خیال آپ کے دل میں ہے تو بھی تو اسے نکال دیجئے۔ آپ کے رحم و کرم پر پڑے ہیں، مانگے تانگے کا کھاتے ہیں۔ اس میں ہماری خوشی نہیں تقدیر کا چکر ہے۔ جن لوگوں کی انا، عزت نفس، وقار سب زمانے کے ہاتھوں مجروح ہو چکا ہو ان سے خوف نہیں، ان پر ترس کھایا جاتا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ مجھ سے ناشتا بنانے کا کہہ سکتی تھیں مگر آپ نے نہیں کہا۔ میں اچھوت نہیں۔ الحمدللہ مسلمان ہوں۔ صبح و شام اللہ کا نام لیتی ہوں۔ کبھی ہاتھ دھوئے بغیر لقمہ نہیں توڑا۔ ناخن بڑھانے کے شوق میں میل کچیل جمع رکھنے کی عادت بھی نہیں کہ آپ کو الم غلم کھلا دوں۔ آج در بدر سہی لیکن گھر میں رہنے بسنے کا سلیقہ ہے مجھ میں، آپ اعتبار تو کیجئے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''توبہ کتنا بولتی ہے یہ لڑکی۔۔۔'' کبڑے میاں بڑبڑا کر باہر نکلے مگر ٹھٹھک گئے۔ خبر ہی نہ ہوئی تھی کب تیمور حسن دروازے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ ساری بات سن چکے تھے اسے رنجیدہ ہوتے دیکھ کر آگے بڑھ آئے تھے۔

''بس باتیں ہی بنانی آتی ہیں یا ناشتا بھی بنا سکتی ہو؟'' ان کا لہجہ ہلکا پھلکا سا تھا۔

''اور ایسی بے وقوفی کی باتیں آئندہ مت کرنا۔ تمہاری طرح پٹر پٹر بولنا مجھے نہیں آتا لیکن اتنا سن لو کہ تم اس گھر کے فرد کی طرح ہو، باعزت، باوقار۔۔۔ ترس کھائے جانے والے لوگ کم از کم تم جیسے نہیں ہوتے۔ ہے نا اماں!''

''وہ تصدق چاہ رہے تھے۔ تائی حسنہ گم صم بیٹھی تھیں۔ بخت آور جھوٹ نہیں کہہ رہی تھی۔

انہیں شروع سے ڈر تھا، لڑکی معصوم بھی ہے، پرکشش بھی۔ کسی بیٹے پر قابو نہ پا لے۔ ایک پر بھی قبضہ جما لیا تو ان کی راجدھانی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مملکت تقسیم ہو جائے گی نہ بھی ہوتی تو بڑھیا کے مر مرا جانے پر لڑکی مستقل ان کی ذمہ داری بن جاتی۔ سوچ رکھا تھا جلد ہی انہیں کوئی اور بندوبست کرنے کو کہہ دیں گی۔ اتنی دور کی رشتہ داری تھی۔ انہیں کیا پڑی تھی درد سر مول لینے کی مگر آج تو بخت آور نے انہیں اپنی ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھی خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

بڑی نفاست سے آٹا گوندھ رہی تھی۔ ذرا سا آٹا اِدھر اُدھر نہ گرایا۔ توا چولہے پر چڑھایا اور جھٹ پٹ پراٹھے بنانے لگی۔ پتلے پتلے گول پراٹھے بے حد نرم۔

احمد ہمیشہ ان سے ایسے پراٹھوں کی فرمائش کرتا تھا مگر انہیں بھاری پراٹھے کی عادت تھی۔ بمشکل آدھا کھایا جا سکتا تھا۔ بخت آور آملیٹ بنا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا براؤن، پھولا پھولا سا۔

کبڑے میاں بار بار مداخلت کر رہے تھے۔ بخت آور چڑ گئی۔

''یہ کام آپ کے کرنے کا نہیں، مجھے سب بنانا آتا ہے۔ آپ جایئے یہاں سے۔''

کبڑے میاں نے پہلے ناگواری سے اسے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر باہر نکل گئے۔

وہ اپنی دھن میں لگی رہی، تائی حسنہ کن اکھیوں سے تاڑتی رہیں۔ غضب کی پھرتیلی تھی وہ، اور پھر عمر کے اس حصے میں تھی جہاں اٹھنا بیٹھنا، ہلنا جلنا کار دشوار نہیں ہوتا۔ سب کام منٹوں میں ہو جاتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔

ذرا دیر بعد کبڑے میاں پھر بھاگے چلے آئے۔

فلاں کے لئے ناشتا، ڈھمکاں کے لیے چائے۔

بخت آور نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ انہیں ہر کام میں دخل دینے کی عادت تھی، اب کون بار بار ان کے منہ لگے۔ اس نے اپنا کام مکمل کیا۔ برآمدے میں چھوٹی سی گول میز پڑی تھی اس کی کرسیاں

سارا دن یہاں سے وہاں بکھری رہتیں۔ رات کو ٹی وی کے سامنے، صبح استری اسٹینڈ کے پاس، دوپہر کو کمرے میں، شام کو صحن میں۔

بخت آور کے کہنے پر کبڑے میاں نے کرسیاں میز کے گرد لگائیں۔ اور خود فرش کو گھستے ڈیوڑھی میں جا بیٹھے۔

یہ لڑکی بس اپنی ہی مرضی کیے جارہی تھی۔ پہلے ہر طرف سے آوازیں گونجتیں۔

"کبڑے میاں! بھاگ کے گرم گرم پراٹھا لا دیجئے گا، آج بس چھوٹی کہ چھوٹی۔"

کوئی پکارتا۔ "کبڑے میاں! چائے ٹھنڈی ٹھار، مانو برف جیسی۔۔۔ گرم کرلائیے۔"

"کبڑے میاں! آ بھی چکیں، ایک چٹکی نمک کی ضرورت تھی۔ آپ کان کھودنے لگے کیا؟"

ہر طرف ایک ہی نام کی گونج، ایک ہی پکار۔ رات کا کھانا ہو، صبح کا ناشتا یا شام کی چائے، وہ اپنے نام کی تکرار سنتے، خوش رہتے۔ اپنی اہمیت کا خوش کن احساس جو ملتا تھا۔

"چلو بھئی! کسی کے کام تو آرہے ہیں نا" انہیں اس بھاگ دوڑ میں تسکین محسوس ہوتی اور آج یہ لڑکی میز سجانے پہ لگی تھی۔ سب کچھ سامنے پڑا ہوگا۔ کبڑے میاں کسے یاد رہیں گے۔ انہیں بالکل بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ منہ پھلائے روشندان میں شور مچاتی چڑیوں کو کوستے رہے۔

باورچی خانے میں بیٹھی بخت آور نے چند لمحے ان کا انتظار کیا پھر خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاٹ پاٹ، دہی کا پیالہ، اچار، آملیٹ میز پر سجانے لگی۔

شبیب آئینے کے سامنے کھڑا بال بنانے کے ساتھ ساتھ منہ کے مختلف زاویے بھی بنا رہا تھا۔ تیمور حسن کمرے میں اپنی فائل میں کچھ پیپرز رکھ رہے تھے۔ احمد اور منیب جرابوں کے جوڑے پہ جھگڑ رہے تھے۔ اسے دھڑلے سے میز پہ ناشتا سجاتے دیکھ کر تمام صاحبان ساکت رہ گئے۔ بخت آور نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چائے کا تھرماس اور کپ لاکر رکھے۔ پھر چنگیر میں سے دو روٹیاں گھسیٹیں۔ ان پر اچار کی پھانک رکھی اور دو کپ چائے لے کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔

دادی ناشتا دیکھ کر منہ بسورنے لگیں۔ انہیں اچھے دنوں کی یاد آرہی تھی جب ناشتے میں حلوے مانڈے کھانے کو ملتے تھے۔ جب ان کے سرہانے پڑی میز کو پھلوں اور میووں سے خالی نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔

"اور اب کوئی دیکھے۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا"

ان کی ٹھنڈی آہیں سننے کی عادت تھی بخت آور کو، سو نوالے نگلنے کے ساتھ ساتھ ان کی ٹھنڈی آہیں بھی اپنے اندر اتارتی رہی کہ اس نے تو ان دنوں کی بس داستان ہی سنی تھی۔ دیکھنا نصیب نہ ہوئے تھے اور اگر ہوئے بھی تھے تو کم از کم اب یادداشت میں محفوظ نہ تھے۔

☆☆☆

"دیدے پھوٹیں کم بختوں کے۔ گھر آئی مہمان ہوں ان ہی کے خاندان سے وابستہ، اتنا بھی لحاظ خیال نہیں۔"

کپڑے نچوڑتے ہوئے وہ خیالوں ہی خیالوں میں شبیب اور منیب کی گردنیں بھی مروڑ رہی تھی۔ گالیوں، کوسنوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

وہ دونوں سامنے برآمدے میں کرسیاں ڈالے چپڑ چپڑ زبانیں چلا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنا تو یوں بھی ان کی عادت تھی۔ بخت آور کو دیکھ کر تو بجلی پہ چلتے تھے۔ دادی اور تائی حسنہ کے سانے نگاہیں کتابوں سے چپک جاتی تھیں۔ دادی ان کی شرافت کے گن گاتی نہ تھکتی تھیں۔ اوّل روز کی طرح وہ بھاگ بھاگ کر اسے پردوں میں چھپانا تو بھول ہی گئی تھیں۔

"اے خاندانی لوگ ہیں۔۔۔ شرافت تو گھٹی میں پڑی ہے۔ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں تو اکثر ہی تاڑتی رہتی ہوں۔"

وہ کہنا چاہتی تھی۔

"وہ دونوں آپ کی "تاڑ" سے پرے کی چیز ہیں۔"

لیکن کیا کہتی؟ بس خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہی تھی۔ اب بھی وہ دونوں شرارت پر اترے تھے۔

وہ مارے باندھے کام سے لگی رہی۔ سارے کپڑے دھوئے، جھٹک پھٹک کر سوکھنے کے لیے پھیلا دیے۔ ہاتھ خشک کرکے کمرے کی طرف آرہی تھی جب ان کی آواز کانوں میں پڑی۔

"سب کی سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ نخریلی، نک چڑھی۔ خود کو جانے کیا سمجھنے والی۔ اب ان ہی کو دیکھ لو، ہم سے تو خدا واسطے کا بیر ہے۔ نہ دعا نہ سلام، گویا ہم مرے جارہے ہیں کلام کے لیے۔"

"آواز تو سن رکھی ہے ہم نے، کوئل کو بھی مات دیں پھر بولنے میں جھجک کیسی؟"

"اجی! اپنی صنف کے بنائے ہوئے اصول وقواعد نبھائے جارہے ہیں۔"

"ہونہہ، اپنی ویلیو بڑھانے کی کوشش، وہ بھی فضول سی۔"

وہ کمرے میں جاتے جاتے واپس پلٹ آئی۔ ان کے قریب آکر کرسی کھینچی۔ دھم سے اس پر بیٹھی اور پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

"ہائیں۔۔۔ ارے۔۔۔ ارے۔۔۔!" دونوں ہی بوکھلا گئے۔

"کیوں رو رہی ہیں بھئی؟"

"کیا ہوگیا؟"

حد ہوگئی تھی معصومیت کی۔ اس کے آنسو مزید رواں ہوگئے۔

"یہ کیا کررہی ہیں آپ؟"

"نظر نہیں آتا، رو رہی ہوں۔"

"ہاں، وہ تو دیکھ رہے ہیں مگر کیوں؟"

"روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟"

"کس نے ستایا ہے آپ کو؟" کوئی انجان سے انجان تھے وہ۔

"کون ستائے گا؟ بس میں ہی مغرور ہوں، نک چڑھی ہوں۔ اپنی ویلیو بڑھانے کے لیے۔۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ دیکھیں ہم تو۔۔۔" منیب کی گھبراہٹ عروج پر تھی۔

"کس قدر خوش تھی میں۔۔۔ سوچتی تھی۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن بن گئی ہوں۔ راہ چلتے لوگ جوان بھائیوں کے خوف سے راستہ چھوڑ دیا کریں گے۔ نہیں معلوم تھا کہ ساری خوش فہمی ہے۔ بھلا کون

کسی یتیم، بے آسرا لڑکی کو اتنا معتبر کرتا ہے۔ یہاں تو اندر باہر سب ایک سے ہیں، چہروں پر معصومیت مگر گھنے، میسنے۔" اس کی نظریں اپنے چہروں پہ محسوس کر کے وہ دونوں گڑ بڑا گئے۔

"ہاں بھئی۔۔۔ بازار میں بڑی چیز ہو گئے ہم تو، جس کا دل چاہے نظروں کی مار مارے۔ جس کے جی میں آئے لفظوں کے تیر اچھالے" دل میں درد سا اٹھ رہا تھا، خوب روئے چلی گئی۔ یوں جیسے کسی اپنے کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہو۔

"ارے۔۔۔ آپ تو بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ کہ ہم لفظوں کی مار اور۔۔۔ اور نظروں کے تیر۔۔۔ حد ہو گئی یعنی کہ۔۔۔"

شبیب کی تو غیرت پہ تازیانہ بن کر لگی تھی یہ بات۔ شوخی، شرارت سب اڑن چھو۔۔۔ اب تو عزت پہ بن آئی تھی۔ چھوٹی موٹی سی لگتی تھی یہ لڑکی۔۔۔ ایسی منہ پھٹ ہو گی اندازہ کہاں تھا انہیں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" منیب کی پیشانی عرقِ ندامت سے تر تھی۔

"وہ تو بس آپ اتنے دنوں سے ہم سے لاتعلق رہیں تو ہمیں اچھا نہیں لگا تھا۔ ورنہ آپ تو ہماری بہن جیسی ہیں۔" منیب کے برادرانہ جذبات امڈے چلے آ رہے تھے۔

"بالکل سگی بہن جیسی ہے ناں بیبے۔۔۔"

"ارے واہ، جب ہماری کوئی بہن نہیں۔۔۔ تو بہن جیسی کیوں؟" اس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔

بخت آور آنسو بہانا بھول کر پٹر پٹر اسے دیکھے گئی۔ کیسا بے مروت انسان تھا، منیب اپنی جگہ شرمندہ ہو گیا۔ میز کے نیچے سے اس کا پاؤں دبایا۔ چٹکیاں کاٹیں۔

"پاگل ہے کیا؟ پہلے نہیں تھی بہن۔۔۔ اب تو اللہ نے دی نا؟" منیب اسے قائل کر رہا تھا۔

"تجھے دی ہو گی۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بڑبڑایا پھر کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا کہہ گیا ہے یہ۔۔۔" بخت آور کا ماتھا ٹھنکا۔ ٹھیک سے سن نہ پائی تھی مگر منیب نے بھی ٹال دیا۔

"بس ایسے ہی بول رہا ہے۔ آپ جانے دیں اس کو، بس آج سے میں ہوں نا آپ کا بھائی۔ بالکل سگے والا۔۔۔" منیب دل سے کہہ رہا تھا۔

"ہائے سچی۔۔۔" بخت آور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

کیسا مان دیا تھا منیب نے اس کو، وہ تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

شبیب نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے، گنگناتا ہوا باہر کی طرف چل دیا تھا۔

☆☆☆

بس آنکھ جھپکنے کی دیر تھی اور کڑاہی میں سے بھنی ہوئی کلیجی غائب۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ سکتے میں رہ گئی۔ کڑاہی میں چمچہ گھمایا۔ خوب الٹ پلٹ کر دیکھا مگر کلیجی ندارد۔

"یا اللہ۔۔۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

یونہی بے اختیار سی نظر دادی پر ڈالی۔

"اف۔۔۔ دادی۔۔۔!" وہ اتنے زور سے چیخی تھی کہ منہ سے گرم گرم بھاپ نکالتی دادی سٹپٹا سی

گئی تھیں۔

"کیا ہو گیا لڑکی؟"

اور لڑکی بے چاری کیا بتاتی بس سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے دادی کے ندیدے پن کو تاڑ رہی تھی۔ جب تائی حسنہ یہاں بیٹھی گوشت کے لیے مسالہ تیار کر رہی تھیں اور دادی جو گپ شپ لگانے کے لیے ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ گوشت کو دیکھ کر بات بھول گئی تھیں اور آنکھیں تھیں کہ حلقوں سے ابل ابل کر گوشت کی تھیلی کو چھو رہی تھیں۔ کچے گوشت پر ان کے ندیدے پن کا یہ حال تھا تو پکنے پر شاید آنکھیں ہنڈیا سے چپک ہی جاتیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک آس پاس گھومتی رہی، دادی دیکھیں تو انہیں وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کر دے مگر دادی کو گوشت کے سوا کچھ اور دکھائی کہاں دے رہا تھا؟ وہ تو تائی حسنہ کو کسی ہمسائی نے اپنی طرف بلوا لیا اور تائی حسنہ جاتے جاتے کھانا پکانے کی ذمہ داری اسے سونپ گئیں۔ دادی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتیں تو "دادی" کیونکر کہلاتیں۔

اور بخت آور اگر صدمے کے عالم میں منہ پھلائے بیٹھی تھی تو صرف احمد کے واسطے۔۔۔ نویں کلاس میں پڑھنے والا دھان پان سا احمد کس قدر عزیز ہو گیا تھا اسے، خود احمد بھی دیوانہ تھا اس کا۔ باقی تینوں اس سے بڑے تھے، ایک فاصلہ ان کے درمیان برقرار رہتا۔ یہ تو بخت آور ہی تھی۔ جو اس سے گھل مل گئی تھی۔ دوستوں کی باتیں، پڑھائی پر گفتگو، کرکٹ پر تبصرہ۔

وہ کام میں مصروف ہوتی اور احمد بولتا رہتا۔ وہ بھی بغور سنتی۔ کبھی خیالوں میں کھو جاتی۔ واپس لوٹتی تو احمد کا بیان شد و مد سے جاری ہوتا۔ پھر وہ بخت آور کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ کبھی اسکول کے پیسے بچا کر سموسے لا دیتا، کبھی کھٹی میٹھی املی۔

جواباً بخت آور سے بھی جو بن پاتا کرتی تھی۔ آج اس نے سوچ رکھا تھا پکاتے ہوئے کلیجی احمد کے لیے الگ سے نکال لے گی۔ اسے بہت پسند تھی مگر دادی۔۔۔ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے دادی کو گھورا۔۔۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اب اپنا بلکہ دادی کا ہی کلیجہ نکال کر بھون ڈالے، احمد کو کتنی مایوسی اٹھانا پڑے گی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ دادی تو مزے سے اٹھ کر باہر کو چل دیں۔ وہ گوشت پر ہرا دھنیا اور کٹے ہوئے ٹماٹر چھڑکنے لگی۔

تب ہی کبڑے میاں چلے آئے۔ سلاد کے لیے سبزی لے کر آئے تھے۔ آتے ہی چھری اور پلیٹ اٹھانے لگے۔ اسے معلوم تھا وہ ابھی سلاد بنانے لگیں گے سو فوراً ہی ٹوک دیا۔

"سلاد میں بنا لوں گی کبڑے میاں! آپ چائے پی لیں۔"

اسے معلوم تھا کبڑے میاں ایسے ہزار کام کرنے کے عادی ہیں۔ کبھی سبزی بنا دی، کبھی تائی کو مصروف دیکھا تو لڑکوں کے لیے چائے بنا دی۔ اوپر تلے کے سب کام تو تھے ہی ان کے ذمے مگر باورچی خانے کے کام کرتے دیکھ کر بخت آور کو ان سے عجیب سی الجھن ہونے لگتی تھی۔ پہلے دن سے وہ اس انسان کو دل سے قبول نہ کر پائی تھی مگر پھر بھی کوشش کرتی تھی کہ اپنے انداز سے اس گریز کو ظاہر نہ ہونے دے۔

اب بھی اس نے عام سے انداز میں کہتے ہوئے سبزیاں اپنی طرف کھسکا لی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے تائی حسنہ نے اپنے لیے چائے بنائی تھی۔ ایک کپ بچا تھا۔ بخت آور نے فوراً گرم کرنے کے لیے دیگچی

چولہے پر چڑھادی اور خود سبزیاں کاٹنے لگی۔

کبڑے میاں خاموش اپنی جگہ کھڑے تھے اور اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ رہے تھے۔ بہت ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آئی تھی اور غائب ہوگئی تھی۔ وہ حیران تھے تھوڑے پریشان بھی۔

''اسے کیسے خیال آگیا کہ مجھے چائے پی لینی چاہیے۔''

وہ پرخیال نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ لڑکی سب کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اللہ نے بڑے اچھے دل سے نوازا ہے اس کو۔''

''آپ برآمدے میں بیٹھیں۔ میں چائے وہیں لے آتی ہوں۔'' انہیں سر پہ سوار دیکھ کر وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔

کبڑے میاں بغیر کچھ محسوس کیے اپنے ہی خیالوں میں گم باہر چل دیے۔ محسوس بھی کیا کر سکتے تھے ان سے تو وہ اسی لہجے میں کلام کرتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتے تھے کہ۔۔۔

''زبان سے ذرا سنگ دل اور کڑوی لگتی ہے لیکن دل۔۔۔''

ذرا دیر بعد وہ چائے کا کپ ان کے سامنے میز پر رکھ گئی تھی۔ کبڑے میاں کی مسکراہٹ رکنے میں نہ آرہی تھی۔ ایسی عزت سے تو آج تک کسی نے نہیں نوازا تھا انہیں۔ خدمت کرنے کی عادت تھی، کروانے کی نہیں۔ وہ چالیس برس سے اس گھر میں تھے۔ مالک، نوکر کا حساب کتاب نہ تھا۔ کھانا، پینا، اوڑھنا سب ہی گھر کے دیگر افراد جیسا تھا۔ عید شب برأت پر سب کے ساتھ نئے کپڑے بنتے۔ تنگی، ترشی میں بھی برابر کے حصہ دار، تنخواہ کے نام پر کبھی بھی ایک پیسہ اپنی ہتھیلی پہ نہ رکھا تھا۔ خاص خاص موقع پر حسنہ آپا زبردستی کچھ نہ کچھ تھما دیتیں۔ حالانکہ جتنا کام وہ کرتے تھے، چاہتے تو سینکڑوں تنخواہ کے نام پر بٹور سکتے تھے مگر وہ تو الٹا اس گھرانے کے احسان مند تھے۔

رہنے کو گھر، کھانے کو روٹی، سب سے بڑھ کر پیار، محبت کرنے والے لوگ اور کیا چاہیے تھا انہیں۔

وہ ہمیشہ کہا کرتے۔

''حسنہ آپا! یہ جو کولہو کے بیل کی طرح دن سے رات کرتا ہوں تو بس آپ کے احسان کا بدلہ چکانے کی ایک کوشش ہے۔ مگر کیا کروں، آپ کے احسانات بہت زیادہ ہیں اور میری استطاعت بہت کم۔''

یہ ان کی عاجزی تھی۔ گھر کے سیاہ و سفید کے مالک تھے مگر کبھی جو خود سے اپنے لیے کھانا نکالا ہو یا چائے، دودھ کی فرمائش کی ہو۔ ہمیشہ حسنہ آپا نکال کر دیتی تھیں۔ کبھی ان سے بھول چوک ہو جاتی تو پہروں بھوکے رہتے۔

حسنہ آپا کو یاد آتا تو انہیں پر چڑھائی کرتیں۔

''اے کبڑے میاں۔۔۔! دندناتے پھرتے ہو یہاں سے وہاں، ذرا روٹی، سالن اپنے لیے بھی نکال لو تو کیا قباحت ہے۔''

مگر وہ بھی اپنے نام کے بس ایک ہی تھے۔

''یہی بات تو ہے جو مجھے میری اوقات میں رکھتی ہے۔ اوقات بھول گیا تو ہر ایک دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگوں گا۔'' وہ دل میں سوچتے، زبان پر نہ لاتے۔ بس مسکراتے رہتے۔۔۔ اور خدمت میں لگے رہتے۔۔۔ آج یوں میز کرسی پہ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے تو عجیب شان اور تفاخر میں گھرے بیٹھے

تھے۔ ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھتے تھے۔ آج ان کا خیال رکھا گیا تھا۔

''تیمور! ناشتا کر کے جانا۔''

''احمد! دودھ ختم کرو۔''

''شبیب! چائے تیار ہے۔''

''منیب! تمہارے کپڑے نکال دیے ہیں۔''

''یہ کر دیا ہے، وہ کر دیا ہے۔'' عجیب غلامانہ سا انداز تھا ان کا ہمیشہ سے۔۔۔ یوں جیسے وہ بنے ہی اس کام کے لیے ہوں۔

اور۔۔۔ آج ان سے کہا گیا تھا۔

''کبڑے میاں! چائے پی لیجیے۔''

وہ سکون سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ دھیما دھیما سا عزت و وقار کا احساس۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے مزیدار چائے تھی۔

☆☆☆

وہ نہا کر باہر نکلی تو کبڑے میاں سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''استری کر دیجیے۔۔۔'' وہ شرٹ اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔

''کل تک سب کبڑے میاں کی منت سماجت کرتے تھے۔ آج کہتے ہیں، ہمیں استری کرنا نہیں آتا۔''

وہ بھدی سی ہنسی ہنس کر چل دیے۔

بخت آور برآمدے میں رکھے استری اسٹینڈ پہ شرٹ استری کرنے لگی۔

''کتنی دیر لگی گی بخت آور۔۔۔؟''

''ہائیں۔۔۔'' وہ ایک پل کے لیے چونکی ایسی بے تکلفی۔۔۔ پلٹ کر دیکھا۔

شبیب گھڑی باندھتے ہوئے کمرے سے نکل رہا تھا۔

''کیسے منہ پھاڑ کر کہہ دیا بخت آور۔۔۔ باجی۔۔۔ آپا کہتے زبان دکھتی ہے کیا۔۔۔؟''

آس پاس کوئی نہ تھا، اس نے فائدہ اٹھا کر جھاڑ دیا تھا۔ ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اس کی یہ دیدہ دلیری، ابھی تائی حسنہ یہاں ہوتیں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں چھید ڈالتیں اسے۔

''ارے واہ۔۔۔ میرا دماغ خراب ہے کیا؟ اتنی اچھی لڑکی اور۔۔۔'' وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''دماغ نہیں، نیت خراب ہے۔۔۔؟'' اس نے جل کر کہا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ عجیب جتاتی قسم کا قہقہہ۔

اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر اسے گھورنے لگی۔

وہ بمشکل سنجیدہ ہوا۔

''مجبور مت کرو۔۔۔ جب لگتی ہی نہیں ہو تو کیوں کہوں آپا، باجی۔۔۔''

''احمد اور منیب کیوں کہتے ہیں؟'' اس نے تنک کر پوچھا۔

"مجھے کیا خبر۔۔۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے پھر استری کا سوئچ نکالا اور شرٹ اس کے ہاتھ سے کھینچ لی۔

"سچا اور کھرا بندہ ہوں۔۔۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر۔۔۔ دھوکے فریب کی زبان نہیں آتی مجھے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"تمہارا مطلب ہے احمد اور منیب دونوں دھوکے باز اور فریبی ہیں؟" اسے پتنگے لگ گئے تھے، شبیب نے ٹوک دیا۔

"توبہ کیجئے جوان کے خلوص پر شبہ کروں۔۔۔ دیوار سے سر ٹکرا کر مر جائیں گے، میں تو صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔" وہ ہنستا ہوا کمرے میں چلا گیا۔

بخت آور ایک ٹک کمرے کے بند دروازے کو دیکھتی رہی پھر ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔

"عجیب بے ہودہ انسان ہے یہ۔۔۔ پتا نہیں کس پر گیا ہے۔" اسے غصہ آ رہا تھا شبیب پر۔

"باقی سب تو اتنے اچھے ہیں تیمور بھائی سے لے کر احمد تک۔ ایک یہ ہی عجوبہ ہے اس گھر میں، نہ زبان پر کنٹرول، نہ آنکھ پر۔۔۔" وہ گیلے بال سلجھانے لگی۔

تیمور حسن آتے جاتے اکثر اسے پوچھا کرتے۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔۔۔"

"کچھ چاہیے تو بتاؤ۔۔۔ واپسی پر لیتا آؤں گا۔"

وہ بتاتی تو کیا، بس اس توجہ پر ممنون سی ہو جاتی۔ ہلکی سی آواز میں، مختصر سا جواب دے کر سامنے سے ہٹ جاتی۔

احمد سے دوستی تو تھی ہی۔۔۔ منیب بھی سادہ سا انسان تھا۔ خیال رکھنے والا، ایک شبیب ہی مسئلہ بنا دکھائی دے رہا تھا اسے۔۔۔ حالانکہ بہت کم مخاطب کرتا تھا اسے، براہ راست بات چیت کبھی دانستہ کوشش نہ کرتا تھا مگر جتنی بار بھی سامنے آتا۔۔۔ انداز و اطوار یہی ہوتے۔ سرسری نگاہ ڈالتا تھا اس پر مگر نہایت بھرپور۔۔۔ اس ایک لمحے میں آنکھوں میں جو چمک ابھر آتی تھی وہ اگلے کئی لمحوں تک بخت آور کو پریشان رکھتی تھی اور اب تو وہ اپنے اکثر ہی کام کبڑے میاں کے ذریعے اس سے کرواتا تھا۔ وہ بھی مروتاً کر دیتی۔۔۔ کبھی کسی کام کا بہانا کر کے ٹال دیتی۔ گھر کے باقی افراد البتہ اسے اپنے ذاتی کاموں کے لیے زحمت نہیں دیتے تھے۔

☆☆☆

دادی اپنی پوٹلی کھولے تائی حسنہ کو ان تبرکات کا دیدار کروا رہی تھیں جو ایک عرصے سے اس پوٹلی میں مقید تھے۔ یہ پوٹلی سال میں دو چار بار ہی کھلتی تھی اس لیے وہ بھی مارے اشتیاق کے بھاگ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ دادی کے بھاری بھاری زیورات تھے، جن کی چمک دمک آج بھی جوں کی توں تھی۔ سونے کا بھاری گلوبند، پازیب، بالوں میں لگانے کے لیے کلپ، وہ جتنے شوق سے ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھتی۔ دادی اتنی ہی بے رحمی سے وہ چیز اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیتیں۔

"بڑی قیمتی چیزیں ہیں، تمہیں کیا خبر؟"

"ہاں دودھ پیتی بچی ہوں نا۔" وہ زیورات چھوڑ کر باقی چیزیں دیکھنے لگی۔

عطر کی خالی شیشیاں تھیں۔ جس زمانے میں دادا نے لا کر دی تھیں، اس وقت یقیناً بھری ہوئی ہوں گی مگر اب تو عرصہ دراز سے ان شیشیوں کو خالی ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ خوب لمبے لمبے پراندے تھے، ہلکے انگوری رنگ کا وہ سوٹ تھا جو بخت آور کے ابا نے آخری بار دادی کو لا کر دیا تھا اور دادی نے ان کے مرنے کے بعد یونہی اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا سلوانے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔ سنہرے گوٹے والا سرخ رنگ کا غرارہ جسے دیکھ کر وہ ہر بار کی طرح مچل گئی تھی۔

"دادی! ایک بار پہن لینے دیں۔ صرف ایک بار۔۔۔ دیکھوں تو سہی، کیسا لگتا ہے؟"

اسے گہرے رنگ پسند تھے مگر دادی نے آج تک پہننے ہی نہ دیے تھے۔ اب بھی سختی سے ٹوک دیا وہ منت سماجت میں لگ گئی۔ تائی حسنہ اس بچکانہ ضد پر ہنستی رہیں پھر غرارہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا ہے اماں! بچی کا شوق ہے، پورا کرنے دیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔۔۔" وہ کمرے میں بھاگ گئی۔ غرارہ پہنا، سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا۔ الماری سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر لپ اسٹک نکالی۔ گہرے سرخ رنگ کی۔۔۔ تائی حسنہ کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اسے ملی تو تائی حسنہ نے اسے ہی دے دی تھی۔

"جب سے تیمور کے ابا چل بسے، کبھی سنگھار نہیں کیا، تم ہی رکھ لو۔۔۔" اس کے بھی کس کام کی تھی، لے کر یونہی الماری میں رکھ دی۔ آج نکال کر خوب رگڑی ہونٹوں پر اور پھر باہر نکل آئی۔ جانے کس ترنگ میں تھی۔ گھومتی، لہراتی، دادی کے سامنے آئی تو انہوں نے انگلی رکھ لی ناک پر۔

"اوئی ماں! یہ ہونٹ کس چیز سے رنگے ہیں؟"

وہ سٹپٹا گئی، کچھ بات نہ بن پائی تو کھسیانی سی ہو کر یونہی ہنس دی۔ دادی اپنی جگہ مبہوت سی رہ گئیں۔

سرخ دوپٹے کے ہالے میں رنگ تو جیسے کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ شہد رنگ چمکتی آنکھوں سے جھلکتا شرمیلا پن اور بے ساختہ مسکراہٹ۔

دادی ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک سی گئی تھیں۔

انہیں تو خبر ہی نہ تھی وہ کیسا خزانہ ہاتھ میں لیے پھرتی ہیں۔ مٹے مٹے پھولوں والے بے رنگ لباس پہنے، اس سے پہلے وہ کبھی انہیں نظر ہی نہ آئی تھی۔ اور آج۔۔۔ انہوں نے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"کہاں چھپائے پھرتی تھی یہ اتنا حسن، اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا۔۔۔؟ ارے یہ سرخ رنگ میں کیا جادو بھرا ہے جو۔۔۔" وہ حیران تھیں اور کچھ پریشان بھی۔ تائی حسنہ کی نظروں میں ستائش تھی اور وہ لاپروا، بے نیاز۔۔۔ دادی کے غرارے پر تبصرے کر رہی تھی۔ تب ہی دروازہ پر کھٹکا ہوا۔

دادی بری طرح چونکیں۔۔۔ مردانہ آوازیں ڈیوڑھی میں گونج رہی تھیں۔

"اچھا بس اب۔۔۔ بدل کر آ کپڑے۔۔۔ جلدی کر۔۔۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہ ہو۔۔۔" وہ غیر متوقع طور پر دھاڑی تھیں۔

"ایک منٹ دادی! ابھی تو۔۔۔" وہ منمنائی۔ جواباً دادی نے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھا لیا تھا۔

"جارہی ہوں، جارہی ہوں" وہ تیزی سے پلٹی۔

منیب اور شبیب ایک دم اس کے سامنے آرکے تھے۔ احمد کھلکھلا رہا تھا۔

وہ گڑبڑا سی گئی۔ دادی کی شعلہ اگلتی آنکھوں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آیا۔ اپنے اردگرد گھومتے احمد کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ کمرے کی طرف بھاگی مگر غرارہ پہن کر بھاگنے کی عادت کہاں تھی، پیر کا انگوٹھا پائنچے میں پھنسا... اور وہ دھڑام سے منہ کے بل زمین پر... ہفت آسمان نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ انواع و اقسام کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہوئیں مگر شرمندگی کے مارے بصارت، سماعت سب ختم۔

"ارے پکڑو... اٹھاؤ..." دادی، تائی حسنہ اس کی طرف لپکیں۔ لڑکے اپنی جگہ ساکت مگر کسی کے بھی حرکت میں آنے سے قبل وہ اٹھی اور ایک ہی جست میں کمرے کے اندر، دادی پیچھے بھاگیں۔ اندر داخل ہونے کو تھیں جب دھاڑ سے دروازہ بند ہوگیا۔ ایک بازو کمرے میں اور دادی پوری کی پوری باہر... شور و غوغا مچا، دادی کی آہ و بکا سب سے بلند، منیب نے پوری کوشش کی دادی کو گھسیٹنے کی مگر دوسری طرف بخت آور انہیں کھینچ کر دروازہ بند کر چکی تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" ماں بیٹے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ خیریت تو ہے نا؟" وہ باہر کھڑے پوچھتے رہے۔ کتنی ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ دادی برآمد ہوئیں۔

"ہونٹ پھٹ گیا ہے۔ ماتھے پہ گومڑا اور ناک سوجھی ہوئی" دادی ازحد پریشان... رپورٹ ان تک پہنچائی اور سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

"میری ہی نظر لگ گئی کم بخت کو..." انہیں یقین تھا۔

بخت آور رات تک کمرے سے باہر نہ آئی۔ تیمور حسن اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ تائی حسنہ سے استفسار کیا۔ انہوں نے وجہ بتائی تو فوراً اس کے پاس چلے۔

"ڈاکٹر کے پاس چلو... کہیں گہرا زخم نہ ہو۔"

وہ گز بھر لمبا گھونگھٹ نکالے نفی میں سر ہلاتی رہی۔

"چلو مجھے ہی دکھا دو... کوئی دوائی وغیرہ لگا دوں" وہ بالکل سنجیدہ تھے مگر بخت آور راضی ہی نہ ہوئی۔

"میں خود ہی لگا لوں گی" تیمور حسن طویل سانس لے کر رہ گئے۔ اس بچکانے پن پر ہنسی بھی آرہی تھی مگر زیادہ اصرار نہ کر سکے... زخم پر لگانے کے لیے ٹیوب دی اور احتیاط کی تلقین کرتے ہوئے باہر چل دیے۔

☆☆☆

تیمور حسن کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ یہ اطلاع کسی دوست نے پہنچائی تھی جسے سن کر گھر کا ہر فرد اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی برس قبل ایسے ہی ایک حادثے میں ان کے باپ چل بسے تھے، وہی خوف ایک بار پھر سروں پہ منڈلانے لگا تھا۔ تائی حسنہ نے رو رو کر اپنا آپ بھلا ڈالا۔ جس وقت وہ لوگ ہاسپٹل پہنچے تیمور حسن ایمرجنسی وارڈ میں تھے، ملنے کی اجازت تھی نہ دیکھنے کی۔ شبیب زرد چہرہ لیے ایک سے

دوسرے ڈاکٹر کے پیچھے بھاگتا رہا۔ منیب ماں کو سنبھال رہا تھا۔ احمد دیوار کے ساتھ شاک کی حالت میں کھڑا ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھ رہا تھا۔ بڑے بھیا گھر میں اسے سب سے زیادہ پیارے تھے۔

"اگر انہیں کچھ ہوگیا تو...؟" وہ ڈر کے مارے رونا بھی بھول گیا تھا۔

دادی نرسوں سے جھگڑ رہی تھیں۔

"ہمیں دیکھنے تو دو... ہمارا بچہ ہے کس حال میں؟"

پریشان، بھاگ دوڑ میں مصروف نرسیں ان کی بات سننے کی بھی روادار نہ تھیں۔ بخت آور کبڑے میاں کے ساتھ گھر میں رہ گئی تھی۔ جب تک ہاسپٹل سے کوئی اطلاع نہیں آئی وہ مصلے سے نہ اٹھ سکی تھی۔ کبڑے میاں سارے گھر میں بے قرار پھرتے رہے، ان کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ کون کون سی دعائیں نہ مانگ ڈالی تھیں انہوں نے۔ شام گئے شبیب آیا تو ان کے استفسار پر بازوؤں میں منہ چھپا کر رو دیا تھا۔ نجانے صبح سے کیونکر ضبط کیے پھر رہا تھا۔

"ارے بتاتے کیوں نہیں کیا ہوا ہے؟" اسے جھنجھوڑتے ہوئے کبڑے میاں کی آواز پھٹ گئی تھی۔

بخت آور دروازے کا پٹ تھامے لرزتی رہی۔

"ہمارے تیمور بھیا عمر بھر کے لیے معذور ہوگئے کبڑے میاں وہ کبھی چل پھر نہیں سکیں گے۔"

"آہ...!" دکھ کی لہر، دل کو کاٹتی چلی گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی۔ کبڑے میاں، شبیب کو لتاڑ رہے تھے۔

"بے وقوف لڑکے یہ خوشخبری کیوں نہیں سناتے کہ میرے بچے کی جان بچ گئی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ زندہ ہے، ہم سب کے درمیان موجود ہے۔ بند کرو رونا دھونا۔ مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جان بخش دی..." کبڑے میاں کی آواز میں لرزش بڑھتی چلی گئی تھی۔

بخت آور اپنی بے ترتیب سانسوں پہ قابو پاتی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ تیمور حسن کے چہرے کی نرم سی مسکراہٹ نگاہوں کے سامنے سے ہٹنے میں نہ آرہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔

☆☆☆

گھر کی دیواروں پر اندھیرا چپکے سے اترا تھا اور اپنی اداس نگاہوں سے ایک ایک چہرے کو تکتا رہا تھا۔ رات گئے دادی اور تائی حسنہ کی آمد ہوئی۔ منیب اور شبیب ہاسپٹل میں رہ گئے تھے۔ احمد گھر آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گیا۔

تائی حسنہ کی حالت خستہ تھی، آنکھیں رو رو کر سوجھی ہوئی تھیں۔ دادی بھی مغموم، رہ رہ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ تائی حسنہ کو دلاسا، تسلیاں دیتے تھک گئیں تو اٹھ کر باہر آگئیں۔ باورچی خانہ سونا پڑا تھا۔ چولہا ٹھنڈا ٹھار۔

"ارے کھانا وانا کچھ نہیں پکا کیا؟" انہوں نے قریب گزرتے کبڑے میاں کو مخاطب کیا تو وہ جیسے پھٹ پڑے۔

"ہاں پکایا ہے۔ حلوہ پوری پکی ہے۔ پلاؤ، زردہ دم پر ہے۔ اے کچھ خدا کا خوف کرو بوڑھی اماں!

''ہمارا کلیجہ منہ کو آرہا ہے اور تمہیں کھانے پینے کی سوجھ رہی ہے۔''

''آئے ہائے۔ کیا کانوں میں گھسے آرہے ہو کبڑے میاں۔۔۔ دھیرے نہیں بول سکتے تم۔۔۔ اور حلوے، زردے کیوں پکنے لگے بھلا۔ ایسی کون سی خوشی دیکھ لی ہم نے۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ جو بھڑ بھڑ آگ جل رہی ہے خالی پیٹ میں، یہ کیونکر بجھ پائے گی۔ لاکھ صدمے جھیلے، صعوبتیں سہیں، خوب جانتی ہوں کہ اس دوزخ کو بھرے بغیر چارہ نہیں۔ بھلے سے کلیجہ منہ کو آئے، دل دکھ سے پھٹ جائے مگر کتنے پہر، دو، تین، چار۔۔۔ آخر کو تو پیٹ روٹی مانگے گا نا، پھر اس بے چاری کی بھی فکر کرو جو صبح سے پانی کا گھونٹ نہیں نگل سکی۔''

انہوں نے تائی حسنہ کی طرف اشارہ کیا۔ کبڑے میاں لاجواب ہو کر بڑبڑاتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں سے چل دیے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد واپسی ہوئی بن کباب کا شاپر ان کے ہاتھ میں تھا۔ دادی تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں، کبابوں کی خوشبو سونگھتے ہی فوراً اٹھ بیٹھیں۔ کبڑے میاں نے کھانا نکال کر سب کے سامنے رکھا اور خود ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ رات کے سرد تر سناٹے میں ان کی دکھ بھری آہیں وقفے وقفے سے سب ہی کو سنائی دیتی رہی تھیں۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد اس نے تیمور حسن کو دیکھا تھا۔ چہرے پہ کھنڈی زردی، ماند پڑتی ہوئی رنگت، آنکھوں میں دکھ کا ایک سمندر تیر رہا تھا۔ شبیب اور کبڑے میاں انہیں سہارا دے کر کمرے تک لائے تو تائی حسنہ انہیں بازوؤں میں بھینچ کر رو دی تھیں۔

بخت آور آنکھوں میں آنسو بھرے سب کے پیچھے کھڑی تیمور حسن کے چہرے پہ اتنی اذیت اور تکلیف کو دیکھ کر ہونٹ کاٹتی رہی۔ دادی، تائی حسنہ کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر لے گئیں، محلے کی کتنی عورتیں تیمور حسن کو دیکھنے آئی تھیں۔ اظہار دکھ کے مختلف انداز، ایک سے بڑھ کر ایک ہمدرد، تیمور حسن آنکھوں پر بازو رکھے چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ بے رنگ پانی کی ایک لکیر مسلسل بہتی ہوئی کنپٹی کے بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔

بخت آور سے برداشت نہ ہو سکا تو قریب سے گزرتے ہوئے شبیب کو بے اختیار ہی پکار بیٹھی۔

''ان سب عورتوں سے کہو، یہاں سے اٹھ جائیں۔ ان کے ہمدردی جتانے سے، ترس کھانے سے تیمور بھیا کو دکھ ہو رہا ہوگا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بمشکل کہہ پائی تھی۔

شبیب نے اس کی بات سنتے ہوئے ایک نظر تیمور پر ڈالی اور پھر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ ذرا دیر میں دادی بکتی جھکتی آئی تھیں۔

''اے باہر آکر بیٹھو۔ بچہ۔ کیا بچے کے سر پہ سوار ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کو بولا ہے اور تم لوگ ہو کہ بچوں سمیت یہاں گھسی بیٹھی ہو۔ آؤ صغریٰ باہر بیٹھتے ہیں۔ ارے جمیلہ اٹھا لاؤ اپنے بچے کو۔۔۔ خوامخواہ شور کیے جا رہا ہے۔''

دادی آن واحد میں سب کو لے کر باہر نکل گئی تھیں۔ کمرے میں خاموشی کا احساس ہوتے ہی تیمور حسن نے بازو ہٹا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ طویل سانس لے کر دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں خشک کرنے کے بعد وہ نجانے کیا سوچ رہے تھے، جب اچانک ہی کمرے کی نیم تاریکی میں کسی دوسرے

وجود کا احساس ہوا۔ بے ساختہ ہی گردن موڑ کر انہوں نے ساکت کھڑے سائے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ تب وہ سایہ حرکت کرتا ہوا ان کے نزدیک آرکا تھا۔

''تیمور بھائی!'' آواز پہچانتے ہی وہ بے اختیار نظریں چرا گئے تھے۔

''ارے بخت آور۔۔۔! تم۔۔۔؟ کمال ہے میں تو بھول ہی گیا تھا کہ۔۔۔'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھیکی سی ہنسی ہنس دیے تھے۔

''تیمور بھائی!۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟''

بخت آور ان کے قریب آرکی تھی۔ وہ جواب دیے بغیر پردے سے چھن چھن کر آتی روشنی کو دیکھے گئے۔

''آپ فکر مت کیجیے۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے، ہے نا، آج کل تو بہت ترقی کر لی ہے ڈاکٹروں نے۔۔۔'' وہ انہیں تسلی دینے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی۔

''تم مجھے دیکھنے ہاسپٹل نہیں آئیں۔'' انہوں نے دانستہ موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''آئی تھی ایک روز۔۔۔ آپ سو رہے تھے۔ پورے جسم پر پٹیاں بندھی تھیں۔ بس اس کے بعد دوبارہ جانے کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ لیکن یہاں گھر میں، میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی تیمور بھیا! گھر بالکل خالی خالی لگتا تھا آپ کے بغیر۔۔۔''

وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روک رہی تھی۔ تیمور حسن چپ چاپ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے لیٹے تھے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے گویا کچھ بھی نہیں تھا۔

''میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔'' وہ ان کی بے توجہی کو نوٹ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بیلا بھی نہیں آئی نا؟'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولے تو بخت آور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھٹک سی گئی تھی۔

''اتنے بہت سے دنوں میں اس نے ایک بار بھی محسوس نہیں کیا کہ مجھے اس کی کتنی ضرورت ہے۔'' وہ بہت دل گرفتہ نظر آرہے تھے۔

بخت آور کیا کہتی، بس نظر جھکا کر باہر آگئی تھی۔

''بیلا کو آنا چاہیے تھا سب سے پہلے، وہ آکر دیکھتی تو سہی کہ۔۔۔'' تیمور حسن کی آنسوؤں سے بوجھل آواز نے بخت آور کو بہت دیر تک اداس کیے رکھا تھا۔

☆☆☆

''وہ بہت ہی بے حس لڑکی ہے یا پھر حد سے زیادہ دردمند۔۔۔ میں جتنی بار بھی ان کے ہاں گیا ہوں۔ اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کی امی کہتی ہیں کہ وہ بہت حساس ہے، تیمور کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اسے ذرا سنبھلنے دو۔ وہ اس حادثے سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ لیکن بخت آور! اس حادثے نے ہم سے زیادہ تو کسی کو متاثر نہیں کیا ہوگا۔ کیا ہم سب اس المیے کو دیکھنے اور سہنے کے باوجود زندہ نہیں ہیں؟ کیا ہمدردی یہی ہے کہ اس شخص کو تنہا چھوڑ دیا جائے جو اس حادثے میں سب سے زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ تیمور بھائی ہر آہٹ پر چونک چونک جاتے ہیں۔ خالہ، خالو کی آمد پر ان

کے چہرے پہ جو امید ابھرتی ہے آن واحد میں بکھر جاتی ہے، میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ دل کٹ کے رہ جاتا ہے، ان کی لاچاری اور بے بسی پر۔۔۔ اتنے اچھے تھے ہمارے تیمور بھائی، خدا جانے یہ کیسی آزمائش ہے۔''

یہ شبیب تھا، بے حد الجھا ہوا پریشان حال، ذرا تنہائی میسر آئی تو اپنی ساری پر[illegible]نی بخت آور کے ساتھ بانٹنے لگا تھا۔ نہ جانے کیسا رشتہ بندھ گیا تھا اس لڑکی کے ساتھ، کہیں کوئی [illegible]یت تھی نہ پردہ داری۔ بس ایک وہی گریزاں تھی مگر کب تک۔۔۔؟ یوں لگتا تھا ایک ایک کر کے سارے ہتھیار پھینک ڈالے تھے اس نے۔ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا یا قسمت کے آسرے پر۔۔۔

تیمور حسن کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد وہ یوں بھی بہت چپ چاپ اور مضمحل سی رہنے لگی تھی۔ پہروں خاموش بیٹھی رہتی۔ شبیب آتا تو دونوں ایک دوسرے سے اپنی اپنی کہہ سن لیتے۔

تائی حسنہ تو بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں، وہ جیسے سب بھلائے بیٹھی تھیں۔ ایک دادی اور کبڑے میاں تھے جن کے جھگڑنے کی آوازوں سے سارا دن گھر گونجتا رہتا۔ دادی، کبڑے میاں سے خار کھاتی تھیں۔ کبڑے میاں دادی سے برگشتہ۔۔۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

بیلا آئی تھی مگر اتنی خاموشی سے کہ گھر میں کسی کو خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ موسم اس روز ابر آلود تھا۔ بخت آور اور دادی نیم تاریک کوٹھڑی میں دبکی بیٹھی تھیں۔ کبڑے میاں ڈیوڑھی میں جھلنگا سی چارپائی پر لیٹے، ٹھنڈے ٹھار لحاف میں مسلسل کپکپا رہے تھے۔ جب کینوس شوز میں مقید پاؤں بغیر کوئی آواز پیدا کیے ان کے قریب سے گزر گئے۔ نم آلود صحن کو پار کرتے ہوئے اس کا رخ تیمور کے کمرے کی طرف ہی تھا۔ نیم غنودگی میں لیٹے حسن نے دروازہ کھلنے کی آواز پر آنکھ کھولی تھی۔

''کون۔۔۔؟ کون ہے؟'' دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے سائے کو وہ پہچان نہ سکے تھے۔

''میں ہوں۔''

''بیلا!'' بے ساختگی سے اس نام کو دہرانے میں تیمور حسن کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

''کیسے ہو تیمور؟'' وہ سست روی سے چلتی ہوئی ان کے نزدیک آ رکی تھی۔

''اب آئی ہو پوچھنے۔ جب سارے زخم بھر چکے ہیں۔ اس وقت کیوں نہیں آئیں جب زخم ابھی کچے تھے اور بے پناہ اذیت میں تڑپتا یہ دل تم سے مسیحائی کے چاہ بہت شدت سے کر رہا تھا۔'' بہت سے شکوے زبان تک آئے تھے مگر ہونٹ ساتھ نہ دے سکے۔

''میں۔۔۔ میں بہت دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' سرد اور جامد چپ کے بعد وہ بس اتنا ہی کہہ پائے۔

''کیوں میرا انتظار کیوں کر رہے تھے تیمور حسن؟''

بہت ہی سادہ سے لہجے میں پوچھا گیا سوال، تیمور حسن کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر حیرت بھر گیا تھا۔

''کوئی کسی کا انتظار کیوں کرتا ہے؟'' تیمور کی خاموشی ایک ہی سوال کی بازگشت بن کر رہ گئی تو وہ

جیسے جھنجلا کر بولی تھی۔

''یہی تو بتانے آئی ہوں تم کو۔۔۔ کہ اب میرا انتظار مت کرو۔ میں اس راستے سے قدم موڑ چکی ہوں، جس کے دوسرے سرے پر کبھی تم کھڑے تھے۔''

باہر بادل کی آنکھ سے پہلا قطرہ گرا تھا اور ڈری سہمی ہوا کا جھونکا کمرے میں آ کر کونے کھدرے میں منہ چھپانے لگا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔۔۔ میں تمہارے دکھ میں اضافہ کر رہی ہوں۔ جانتی ہوں کہ سب لوگ میرے اس فیصلے پر ناخوش ہوں گے حتیٰ کہ میں بھی۔۔۔ لیکن تیمور! تم خود سوچو۔ زندگی ایک اپاہج شخص کے ساتھ کیسے گزاری جا سکتی ہے۔''

ٹھنڈ پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ تیمور کو اپنا جسم کپکپاتا ہوا محسوس ہوا تو وہ کمبل میں کچھ اور سمٹ گئے۔

''آج زخم نیا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ کر تمہارا ہمدرد۔۔۔ غمگسار، ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا ہوگا تمہیں، لیکن رفتہ رفتہ سب اکتانے لگیں گے تب۔۔۔ تب تم صرف میری ہی ذمہ داری بن جاؤ گے اور میں اتنی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔ میں نے تمہارے ساتھ ایک مکمل، بھرپور زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ محبت کی تھی تم سے۔۔۔ اور اس محبت کا دعوا میں آج بھی کرتی ہوں کہ اس محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے ممکن نہیں لیکن تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بھی تو ممکن نہیں رہے گا تیمور! تمہیں آسرا دیتے ہوئے میں خود تھک گئی تو کیا ہوگا؟ مجھے کون سنبھالا دے گا؟ اماں، ابا مجھ پر زور ڈال رہے ہیں تم سے شادی کرنے کے لیے۔ کہتے ہیں ''خدا سے ڈرو، یہ حادثہ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔'' لیکن تیمور! یہ حادثہ میرے ساتھ ہوتا تو تم اتنے متاثر نہ ہوتے جتنا آج میں ہوئی ہوں۔ تم تو اپنی ضروریات کے لیے محتاج ہو کر رہ گئے۔ میں تم سے شادی کر بھی لوں تو بتاؤ کہاں سے کماؤ گے۔۔۔؟ کیسے کھلاؤ گے؟ زندگی پہلے ہی بہت کٹھن ہے۔ میں اسے مزید دشوار نہیں بنا سکتی۔''

''بیلا! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' کوئی بہت اچانک کمرے میں داخل ہوا تھا۔ بٹن کی آواز کے ساتھ ہی لمحہ بھر میں کمرہ روشنی سے بھر گیا تھا۔

بیلا نے بہت تیزی سے آنکھیں میچ کر آنے والے کی طرف سے رخ موڑا تھا۔ شبیب نے ایک جھٹکے سے اسے موڑتے ہوئے اپنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

''کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' وہ متوحش سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ سُتے ہوئے چہرے اور سرخ ہوتے بھاری پپوٹوں کے ساتھ بیلا ان میں سے کسی کا بھی روشنی میں سامنا کرنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی۔

''کون کون سے تیر چلا چکی ہیں آپ اس شخص پر، جسے زندگی کی طرف کھینچ لانے کی جدوجہد ہم دن رات کر رہے ہیں۔'' وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑے جھنجھوڑ رہا تھا۔

''کوئی تیر نہیں چلایا میں نے۔ حقیقت بتائی ہے، وہ سچ بتایا ہے جو کبھی نہ کبھی اس کے سامنے آنا ہی تھا۔'' تھکے تھکے سے انداز میں اس نے شبیب کے ہاتھ جھٹک ڈالے تھے۔

''کیسا سچ۔۔۔؟'' شبیب خوفزدہ ہو گیا تھا۔ تیمور حسن کی آنکھوں میں جلتے آس، امید کے دیے

بجھ گئے تو کیا ہوگا۔ زندگی کیونکر گزر پائے گی۔

بیلا لب بھینچے کھڑی تھی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی تھی۔

شبیب تیمور کی طرف لپکا۔

زرد چہرہ، کپکپاتے ہونٹ۔۔۔ ساکت پلکیں۔۔۔ کہیں بہت گہری چوٹ لگی تھی۔

''تیمور بھائی! کیا کہا ہے اس نے آپ سے۔۔۔ تیمور بھائی بولیں۔ مجھے بتائیں اس نے کیا کہا ہے؟''

تیمور کی خاموشی نے اسے دہلا دیا تو وہ چیخ پڑا تھا۔ تب تیمور حسن کی پلکوں نے جنبش کی، برسوں پرانی نیند سے جاگے ہوئے شخص کی طرح انہوں نے خالی خالی نگاہوں سے پہلے لب کچلتی بیلا کو دیکھا اور پھر پریشان حال شبیب کو۔

''یہ کہتی ہے۔۔۔ میں اپاہج ہو گیا ہوں۔ اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا محتاج اور یہ کہ کسی اپاہج شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ کیونکہ زندگی بہت کٹھن ہے اور۔۔۔'' ان کی سانسیں ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔

''بیلا رکیں۔۔۔ میری بات سنیں۔'' شبیب بے اختیار دروازے سے باہر نکلتی بیلا کو پکارنے لگا مگر بیلا رکی نہیں بلکہ قدموں کی رفتار پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

''بیلا! آپ اچھا نہیں کر رہیں۔ بیلا پلیز! اس طرح مت کریں۔''

شبیب اس کے پیچھے لپکا تھا مگر تیمور حسن کی خراب ہوتی طبیعت نے اس کو بیلا کا بہت دور تک پیچھا نہیں کرنے دیا تھا۔

تاہم اس کی بلند ہوتی آوازوں نے گھر کے کونے کھدروں میں دبکے افراد کو ضرور جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

جس وقت سب لوگ وہاں پہنچے، تیمور حسن ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور شبیب ان کے ادھ موئے وجود کو بازوؤں میں بھینچے سسک رہا تھا۔

''بہت برا کیا ہے بیلا نے۔۔۔ بہت برا کیا ہے؟''

''یا اللہ! کون کون سے صدمے جھیلے گا میرا بچہ۔۔۔'' تائی حسنہ وہیں کمرے کی چوکھٹ پر ڈھے گئی تھیں۔ دادی اور بخت آور ہکا بکا کھڑی تھیں۔

کبڑے میاں ڈیوڑھی میں ماتم کرتے رہ گئے۔

''ارے کٹے پھٹے جسموں کو کیوں دیکھتے ہیں لوگ، دلوں میں کیوں نہیں جھانکتے۔ محبت میں مصلحت کیسی؟ سود و زیاں کا حساب کیونکر۔''

☆☆☆

''اس نے بہت جلد بازی سے کام لیا۔ وہ تھوڑا انتظار تو کرتی۔ میں خود اسے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیتا۔ اس دم توڑتے رشتے پر آخری وار اسے نہیں، مجھے کرنا تھا۔'' بہت دنوں بعد تیمور حسن کی چپ ٹوٹی تھی۔

دور بیٹھے کبڑے میاں نے زخمی چڑیا کو پانی پلاتے ہوئے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کس منت سماجت سے انہوں نے تیمور کو کمرے سے باہر آنے پر آمادہ کیا تھا ورنہ وہ تو جیسے روشنی، اجالے اور کھلے آسمان سے

ہی خوف کھانے لگے تھے۔

''بھول جائیے تیمور بھیا! اب اس ذکر سے کیا حاصل۔۔۔'' شبیب ہر قسم کی پریشانی ان کے ذہن سے کھرچ دینا چاہتا تھا۔

''کس قدر کٹھور لگ رہی تھی وہ اس وقت۔۔۔ ایسا کڑا لہجہ، ایسے بے رحم الفاظ، وہ تو راہ چلتے معذور لوگوں پر ترس کھایا کرتی تھی۔ ان سے ہمدردی کے مواقع تلاش کرتی تھی۔ کیا میرے لیے اس کے پاس ترس کھانے کی بھی گنجائش نہ تھی۔''

تیمور حسن کو اب تک وہ سب ایک خواب لگ رہا تھا۔ شبیب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے ان کے چہرے پہ پھیلی حیرت اور بے یقینی کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس بات کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے۔

''وہ آخری وقت تک مجھ سے محبت کا دعوا کر رہی تھی۔ کہتی تھی۔ ''تمہاری محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے ممکن نہیں۔ شبیب! جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے لیر و لیر جسم کو یوں کانٹوں پر گھسیٹا جاتا ہے؟''

شبیب بے چارگی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

''بیلا نے اچھا نہیں کیا تیمور بھائی! اس نے ہم سب کو بہت دکھ دیا ہے۔''

''مجھے اس کے فیصلے نے نہیں، اس کے رویے نے دکھ دیا ہے۔ اس نے اپنے جائز حق کا استعمال بہت سفاکی اور بے رحمی سے کیا ہے۔ حالانکہ اپنی رائے مجھ تک پہنچانے کے لیے اس کا میرے سامنے نہ آنا ہی کافی تھا۔ کاش وہ تھوڑا انتظار کرتی اور دیکھتی کہ محبت کرنے والے تعلق توڑنے کا ہنر کس خوبی سے نبھاتے ہیں کبھی کبھی ادھوری کہانیوں کا انجام بھی بہت خوبصورت ہوا کرتا ہے۔'' ان کی گفتگو خود کلامی میں ڈھل گئی۔

شبیب مضمحل سے انداز میں آسمان پہ اڑتے پرندوں کو دیکھتا رہا۔ کبڑے میاں زخمی چڑیا کے حلق میں پانی کا آخری قطرہ ٹپکا رہے تھے۔

☆☆☆

''سمجھ میں نہیں آتا اس گھر کا بنے گا کیا؟ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔''

تیمور نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی بخت آور سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ ایک دوپٹے میں بال لپیٹ کر سر پہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ دوسرا گلے میں۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی اچھی خاصی جمعدارنی لگ رہی تھی۔

تیمور حسن نے توجہ ہٹا کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں مگر بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' تنگ آکر انہوں نے پوچھا۔

''یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر ہوا کیا ہے، جو سارا گھر اجاڑ، ویران، جنگل بیابان لگ رہا ہے۔ جسے دیکھو منہ پھلائے اور سجائے بیٹھا ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ کے دکھی نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبڑے میاں ہیں تو انہیں دال سبزی لانے کی فکر نہیں۔ منیب ہے تو وہ سارا دن گھر میں نہیں گھستا۔۔۔ احمد کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی ہے اور تائی حسنہ ہر بندے سے یوں خفا ہیں جیسے ہر معاملے میں

بس دوسرے ہی خطاوار، قصوروار ہیں۔'' وہ کرسی کھینچ کر دھپ سے ان کے سامنے آبیٹھی تھی۔

''جانتی ہوں میں۔ اس وقت مجھے دیکھ کر آپ کی نفیس طبیعت پر جو جو کچھ گزر رہا ہوگا لیکن کیا کروں؟ دادی کی کھوئی ہوئی عینک کل واشنگ مشین میں پڑے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں سے برآمد ہوئی ہے۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ غلطی سے کپڑوں میں چلی گئی ہوگی مگر انہیں یقین ہے کہ ساری کارستانی کبڑے میاں کی ہے۔ خیر جانے دیجیے اس قصے کو۔ معاملہ تو یہ ہے کہ اب عینک ملنے کے بعد جو انہوں نے گھر کا جائزہ لیا تو شامت کس کی آئی، مجھ مسکین کی۔ آج کے آج گھر شیشے کی طرح نہ چمکایا تو ہوسکتا ہے کل علی الاعلان کسی پنکھے کے ساتھ لٹکی ہوئی پائی جاؤں۔''

''توبہ ہے بخت آور! کتنا بولتی ہو تم؟'' عجیب اکتایا سا انداز تھا ان کا۔ بخت ... جھٹک کر رہ گئی۔

''شکر نہیں کرتے کہ میری سریلی آواز صبح وشام گھر میں سننے کو ملتی ہے۔ اگر میں بھی چپ کا روزہ رکھ لوں، جیسا کہ سب نے رکھا ہوا ہے تو صرف کوؤں کی آوازیں سننے کو ملیں یا پھر کبڑے میاں کے جوتے کی دھمک۔۔۔'' اپنی بات ختم کرکے وہ خود ہی زور سے ہنس دی تھی، بالکل بے موقع، بے وجہ۔

تیمور حسن نے بغور اسے دیکھا۔

اس کی ہنسی میں وہ بے ساختگی مفقود تھی جسے اس سے پہلے وہ ہمیشہ محسوس کرتے تھے۔ صاف ظاہر تھا وہ محض انہیں بہلانا چاہ رہی تھی یا پھر گھر میں بہت دنوں سے پھیلی سوگواری فضا کو خوشگوار بنانے کی کوشش کررہی تھی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے مسکرادیے تھے۔ محض اس کا دل رکھنے کے لیے۔

''ہاں، محسوس تو میں بھی کررہا ہوں۔۔۔ گھر میں سب لوگ میری وجہ سے پریشان ہیں لیکن میں چاہنے کے باوجود خود کو ابھی اس قابل نہیں کرپایا کہ ہنستے مسکراتے دوسروں کو تسلی دوں۔ انہیں اطمینان دلاؤں کہ میں اس حادثے کے اثرات دل سے قبول کرچکا ہوں اور یہ کہ کسی قسم کا احساس محرومی میرے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ ابھی یہ ممکن ہی نہیں میرے لیے۔ میں لاکھ خود کو حوصلہ مند بناؤں لیکن جب جب اماں میرے سامنے آتی ہیں، میری آنکھ اپنے ہی دکھ سے بھر آتی ہے۔ شبیب اور کبڑے میاں کو اپنے لیے تکلیف اٹھاتے دیکھتا ہوں تو احساس جرم سا دل میں بھرنے لگتا ہے۔ ایک عرصہ لگا تھا مجھے اس قابل ہونے میں کہ اس پورے گھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاسکوں لیکن یہ کیا کہ آج میں خود ایک بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔''

تیمور حسن کی آواز بھرا گئی تو وہ لب بھینچ کر خود پر قابو پانے لگے تھے۔

بخت آور اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو دھکیل کر بولی تو اس کا لہجہ بہت شگفتہ تھا۔

''اچھا لگا تیمور بھائی کہ آپ نے خود کو کوئی غیر معمولی انسان ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ حادثہ اتنا معمولی نہیں کہ اسے چٹکیوں میں اڑایا جاسکے۔ یقیناً بہت ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے آپ کو۔ لیکن ایک بات بتاؤں تیمور بھائی! انسان بوجھ اس وقت بنتا ہے جب وہ کسی ذہنی معذوری کا شکار ہوجائے۔ جسمانی معذوری کے لیے ایک چھوڑ کئی سہارے مل سکتے ہیں لیکن اگر آپ ذہنی طور پر منتشر پریشان اور لاچار ہوجائیں گے تب آپ اپنے لیے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی مشکلات پیدا کردیں

گے۔ جسمانی سہارا دینا آسان ہے جذباتی سہارا دینا مشکل۔ اللہ نے آپ سے صرف ایک نعمت چھینی ہے۔ دل، دماغ، نظر سب موجود ہے۔ عقل اور شعور ہے جو ہر محرومی کا نعم البدل ہوسکتے ہیں۔ آپ ذہنی طور پر خود کو مضبوط بنالیں تو ابھی بھی آپ اس قابل ہیں کہ اس گھر کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاسکیں۔ کندھے تو ماشاء اللہ سلامت ہیں نا آپ کے؟''

وہ آخر میں شرارت سے ہنسی تو تیمور حسن بھی پھیکی سی ہنسی ہنس دیے تھے۔

''یہ سب باتیں تم کہہ رہی ہو۔ جب کہ میں کسی اور سے سننے کا آرزومند تھا۔''

''ارے جانے دیجیے۔ بے لحاظ و بے مروّت لوگوں کو یاد کرنے میں کون وقت برباد کرے۔''

''ایسا مت کہو بخت آور۔۔۔! اسے حق حاصل تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کرتی۔'' وہ فوراً اسے ٹوک بیٹھے تھے۔

''کاش۔۔۔ وہ واقعی اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کرتی۔'' بخت آور نے پوری سنجیدگی سے کہا تو تیمور سر جھٹک کر مسکرادیے۔

''ہاں اس گھر کے ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے فیصلے کو غلط قرار دے دے۔ تاہم مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔''

''اب اگر آپ خود کو اعلیٰ ظرف بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

وہ کندھے اچکاتی دوبارہ جھاڑ پونچھ میں مصروف ہوگئی تو تیمور حسن نے مسکراتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے کتاب اٹھالی تھی۔ بخت آور نے کچھ وقت کے لیے ہی سہی، ان کو مایوس سوچوں سے نجات ضرور دلادی تھی۔

☆☆☆

تائی حسنہ، منیب اور احمد سمیت تیمور حسن کے کمرے میں محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ وہ صحن میں بیٹھی پوری توجہ سے تائی حسنہ کے دوپٹے پر کروشیے کا کام کررہی تھی، جب کسی کی نظروں کی تپش نے اسے بے اختیار ہی سر اٹھانے پر مجبور کردیا۔ یونہی بے ارادہ وہ بے اندازہ اس نے کبڑے میاں کی طرف دیکھا جو اس سے کچھ فاصلے پر پالش، برش اور جوتے کے کئی جوڑے آس پاس پھیلائے بیٹھے تھے لیکن جانے کب سے اپنا کام بھولے بیٹھے تھے۔ اب نگاہیں اس پر جمی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بخت آور کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''یہ کیا ہوگیا کبڑے میاں کو؟'' اس کے ماتھے پر ایک ساتھ کئی تیوریاں ابھریں۔ تب کبڑے میاں چونکتے ہوئے بھرپور انداز میں مسکرادیے تھے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رکے اور پھر سر جھٹک کر رہ گئے۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے ان کا'' وہ جھنجھلا کر رخ موڑ گئی۔

''بخت آور! تم ہم سب لوگوں کا کتنا خیال رکھتی ہو۔''

بخت آور کے تیزی سے چلتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے۔

''ہم سب لوگوں کا۔۔۔؟ ہونہہ، اچھی خوش فہمی پالی ہے۔'' وہ بولے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔

''تمہارے آنے سے گھر میں رونق سی ہوگئی ہے۔ نجانے کیوں دل چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ۔۔۔ لیکن

میرے بارے میں اس طرح کا فیصلہ کرتے پھریں۔۔۔" بخت آور کی تلخ و ترش آواز رات کی خاموشی میں ابھری تو دادی گھبرا سی گئیں۔

"ایسی بلند آواز۔۔۔ کسی نے سن لیا تو۔۔۔" انہیں پچھتاوا ہونے لگا۔ کیوں اس وقت بات چھیڑی۔

"اے ہمارے بھلے کو کہہ دیا بے چارے نے، تم کاہے کو اتنا گرم ہو رہی ہو۔"

"گرم ہونے والی بات نہیں ہے کیا؟ وہ بڈھا کھوسٹ، کبڑا، ٹھگنا شخص خود کو سمجھتا کیا ہے میں بھی حیران تھی، چوبیس گھنٹے چونچیں لڑانے والوں میں دوستی کیسے ہوگئی۔ اب پتا چلا یہ پٹیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔" اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔

"وہ کیا پٹیاں پڑھائے گا بے چارہ! اس نے تو ایک بات کہی تھی، میرے دل کو لگی تو تم سے کہہ بیٹھی اور۔۔۔ حسنہ بھی تو یہی چاہتی ہے۔" دادی کی سرگوشی نے اسے ایک لمحے کے لیے سن کر دیا تھا۔

"کیوں نہیں چاہیں گی وہ، اور اب کون آئے گا بھلا ان کے اپاہج بیٹے کے لیے۔ لے کر مجھے نظر میں رکھ لیا۔ غریب، یتیم، بے آسرا لڑکی۔ احسانوں کے بوجھ تلے دبی، کیسے سر اٹھائے گی کیا بولے گی۔ زبان دو وقت کی روٹی سے بند، سر اس چھت نے جھکا دیا۔ مفت کا مال ہوگئے ہم تو جب دل چاہا کوڑا، کچرا سمجھ کر پرے ہٹا دیا۔ جب ضرورت پڑی سونا، ہیرا جان کر سینے سے لگا لیا۔"

اس نے لحاف اٹھا کر دور پھینکا اور دیوار سے ٹیک لگا کر سسکنے لگی۔

دادی سر تھام کر رہ گئیں۔

وہ حیران تھیں، پریشان بھی۔ سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی سوچ اتنا گہرا رخ اختیار کر سکتی ہے۔ وہ ابھی تک اسے بھولی بھالی، بڑبولی سی بخت آور سمجھ رہی تھیں۔ انہیں کہاں خبر تھی کہ سوچ زاویہ بدل چکی ہے۔ نہ دل پہلے سا کورا رہا۔ نہ دھڑکن کی لے وہ رہی۔

کوئی اس کی چھپی چھپائی ذات کو باہر نکال کر جھاڑ پونچھ کر بڑے لاڈ پیار سے دل کے آنگن میں سجا چکا ہے۔ کسی نے اہم جانا، اہم سمجھا تو ایک غرور سا خود بخود وجود میں سما گیا تھا۔ نگاہ قدموں سے اٹھ کر دور زمین پہ جھکتے آسمان کو چھونے لگی تھی اور آج۔۔۔ کیسی ٹھوکر سی لگی تھی دادی کی بات سے۔

"کبڑے میاں کہتے ہیں۔ بخت آور کا ہاتھ تیمور کو تھما دو۔ اس حادثے نے صرف اس کے جسم کا ایک حصہ چھینا ہے۔ ہمت و حوصلہ جوں کا توں ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں زندگی کو نیا جنم لیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، اس کی معذوری کو مت دیکھو۔ قسمت کی آنکھ تمہارے، میرے جیسی نہیں ہوتی۔ مہربان ہونے پر آئے تو رنگ، روپ، کٹیا، محل کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ دیکھو اس کی روشن پیشانی، وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں۔ بخت آور چین اور سکون پائے گی اللہ کے فضل سے۔"

کبڑے میاں کی نیک خواہشات نے کیسا تیر گھونپا تھا جگر میں، وہ بہت دیر تک سسکتی رہی، دادی اماں سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتی رہیں آخر تنگ آ کر چیخ پڑی۔

"اتنے ہی گن ہیں تیمور بھیا میں تو بیلا کیوں چھوڑ گئی انہیں۔ آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں باقی عمر بھی ترس ترس کر، سسک سسک کر گزاروں۔ چار پائی پر پڑا مجبور و محتاج شخص آخر میرے لیے کر بھی کیا سکتا ہے۔ تحفظ روپیہ، پیسہ، کچھ بھی تو نہیں مل سکتا ان سے دادی۔۔۔ تیمور بھیا صرف ایک خالی کشکول

خیر جانے دو۔۔۔ تمہاری دادی کہاں ہیں؟"

"خبر نہیں۔۔۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ وہ چاہتی تھی کبڑے میاں یہاں سے اٹھ جائیں لیکن ان کے انداز بھی نجانے کیوں بدلے ہوئے تھے۔ خوامخواہ بات سے بات نکالتے جا رہے تھے۔

"بخت آور تم ہی کبھی کبھار تیمور کے پاس چلی جایا کرو۔ یونہی کبھی کوئی بات سنا دی، کبھی ادھر ادھر کی باتیں۔ میرا مطلب ہے بڑا چپ چپ رہنے لگا ہے۔ شبیب، اپنی نوکری کی بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہے۔ باقی پڑھائی میں مصروف۔۔۔ تو۔۔۔"

"کبڑے میاں! میلے کپڑے سرف میں بھگو دیں اور دیکھیں سبزی والا آیا ہے تو ٹماٹر اور دھنیا لے لیجیے۔" اس نے واضح طور پر اکتاہٹ بھرے انداز میں انہیں ٹوکا اور خود اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

"انہیں زیادہ خبر ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔۔۔" اس نے دوپٹے کے الماری میں رکھا۔ دھاگہ لپیٹ کر سنبھالا۔ پھر بستر کی چادریں بدل کر میلی چادریں ٹب میں بھگو کر باورچی خانے کی طرف آئی تو ٹھٹھک سی گئی۔

کبڑے میاں اور دادی سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دم جس طرح خاموش ہوئے تھے اس کا حیران ہونا بجا تھا۔

"کبڑے میاں! میں نے آپ سے کہا تھا کہ۔۔۔"

"ہاں، ہاں بس جا رہا ہوں۔" کبڑے میاں کھسیانی ہنسی ہنستے وہاں سے چل دیے۔

"یہ کبڑے میاں کیا کہہ رہے تھے۔"

"ہوں، کچھ نہیں۔۔۔" دادی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"ارے واہ! کانوں میں گھسے بیٹھے تھے آپ کے اور ابھی کچھ کہا ہی نہیں۔" وہ مشکوک سی پوچھ رہی تھی۔

"جان مت کھا میری، تیرے کام کی بات نہیں۔"

"آپ کے کام کی تو ہے نا وہی بتا دیں۔"

"جان مت کھا میری، سوچنے دے مجھے۔ ایک نئی پریشانی میں ڈال گیا یہ کبڑا۔"

"کون سی پریشانی۔۔۔ دادی کون سی پریشانی؟" اس نے جھٹ ان کا گھٹنا تھام لیا۔

"آئے۔۔۔ ہائے اب تو آ جا میری جان کو۔ دفع ہو، مجھے حواسوں میں واپس تو آنے دے جونک بن کر چمٹ گئی مجھے، چل ہٹ کچھ کام وام کرنے دے۔" دادی اسے بری طرح جھڑک کر چولہا جلانے لگیں۔ وہ منہ بناتی وہاں سے اٹھ گئی۔

"امی پوچھ رہی ہیں، آج کیا پکے گا۔۔۔؟" احمد نے غلطی کی جو اسے پکار بیٹھا۔

"بندر کی کھوپڑی اور مچھر کے سری پائے۔ ویسے ابھی گلے نہیں۔" وہ اسے ایک طرف دھکیلتی کپڑے دھونے چل دی تھی۔

☆☆☆

"وہ ہوتے کون ہیں ہمارے معاملات میں بولنے والے۔۔۔ انہیں کس نے حق دیا ہے کہ وہ

ہیں۔ جو دوسروں کی خیرات سے ہی بھر سکتا ہے۔ ہر کسی کو اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے دادی! وہ سب تیمور بھیا کے لیے سوچتے ہیں۔ لیکن آپ کو صرف میرے لیے سوچنا ہے۔ صرف میرے لیے۔''

''تیرا دماغ خراب ہے اور کچھ بھی نہیں۔ روٹی، رزق، غم، خوشی سب انسان کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ اس سے زیادہ کہاں سے حاصل کرے گی تو۔۔۔ آج اس بے بس کو ٹھکرا رہی ہے۔ کل کلاں کوئی عقل کا اندھا مل گیا تو۔۔۔ کسی کی سوچ لولی، لنگڑی ہوئی تو۔۔۔؟ کس کس کو کہاں کہاں دھتکارے گی۔ اللہ سے خوف کھا۔ آج اس بے چارے پر رحم کھائے گی تو کیا خبر اوپر والا تجھ پر رحم کھا لے۔ تجھے تیری اوقات سے بڑھ کر دے دے۔''

دادی اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی تھیں، لیکن اس نے کمال بدتمیزی سے انہیں پرے دھکیل دیا تھا۔

''انھیں یہاں سے پتا نہیں کیسی سوچ ہے۔ آپ کی جہاں اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا اللہ کو بیچ میں لے آئیں۔ نہیں کرنا میں نے کسی پر بھی رحم، آ جائے جو قیامت مجھ پر ٹوٹنی ہے۔''

وہ گستاخی پر اتر آئی تو دادی منہ ہی منہ میں بکتی جھکتی اٹھ کر اپنی چارپائی پہ آ گئیں۔ وقفے وقفے سے جاری بخت آور کی بڑبڑاہٹوں نے انہیں بہت دیر تک جگائے رکھا تھا۔

☆☆☆

نجانے کن خیالوں میں گم تھی، وہ سوٹ دھو کر ذرا زور سے نچوڑ دیا تو ''چیں'' کی آواز سے دامن قمیص سے الگ ہو گیا۔

''ہائیں۔۔۔'' وہ آنکھیں پھاڑے اس اندوہناک منظر کو دیکھتی رہی۔ دو ہی تو جوڑے تھے اس کے پاس۔۔۔ ایک تن پر اور دوسرا ہاتھ میں دھجیوں کی صورت۔

''ساری مصیبت ہمارے لیے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ قمیص گول مول کر کے ایک طرف اچھالی، دامن آنسوؤں سے خوب ہی تر کیا اور نچوڑ ڈالا۔

''کرتے رہیں وضو۔۔۔ جنہیں کرنا ہے۔ ہمارے لیے تو سب بے کار، پوری دنیا جی کا جنجال، خوامخواہ کا وبال، اور آپ بھی سمیٹ رکھیں سارا خزانہ، مر جاؤں تو نذر، نیاز دیتی رہیے گا۔ جیتے جی تو کوئی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہو گی۔ جس کی آپ جیسی دادی۔۔۔'' گلے میں پھندا سا پڑ گیا تھا۔ کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

دادی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی، کوستی اٹھیں اور قمیص اٹھا کر جائزہ لینے لگیں۔ مرمت کے قابل ہے یا نہیں۔

بخت آور نے بہتے آنسوؤں کے درمیان ساری کارروائی دیکھی اور پھر چیل کی طرح ان پر جھپٹ پڑی۔

''خبردار! جو اب آپ نے اسے جوڑنے سینے کا سوچا بھی۔ چولہے میں جھونک دوں گی۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے قمیص کو نوچ کھسوٹ کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ دادی نے سر تھام لیا۔

وہ روتی دھوتی کمرے میں بند ہو گئی۔ دادی ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر قمیص کا جائزہ لینے لگیں پھر کوئی چارہ نہ پا کر کبڑے میاں پر ٹوٹ پڑیں جو سبزی لے کر ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''صبح کے گئے اب لوٹے ہو، کیا وقت ہو چکا ہے۔ اب اگر لڑکے بالے آ کر کھانا مانگیں گے تو کیا دوں گی انہیں۔۔۔ تمہارا سر۔۔۔''

''ارے واہ! میرا سر کیا فالتو ہے؟'' کبڑے میاں پہلے ہی منڈی کے بھاؤ تاؤ سے چڑے ہوئے تھے۔ پھاڑ کھانے کو دوڑے پھر جوتا گھسیٹتے باورچی خانے میں گھس گئے۔

''آئے۔۔۔ ہائے پاؤں اٹھا کر نہیں چل سکتے کیا؟'' دادی کو سخت وحشت ہوتی تھی اس آواز سے۔۔۔

''اٹھا کر سر پہ رکھ لوں کیا؟''

''نہیں توڑ کر جیب میں رکھ لو۔ بھلا ہو گا تمہارا۔'' وہ جلی بھنی باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔

''جانے کس گناہ کی سزا پا رہے ہیں آپ کی صورت، اب تو کچھ یاد بھی نہیں۔ بوڑھے لوگوں کی سماعت کمزور ہو جایا کرتی ہے سنا تھا، اللہ جانے کن خوش نصیب گھروں میں بستے ہوں گے وہ بوڑھے۔ ہماری قسمت میں تو یہ رکھی تھی۔ خرانٹ بڑھیا! دیوار پار کی باتیں سن لیتی ہیں۔ جھوٹ فر فر بولتی ہیں۔ ان جیسا چاپلوس زمانے بھر میں کوئی دوسرا نہ ہو گا۔ چالاکی میں کوؤں کو مات دیتی ہیں اور کن سوئیاں لینے کی عادت تو عذاب بن گئی ہمارے لیے۔''

انہوں نے چھری پٹخ کر دادی کو گھورا جو انہیں بڑبڑاتے دیکھ کر سماعتوں پہ زور دے رہی تھیں۔

''اب کھڑی کیا ہیں۔۔۔ پیاز کاٹ رہا ہوں۔ سبزی بنا لیجیے۔''

دادی گڑبڑا کر سیدھی ہوئیں۔ ٹوکری سے سبزی نکالنے لگیں۔

''بخت آور کو بلا لیجیے۔ اگر یہی رفتار رہی تو رات تک ہی کھانا ملے گا سب کو۔''

کبڑے میاں بڑی تیزی سے پیاز چھیل رہے تھے۔ دادی ڈھیٹ بنی رہیں۔ جانتی تھیں اب وہ اتنی جلدی باہر آنے والی نہیں۔

کبڑے میاں نے پیاز کاٹ کر دادی کے حوالے کی اور خود باہر آ کر اسے پکارنے لگے۔

''بخت آور! ارے بھئی کہاں ہو؟'' انہوں نے کچھ بکھری ہوئی چیزیں سمیٹیں۔۔۔

''سبزی بنا لو، تمہاری دادی کے ہاتھ کا بنا کون کھا سکے گا بھلا۔'' وہ بلند آواز سے کہتے تیمور کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ وہ کتاب سینے پہ دھرے سو رہے تھے۔ کبڑے میاں کی دل میں ممتا سی جاگ اٹھی تھی ان کے لیے۔ بڑی آہستگی سے کتاب اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھی، تیمور کے جگری یار علی رضا نے بہت امید دلائی تھی۔

''آپ فکر مند مت ہوں کبڑے میاں! تیمور کو ان شاء اللہ پہلے کی طرح چلتا پھرتا دیکھیں گے آپ۔''

اس نے دعوا کیا تھا۔ علی رضا کے ماموں بڑے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر۔۔۔ کبڑے میاں نے تو آنکھ بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ دن رات دعائیں کرتے۔ علی رضا کے لیے بھی اور تیمور کے لیے۔

''کیا گوشت پوست کی ٹانگیں لگیں گی دوبارہ۔۔۔ درد، تکلیف تو نہیں ہو گی۔'' ان کی پریشانی اپنی جگہ، علی رضا بہت دیر تک ہنستا رہا تھا۔

''اصلی نہیں، مصنوعی ٹانگیں، کبڑے میاں!''

''ہا۔۔۔ہا۔۔۔مصنوعی ٹانگیں۔'' کبڑے میاں افسوس سے سر جھٹک کر تیمور حسن کے اوپر چادر برابر کرتے باہر نکل آئے۔ ڈیوڑھی میں چارپائی بچھا کر لیٹے ہی تھے کہ شبیب اندر داخل ہوا اور زوردار سلام جھاڑا۔

''کبڑے میاں! جلدی سے کھانا دیں۔ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔'' موٹر سائیکل کھڑی کر کے وہ واش بیسن پہ ہاتھ دھونے لگا۔

''تیمور بھیا!''

''سو رہے ہیں۔'' کبڑے میاں کہتے ہوئے باورچی خانے میں چلے آئے۔

''بخت آور کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ دروازے بند کیے کیوں بیٹھی ہے؟'' شبیب کے لیے کھانا نکالتے ہوئے انہوں نے سوچ میں گم دادی کو چونکا دیا۔

''ٹھیک ہے طبیعت، تنگ کرنے پہ آئے تو یہی کیا کرتی ہے۔ نہ کسی کی مجبوریوں کا لحاظ نہ پریشانی کا خیال۔'' گھٹنوں پر زور دیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کبڑے میاں نے بغور انہیں دیکھا۔

چہرہ تھکا تھکا سا۔۔۔پریشان، بیزار۔

''کیا بات ہوئی ہے؟''

دادی کو جواب دینے پر آمادہ نہ دیکھ کر کبڑے میاں ٹرے اٹھائے کمرے میں چلے آئے۔

''کبڑے میاں! گھر میں بہت سناٹا ہے۔'' شبیب کپڑے بدل کر پلنگ پہ دراز ہو چکا تھا۔

''ہاں بھئی! سناٹا تو ہوگا ہی۔ احمد ابھی تک اسکول سے نہیں لوٹا۔۔۔منیب اور آپا جان صبح سے گئے ہوئے ہیں ماموں کی طرف۔۔۔پھر سناٹا تو محسوس ہوگا نا۔''

کبڑے میاں نے پانی کا گلاس بھر کر سامنے رکھا۔ شبیب بس انہیں گھور کر رہ گیا تھا۔

''جی ہاں! مجھے تو نہیں معلوم کہ احمد اس وقت اسکول میں ہوتا ہے اور منیب نے آج اماں کے ساتھ ماموں کی طرف جانا تھا۔'' اس کے جھنجھلا کر کہنے پر کبڑے میاں ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھتے دانت نکوستے باہر چل دیے۔

''ہاں میاں! سناٹا تو ہے۔ خالی، ویران، بھائیں بھائیں کرتا آنگن۔'' انہیں شدت سے گھر میں پھیلی غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔

سونے پن میں ہلچل مچانے والی کمرے میں بند تھی۔ ان کا دل ہولنے لگا۔ عادت ہو گئی تھی، بخت آور کو اِدھر سے اُدھر چلتے پھرتے دیکھنے کی۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سننے کی۔ حالانکہ وہ ان سے کم ہی براہ راست مخاطب ہوتی تھی لیکن پھر بھی بظاہر وہ اپنے کام میں مصروف مگر درپردہ اسی کی باتوں پر دھیان رکھے رہتے تھے۔

''بخت آور۔۔۔بخت آور۔۔۔کھانے کا وقت ہے۔ دروازہ کھولو۔۔۔'' وہ اس کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔

''کس بات پر ناراض ہو۔۔۔؟ دادی نے کچھ کہا ہے کیا؟''

''کبڑے میاں! مجھے تنگ مت کریں، میں بہت بدلحاظ ہوں اور بدتمیز بھی۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ الٹا

سیدھا کہہ بیٹھوں۔'' دروازہ کھول کر ایک لمحے کے لیے وہ سرخ چہرے کے ساتھ سامنے آئی اور پھر کھٹاک سے دروازہ بند ہو گیا۔

کبڑے میاں چند لمحے دروازے کو گھورتے رہ گئے تھے۔

''ارے میاں! ایسے نہیں باہر آنے کی وہ۔ سال میں ایک مرتبہ ایسا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اسے چھوڑ دو اس کے حال پر جب اپنا دل مان گیا تب سب بھول بھال سامنے آ جائے گی۔۔۔ہنستی کھیلتی پہلے جیسی۔''

دادی اپنی پریشانی کو بے فکری کے لبادے میں چھپا کر ڈیوڑھی میں آ بیٹھیں۔ جانتی تھیں سارا غصہ رات کی بات کا ہے۔ قمیص کا تو بس بہانا ڈھونڈا۔

''آپ سا پتھر دل بھی ہوگا کوئی۔'' کبڑے میاں دادی کی بے حسی پر کڑھ کر رہ گئے۔

''بچی کب سے بھوکی پیاسی کمرے میں بند ہے۔ پوچھا تک نہیں۔ ایک وہی ہے جو سارا سارا دن ایک ایک کے آگے پیچھے پھرا کرتی ہے۔''

دادی سے بڑھ کر ظالم اور جابر کون ہو سکتا تھا کبڑے میاں کی نظر میں، باورچی خانے میں جا کر کھانے کی ٹرے تیار کی اور پھر دروازہ بجانے لگے۔

''بخت آور۔۔۔بخت آور کھانا کھا لو۔ دادی نے بہت مزے کی بھجیا بنائی ہے۔''

''بھئی! کھانے سے کیا ناراضی۔۔۔اور ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم۔۔۔ہم سے کیوں خفا ہو۔۔۔؟''

کبڑے میاں کی بھدی، سپاٹ آواز، بے ڈھنگی دستک صحن کی خاموشی میں وقفے وقفے سے ابھرتی رہی۔ بے چارے کبڑے میاں منانے کے ڈھنگ سے ناواقف بس اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر لمحہ کے لیے جو بخت آور کا چہرہ نظر آیا تھا وہ آنکھوں میں کھب کر رہ گیا تھا متورم آنکھیں خوب روئی ہوئی بھیگا نم چہرہ بیٹھی بیٹھی سی آواز۔۔۔دل کٹا جا رہا تھا۔۔۔پھر کیسے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے، ٹرے میں رکھا سالن ٹھنڈا ہو چلا تھا، مگر ان کی انگلیاں بند دروازے پر دستک دیتے نہ تھکی تھیں۔

پھر بالآخر دروازہ کھل گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے وہ باہر نکل کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا تکلیف ہے آپ کو۔۔۔؟'' لہجہ حد درجہ گستاخانہ۔۔۔چہرہ تمتمایا ہوا، شعلہ اگلتی آنکھوں میں نفرت کی انتہا۔

''میں۔۔۔میں یہ کھانا۔'' کبڑے میاں بوکھلا سے گئے تھے۔

''کیوں لائے ہیں کھانا۔ میں نے مانگا تھا آپ سے۔ کہا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے؟''

''نن۔۔۔نہیں مگر کھانے کا وقت۔۔۔''

''ہزار بار یہ جتانے کی کوشش کی ہے میں نے کہ مجھے بلانے۔۔۔مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش مت کیا کریں۔۔۔سنا آپ نے، مجھے آپ سے نفرت ہے۔۔۔بہت برے لگتے ہیں آپ۔۔۔میں اس جگہ سے اٹھ جاتی ہوں جہاں آپ موجود ہوں۔۔۔لیکن آپ پھر بھی سمجھ نہیں پاتے۔۔۔کس ڈھیٹ مٹی سے بنے ہیں آپ کہ پھر بھاگے چلے آتے ہیں۔ نہیں ضرورت مجھے آپ کے

کھانے کی۔۔۔لے جائیے اسے۔۔۔''

اس نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ہوا میں اچھالتے ہوئے گویا سارے غم وغصے کو نکال دینے کی کوشش کی تھی۔

''اور کان کھول کر سن لیں کبڑے میاں! آئندہ آپ نے مجھ سے یا میرے کسی بھی معاملے سے کوئی تعلق رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ان ہی لوگوں پر لٹائیے اپنی محبت اور ہمدردی جو اس کے مستحق ہیں اور عادی بھی۔میری جھولی میں تو آپ اپنے جیسی چھوٹی موٹی بدنما اور کبڑی خواہشات ڈالیں گے۔ جائیے کبڑے میاں جائیے اور بخشیے مجھے۔''انتہائی تنفر سے دونوں ہاتھ جوڑتی وہ پلٹ گئی تھی۔

کبڑے میاں کی ساکت آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر کمرے کا سپاٹ دروازہ تھا۔اور ان کا دل جو چند لمحے قبل بند ہو چکا تھا ایک ہچکی لے کر دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔

''یہ کیا کہا ہے بخت آور نے ابھی ابھی۔''انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو تھاما۔

''اسے مجھ سے گھن آتی ہے۔وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔۔۔؟''

'کیوں۔۔۔؟ کس لیے۔۔۔؟''

''ارے کبڑے میاں میں نے کہا تھا نا!۔۔۔چھوڑ اسے اس کے حال پر۔'' دادی ڈیوڑھی میں سے چلا رہی تھیں۔

کبڑے میاں کپکپاتے ہاتھوں سے بکھرے برتن سمیٹ رہے تھے۔دھندلی آنکھوں اور سائیں سائیں کرتے کانوں سمیت۔۔۔نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی۔۔۔وہ بمشکل خود کو گھسیٹتے باورچی خانے تک لے گئے۔

نجانے کیوں دل پگھلا جا رہا تھا وہ وہیں فرش پر دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ان کا بد وضع وجود بہت دیر تک ان کے بہتے آنسوؤں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا تھا جبکہ اندر کمرے میں بیٹھا شبیب اپنی جگہ ساکت وصامت تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔تائی حسنہ ابھی ابھی واپس آئی تھیں۔سخت فکرمند و پریشان۔

''فلاں نے کھانا کھایا یا نہیں۔۔۔تیمور کو کسی نے پوچھا یا یونہی پڑا رہا۔۔۔احمد کا چہرہ کیوں اترا ہوا لگ رہا ہے۔۔۔؟''

''ارے حسنہ۔۔۔ایک دن کے اندر اندر کیا دنیا بدل گئی۔تمہارے بعد سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا تم چھوڑ گئی تھیں۔کھانا ہر روز کی طرح دونوں وقت پکا کھایا تیسرے وقت تم خود آ موجود ہوئیں اور احمد بھلا ایک دن میں کہاں کا پہلوان بن جاتا، حد ہو گئی بھئی۔۔۔''اندرونی خلفشار میں مبتلا دادی چڑ گئیں اس بے وجہ کی پریشانی سے۔

''خفا کیوں ہو گئیں بی اماں۔۔۔بس یونہی پوچھ لیا۔۔۔شبیب بھی تو نظر نہیں آ رہا اور کبڑے میاں کی تو میں جب سے آئی ہوں آواز ہی نہیں سنی۔'' تائی حسنہ بولتی رہیں۔دادی اپنی سوچ میں غرق، باورچی خانے میں بخت آور برتن اٹھا اٹھا کر پٹختی رہی۔نجانے کس پر غصہ آ رہا تھا۔۔۔کتنی روٹیاں

جلائیں۔کتنی ہی کچی اتار لیں۔مارے بندھے کام ختم کیا باہر نکلی ہی تھی جب صحن میں بندھے تار سے کپڑے اتارتی تائی حسنہ نے پکار لیا۔

''یہ کبڑے میاں ڈیوڑھی سے چارپائی نکال کر کہاں لے گئے۔ابھی سردیاں ختم کہاں ہوئی ہیں اچھی خاصی ٹھنڈ ہوتی ہے باہر۔''

بخت آور نے کوئی جواب نہیں دیا۔تائی حسنہ خود ہی جھانک کر آئیں۔

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی باہر چبوترے پہ چارپائی ڈالے بیٹھے ہیں۔۔۔کہتے ہیں یہیں ٹھیک ہوں۔۔کیا بچوں والی ضد لگائی ہے ٹھنڈ ونڈ لگ گئی تو یہاں ہزاروں کام رکے رہیں گے۔پریشانی الگ۔''بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے کمبل نکال کر بخت آور کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''کبڑے میاں کو دے آؤ۔۔۔خود سے تو کبھی کسی چیز کی مانگ نہیں کریں گے۔'' وہ تیمور بھیا کے کمرے میں چلی گئیں۔بخت آور کو بادل نخواستہ کمبل اٹھانا پڑا۔

دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

پندرہویں کا چاند تھا۔نم آلود چاندنی میں ہر چیز بہت صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔کمبل میں لپٹے لپٹائے کبڑے میاں دروازے کی طرف پشت کیے چارپائی پہ سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔پراسرار خنک چاندنی میں دائیں، بائیں جھولتی ایک عجیب الخلقت چیز۔

بخت آور کو خوف سا محسوس ہونے لگا۔

الٹے پاؤں بھاگنے ہی والی تھی۔جب شبیب آتا دکھائی دیا۔حسب توقع وہ سیدھا کبڑے میاں کے پاس جا رکا تھا۔

کبڑے میاں! یہاں کیوں چارپائی۔۔۔''وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

''ہونہہ، ہمدردیاں سمیٹنے کا کتنا شوق ہے انہیں۔بے وجہ کے نخرے۔''اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا۔

شبیب کبڑے میاں کے برابر بیٹھا انہیں بازوؤں میں لیے سرگوشیاں کر رہا تھا۔تاہم کبڑے میاں کی آواز بلند تھی۔

''نہیں شبیب میاں! مجھے یہیں رہنے دو۔ڈیوڑھی میں دم گھٹنے لگتا ہے میں یہیں ٹھیک ہوں۔۔۔ٹھیک ہوں۔میں۔''

ان کی آواز کپکپا گئی تھی۔لہجہ ڈوب گیا۔فضا میں نمی سے گھلنے لگی تھی۔بخت آور نے کمبل گول مول کر کے وہیں سے چارپائی پہ اچھالا اور خود واپس لوٹ آئی۔

☆☆☆

''کہاں مصروف رہتے ہو آج کل؟''شبیب عجلت میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بس اچانک ہی سامنے آ گئی تھی۔

''اسلام آباد سے کال آئی ہے۔وہاں جانے کی تیاری کر رہا ہوں تیمور بھائی کو بھی لے کر جانا ہے، علی رضا۔'' وہ بتا رہا تھا بخت آور یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

''شبیب! پریشان ہو؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

الماری کا پٹ کھولتے ہوئے شبیب نے پلٹ کر ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر کچھ کاغذات نکالنے لگا۔

''میں کبڑے میاں کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

''کیوں انہیں کیا ہوا ہے؟'' کبڑے میاں کا نام سنتے ہی جس طرح اس کا لہجہ و انداز بدلا تھا وہ شبیب سے چھپا نہ رہ سکا۔

''تم نے اس دن بہت بدتمیزی کی تھی ان کے ساتھ۔'' شبیب کا انداز جتانے والا تھا۔

''وہ شخص تمہیں مجھ سے چھیننے کے پروگرام بنا رہا تھا۔'' اس نے کہنا چاہا لیکن لب بھینچ کر رہ گئی۔

''تمہیں شاید اندازہ نہیں وہ کتنے محبت کرنے والے انسان ہیں۔ بچپن سے لے کر آج تک انہوں نے اس طرح ہمارا خیال رکھا ہے کہ۔۔۔''

''تم لوگوں کا خیال رکھا تھا نا شبیب! احسان کے یہ ٹوکرے انہوں نے میرے سر پہ نہیں رکھے جو ان کی ہر اچھی بری بات کو برداشت کروں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی شبیب کے سامنے اپنے ناگوار جذبات کا اظہار کر بیٹھی تھی۔

''میں سمجھ نہیں پا رہا۔ کیسی لڑکی ہو تم؟'' شبیب الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

''میرا نہیں خیال ان جیسے معصوم اور بے ضرر انسان کی کوئی بات ناقابل برداشت بھی ہو سکتی ہے۔''

''تمہارے لیے ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میرا معاملہ الگ ہے۔ کبڑے میاں نہ پہلے کبھی مجھے بھائے ہیں اور نہ اب انہیں اچھا سمجھنے کے لیے تم مجھے مجبور کر سکتے ہو۔'' وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ شبیب سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔

''یہ کون سا روپ ہے اس لڑکی کا۔'' اسے لگ رہا تھا بیلا دوسری مرتبہ اس گھر میں گھس آئی ہے۔ اپنی تمام تر بے رحمی۔۔۔ اور سفاکی سمیت۔

☆☆☆

''کسی بھی انسان کی معذوری اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ کوئی بھی انسان خود کو بدصورت بنانا پسند نہ کرتا اگر خود کو بنانا اس کے اپنے اختیار میں ہوتا ہم بدصورت لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں معذور لوگوں پر ہنسی آتی ہے، ہم ان پر رحم کھاتے ہیں ہمیں ان پر ترس آتا ہے۔ بس ان سے محبت نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے کہ ہم انہیں تخلیق کرنے والے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

بخت آور! میں بہت خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے تم سے، بیلا سے اور تم جیسے دوسرے بہت سے لوگوں سے۔ معذوری بدصورتی کو جنم دیتی ہے اور بدصورتی نفرت کو۔ میں سوچتا ہوں اگر میں تیمور بھائی کی جگہ ہوتا یا پھر کبڑے میاں کی جگہ تب۔۔۔؟ تب اسی سفاکی سے بیلا مجھے چھوڑ جاتی، اور اسی بے رحمی سے تم اعلان کرتیں کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔

مجھے معاف کر دینا بخت آور! لیکن میں ایسے فرد کو اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتا جو کسی انسان کو محض اس کے ظاہری خدوخال کی بنا پر کمتر یا حقیر سمجھتا ہو، محبت کے آداب و شرائط سے میں واقف نہیں مگر اتنا جانتا ہوں انسان ادھورا ہو یا بدصورت بدوضع ہو یا بدہیئت اس سے محبت ہو یا نہ ہو، اس کا خیال رکھنا

پڑتا ہے خاص طور پر اس وقت جب ہم اس کی محبتوں کے عادی بھی ہوں اور مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا بخت آور کہ تم نے ایک بہت ہی معصوم شخص کا دل دکھایا ہے۔''

کاغذ اس کے ہاتھ سے پھسلا اور لہراتا ہوا صحن کے پکے فرش پہ جا گرا تھا۔ قریب سے گزرتے کبڑے میاں ٹھٹھک کر رکے۔ جھکے اور کاغذ اٹھا کر بڑی احتیاط سے اس کے پاس رکھ گئے تھے۔ بخت آور نے طویل سانس لیتے ہوئے سر اٹھایا۔

''اور شبیب میری محبت سے دستبردار ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ میں نے اس شخص کا دل دکھایا۔''

اسے حیرت ہو رہی تھی بے حد حیرت۔۔۔

''یہ ٹھگنا سا شخص، کھچڑی بالوں والا کبڑا میلی گدلی آنکھیں۔ موٹے سے ہونٹ اور بھدی ناک۔ جس کو دیکھ کر اس نے ہمیشہ سے بے دلی سے منہ پھیر لیا۔ جسے آج تک اس نے قدرت کی ایک بھیانک غلطی سمجھا۔

اور شبیب مجھے چھوڑ گیا۔ محض اس لیے کہ۔۔۔؟''

اس کی بے یقین سی نگاہیں دنوں کبڑے میاں کا طواف کرتی رہیں۔

☆☆☆

''اے بخت آور! تو بولتی کیوں نہیں، کیا ہو گیا ہے تجھے۔ دیکھ تو گھر کیسا بھائیں بھائیں کر رہا ہے؟''

دادی کو جانے کیا ہوا تھا جو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھیں۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھی اپنی سوچوں میں گم بخت آور نے مندی مندی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

''کیا بولوں دادی! کچھ نہیں ہے میرے پاس بولنے کے لیے۔''

''اور یہ خط کس کا ہے۔ کئی دنوں سے مٹھی میں دبائے پھر رہی ہو۔'' دادی نے اس کی گود سے جھانکتا نیلے رنگ کا لفافہ دیکھ لیا تھا۔

''شبیب نے اسلام آباد سے بھجوایا تھا میرے نام۔ پہلا اور آخری خط۔'' وہ پھیکی سی بے رنگ مسکراہٹ چہرے پہ سجائے انہیں بتا رہی تھی۔

''آئے۔۔ ہائے تمہارے نام کیوں؟ اپنی اماں اور بھائیوں کو لکھتا، تمہارے سے بھلا کیا تعلق اس کا۔''

''ہاں! مجھ سے بھلا کیا تعلق اس کا اگر کوئی تھا بھی تو اب کہاں رہا، سب کچھ ختم۔ آنکھوں سے خواب ختم اور دل سے خواہشات۔ اندر جیسے ہر طرف ریت اڑ رہی ہے۔ دادی! خالی ڈھنڈار قبرستان نہ بین کی آواز آتی ہے نہ سسکیاں خاموشی کا گلا گھونٹتی ہیں۔ ایسی جامد چپ ہے دادی جو ٹوٹنے میں ہی نہیں آ رہی۔ بس خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ ایک پھندا سا پڑا ہے گلے میں سانس لینا بھی مشکل۔۔۔''

وہ جیسے بڑی اذیت میں اپنا گلا مسل رہی تھی۔

دادی نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''کیا بول رہی تھی بختے۔۔۔!''

''کچھ نہیں دادی کچھ بھی نہیں۔'' اس نے مردہ سے لہجے میں انہیں دلاسا دینا چاہا۔

"نہ ڈرا مجھے۔ تیرے سوا ہے ہی کون؟ ہنستی کھیلتی رہا کر، میرے دل کو تسلی ہوتی ہے کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کہہ، مجھے بتا۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے کہہ رہی تھیں۔ چہرے پر ہزار پریشانیاں، آنکھوں میں ہزار وسوسے۔ بخت آور کو ان پر ترس آنے لگا۔

"بس اتنا سا دل ہے دادی۔۔۔ میں تو بس آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ کوئی پریشانی کوئی تکلیف نہیں بے فکر رہیں۔۔۔" نرمی سے ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے اس نے اپنا سر دادی کے سینے پہ رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

"چلنے میں دقت تو ہوتی ہوگی تیمور بھائی۔" شبیب اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں شروع شروع میں مشکل تو ہوگی۔۔۔ میں خود بھی ابھی تک۔۔۔"

بخت آور نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ پوری توجہ سے تیمور بھائی کی بات سن رہا تھا۔

"نظر ملانے کی ہمت نہیں یا اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ۔۔۔"

چائے میز پہ رکھتے ہوئے ذرا سی چھلک گئی تھی۔ تیمور حسن نے بات ادھوری چھوڑ کر تعجب سے اسے دیکھا۔ اپنے ہی خیالوں میں گم وہ چائے رکھ کر واپس پلٹ گئی تھی۔

شبیب کرسی کے ہتھے پر نجانے کیا کھرچ رہا تھا۔

"معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو۔۔۔ ہر وقت یونہی کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔۔۔ نہ پہلے کی طرح بولتی ہے نہ ہنستی ہے۔۔۔ حالانکہ اب تو عادت سی ہو گئی تھی بستر پہ پڑا اس کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتا رہتا تھا۔ رونق سی لگی رہتی تھی اس کی بدولت۔۔۔ لیکن اب کچھ۔۔۔"

"امی بتا رہی تھیں آپ اور علی رضا دوبارہ سے اپنے بزنس پہ کام شروع کر رہے ہیں۔" شبیب نے گویا کسی بہت ہی غیر اہم بات کو کاٹ کر کہا تو تیمور ایک لمحے کے لیے خاموش سے رہ گئے۔

"ہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے اب۔" وہ اسے تفصیلات بتانے لگے جسے سنتے ہوئے شبیب ذہنی طور پر غیر حاضر ہی رہا تھا۔ ایک عجیب وحشت سی اس کا گھیراؤ کرنے لگی تھی۔

"شاید ابھی کچھ عرصے تک مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" اسے شدت سے احساس ہوا۔ میں اس لڑکی سے نفرت نہیں کرتا لیکن اس سے محبت کرنا بھی اب میرے بس میں نہیں رہا۔"

بخت آور کسی کام سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ شبیب تیمور حسن سے معذرت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو اب یوں بھاگنے لگے ہو مجھ سے شبیب حسن!" استری شدہ کپڑے الماری میں رکھ کر اس کھلے پٹ کی اوٹ میں اس نے خوب اچھی طرح اپنی آنکھیں مسلیں۔

"بخت آور!" تیمور بھائی کے پکارنے پر وہ پلٹی۔

"روزہ کب افطار کر رہی ہو۔۔۔؟" وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

"روزہ۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ چپ کا روزہ۔۔۔ بہت دنوں سے رکھا ہوا ہے نا۔۔۔؟" وہ نرم مسکراہٹ چہرے پہ سجائے پوچھ رہے تھے۔

بخت آور انہیں کوئی جواب نہ دے پائی تھی۔ یونہی افسردگی سے سر جھٹک کر باہر آ گئی تھی۔ دادی باورچی خانے میں تائی حسنہ کے ساتھ کھانا بنوا رہی تھیں وہ سست روی سے چلتی وہیں آ گئی۔

"دادی! آپ سے کچھ بات کہنی ہے۔۔۔" وہ دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھی۔

"ہاں بول۔۔۔" لہسن پیاز میں الجھی دادی اس کے مدھم لہجے کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئی تھیں۔

"دادی! مجھے آپ کی۔۔۔ آپ کی ہر بات قبول ہے۔"

"ہائیں۔۔۔ کس بات کا کہہ رہی ہے۔۔۔ کون سی بات؟"

دادی نے جلتی ہانڈی پر پانی کا چھینٹا دیا۔۔۔ تائی حسنہ البتہ چونک گئی تھیں۔

وہ بغیر کوئی جواب دیے ہونٹ کاٹتی رہی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر آئیں۔ تائی حسنہ بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

"بخت آور! تیمور۔۔۔ تیمور کے لیے کہہ رہی ہو نا۔۔۔؟" تائی حسنہ نجانے کیسے اتنی جلدی بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھیں۔

بخت آور نے بمشکل اثبات میں سر ہلا دیا۔

دادی ہنڈیا بھول کر ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

"دیکھ بخت آور۔۔۔ کوئی زور زبردستی نہیں۔۔۔ تیری اپنی مرضی ہے۔۔۔ کل کلاں جو مجھے طعنے دیتی رہی کہ۔۔۔" دادی ہکلا سی گئیں۔

"نہیں دوں گی کوئی الزام، کوئی طعنہ نہیں دوں گی۔۔۔ سب میری مرضی ہے۔۔۔ ہر فیصلہ میرا اپنا ہے۔۔۔ صرف میرا اپنا۔۔۔" آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے تو لب بھینچتی، سسکیاں روکتی وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کافی سے زیادہ بیت گئی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ مہندی اور ابٹن کی خوشبو میں بسی بخت آور چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔

دادی نے کروٹ بدلی کھنکھار کر آواز لگائی۔ "کون ہے اس وقت۔"

"میں ہوں بی اماں! ایک بات کہنی تھی۔۔۔" کبڑے میاں کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

کبڑے میاں دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے تھے، دروازہ کھلنے کی آواز پر ذرا سا چونکے، گردن موڑ کر دیکھا کمرے میں پھیلے گھپ اندھیرے میں ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"مبارک ہو بی اماں! اللہ نے بٹیا کا گھر بسایا ہے۔"

وہ بہت مسرور لگ رہے تھے۔ بخت آور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"بخت آور سو گئی ہے کیا۔۔۔؟ اصل میں بی اماں۔۔۔ میں اس کے لیے کچھ چیزیں لایا تھا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بہت بے صبری سے بولے تھے۔

"خبر نہیں اسے پسند آئیں یا نہ آئیں۔۔۔ وہ تو مجھے بھی پسند نہیں کرتی۔۔۔ کچھ بعید نہیں یہ سب زیور گہنے اٹھا کر میرے منہ پہ دے مارے۔۔۔" وہ بے ہنگم طریقے سے ہنسے۔

"پر ہم بھی کیا کریں بی اماں! بڑے بدنصیب لوگ ہیں۔۔۔ دل میں قبرستان بنائے بیٹھے ہیں۔ ہر روز کیا کیا دفن نہیں کرتے، شکوہ نہیں۔۔۔ بس دل میں حسرت سی اٹھتی ہے۔۔ کاش ہماری بھی کوئی بیٹی

ہوتی۔۔۔ایسے ہی نازنخروں والی، ہم سے محبت کرتی۔۔۔دیکھتی کہ یہ بوجھ جو ہم اپنی کمر پہ لادے پھرتے ہیں، اس کے نیچے ایک دھڑکتا ہوا دل بھی ہے۔ وہ دیکھتی کہ اس دل میں کتنا پیار ہے، محبت ہے، چاہ ہے، کوئی کھوٹ، کوئی غصہ کوئی نفرت نہیں۔۔۔لیکن لیکن۔۔۔"

ان کی بھدی سی ہنسی رات کی شفاف چادر پر کئی شکنیں سی ڈال گئی تھی۔ بخت آور نے بے دردی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔

"لیکن ہمیں بخت آور بیٹا سے بھی کوئی شکایت نہیں، بھلے وہ مجھ سے نفرت کرے بھلے میرے وجود سے گھن کھائے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس مجھ سے محبت کرنے کا حق نہ چھینے۔ یہ دیکھیے ذرا۔ بڑے چاؤ سے لایا ہوں۔ ساری عمر کا جمع جتھا لگایا ہے مگر پھر بھی کچھ بن نہیں پایا۔" وہ گود میں رکھی پوٹلی کھول رہے تھے۔

"معافی تلافی کے لفظ۔۔۔ پچھتاوے کے آنسو۔۔۔ کیا نچھاور کروں آپ پر کبڑے میاں۔۔۔!"

وہ تھک کر وہیں دہلیز پہ بیٹھ گئی۔

"اتنے بدصورت وجود میں ایسا خوبصورت دل کس نے رکھ دیا، شبیب نے تو کہا تھا۔۔۔ "بدصورتی گناہ نہیں لیکن بدصورت رویہ بدترین گناہ ہے۔" پھر آپ نے یہ گناہ کس طرح معاف کر دیا۔" ملگجی سی چاندنی میں اس کی نظر ریشمی کپڑوں پر پڑے چاندی کے دمکتے زیورات سے الجھ رہی تھی۔

بیلا نے تیمور حسن کو ٹھکرایا کیونکہ وہ معذور تھا تیمور حسن نے اسے معاف کر دیا ہم سب نے نہیں کیا۔ میں نے کبڑے میاں سے نفرت کی مگر وہ سب کچھ بھول گئے وہ سب جو میں نے ان سے کہا اور جو ان کے ساتھ کیا۔ لیکن شبیب نہیں بھولا۔

تو پھر بدصورت کون ہوا؟

"شبیب حسن! اگر تمہاری طرح میں بھی حساب کتاب کرنے بیٹھوں تو پوچھوں کہ دوسروں کے حصے کی سزا دینے والے تم کون ہوتے ہو۔ میں نے ایک معصوم انسان کا دل دکھایا تو کیا تم نے کسی کا دل نہیں توڑا؟ اس طرح تو میرا اور تمہارا گناہ ایک جیسا ہوا نا، تم نے خود کو برتر سمجھا اور مجھے ٹھکرا دیا۔۔۔ دوسروں کا خیال کس طرح رکھا جاتا ہے، درحقیقت یہ تمہیں بھی نہیں معلوم، محبت سکھانے کے لیے محبت سے ہاتھ کھینچ لینا اس سے دستبردار ہو جانا مناسب نہیں ہوتا۔ محبت سکھانے کے لیے محبت کو فروغ دیا جاتا ہے معاف کیا جاتا ہے۔ بھول جانا پڑتا ہے، دوسروں کی غلطیوں کو، کوتاہیوں کو۔۔۔ اور یہ میں نے کبڑے میاں سے سیکھا ہے یا پھر تیمور حسن سے جسے میں نے اپنی خواہش پر نہیں چنا۔ لیکن جو میری تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے، بظاہر ادھورا۔۔۔ لیکن مکمل انسان اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دم سے چراغ روشن ہیں، آنکھوں میں، دلوں میں اور اس پوری کائنات میں۔"

اس نے کنگن کلائیوں میں ڈال کر پازیب اور کپڑے اٹھا لیے تھے۔۔۔ اسے یقین تھا اگلی صبح اس کی کلائیوں میں سجے کنگن اور پیروں میں پڑی پازیب دیکھ کر کبڑے میاں سے بڑھ کر اور کوئی خوش نہیں ہوگا۔ چاندی کی پازیب کو بہت احتیاط سے پاؤں میں ڈالتے ہوئے وہ خود کو میلے میں آئی ایک ایسی بچی تصور کر رہی تھی۔۔۔ جس نے پہلی دفعہ لوگوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ابھی ابھی زندگی کو جاننے کا آغاز کیا تھا۔

میرے گمشدہ

اور چڑیا کا تیسرا بچہ بھی مر گیا۔

دھپ کی موہوم سی آواز کے ساتھ چڑیا کا بے بال و پر بچہ آنگن کی جلتی بلتی زمین پر گرا اور ایک دو جھٹکوں میں ہی اس کا بوٹی سا وجود ساکت ہو گیا۔ باورچی خانے سے باہر نکلتے کاکا جان کی نگاہ اس پر پڑی تو چائے سے بھری پیالی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ اندھا دھند اس طرف کو بھاگے۔ چڑیا کے بچے کی چونچ ہولے سے تھرتھرائی تھی۔ کاکا جان نے اپنے ہاتھ کی سخت پوروں میں اس دم توڑتے وجود کو نرمی سے تھاما اور حوض کی طرف لپکے، مگر چڑیا کا وہ گلابی سا بچہ پانی کی ایک بوند حلق سے نیچے اتارے بغیر ہی مر گیا۔ کاکا جان کی ہتھیلی پر پڑے اس مردہ بچے نے ان کے جسم کی ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔ اس کی بند آنکھوں میں اترتی سیاہی مائل نیلاہٹ اور ننھی چونچ سے جھانکتی سرخی کاکا جان کا دل نوچ کر لے گئی تھی۔ ان کا ہاتھ ایک دم مفلوج ہو کر ان کے پہلو میں گر گیا تھا۔ چڑیا کا بچہ حوض کے کنارے گرا اور کاکا جان پھوٹ پھوٹ کر کسی ننھے بچے کی طرح رو دیے تھے۔

"چڑیا کا تیسرا بچہ بھی۔۔۔" کیاریوں سے خشک پتے نکالتی ماورا اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔

روتی کرلاتی چڑیا بے قراری سے کاکا جان کے سر کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔

اس کی معصوم چوں۔۔۔ چوں سے چھلکتا درد، بے بسی۔ ماورا کا دل بے پناہ اداسی میں گھر گیا۔

"بے چاری چڑیا۔۔۔!" وہ تاسف سے کاکا جان اور چڑیا کو دیکھتی رہی۔

دونوں کا دکھ ایک ہی تھا۔

کاکا جان کی سسکیاں اور چڑیا کی کرلاہٹیں۔

ماورا وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر گھاس نوچنے لگی۔ اسے کاکا جان کی طرح رونا نہیں آتا تھا، مگر اس کا دل کسی بھاری سِل کے نیچے دبا تڑپ رہا تھا۔

گزشتہ کئی روز سے کاکا جان کی ہر سرگرمی کا مرکز ایک یہ گھونسلہ ہی تو تھا۔ جس روز چڑیا اپنی چونچ

میں پہلا تنکا لے کر اُڑی کاکا جان کے چہرے پہ چھائی مسرت قابل دید تھی۔
''گھونسلہ بننے جا رہا ہے بٹو! آؤ دعا کریں۔ اللہ اس ننھی چڑیا کی محنت ٹھکانے لگا دے۔ اس ننھے آشیانے کو آندھی و بارش سے بچائے۔''

اور اس نے بھی مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور پھر کچھ روز بعد جب درختوں کی برہنہ شاخوں پر سبز کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور فضا میں سبز گھاس کی تازہ خوشبو ہلکورے لے رہی تھی۔ ''چوں چوں'' کی دلفریب آوازوں سے سارا گھر بھر گیا تھا۔ گھونسلے سے اٹھتی معصوم اور نوخیز آوازوں کو سن کر کاکا جان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

''کئی دنوں کی تپسیا رنگ لے ہی آئی۔''

''بند پرنالے کا سارا رخ زمین کی طرف ہے۔ اگر بچے گر گئے تو۔۔۔'' وہ اپنا خدشہ زبان پر نہ لائی تھی، مگر وہی ہوا تھا۔ پہلے دو بچوں کے بعد آج تیسرا بچہ بھی تپتی زمین پہ گر کر مر گیا تھا۔

ماورا نے ایک طویل سانس لے کر سر اٹھایا۔ کاکا جان اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور درد کی ماری چڑیا ہانپتی کانپتی کسی شاخ تلے جا چھپی تھی۔

''اتنا چھوٹا سا وجود اور اتنا ڈھیر سا درد۔۔۔ کیسے سہہ پائے گی ننھی چڑیا۔'' درخت کی شاخوں سے سرخی مائل زرد دھوپ براہ راست اس کے وجود پر پڑنے لگی تو وہ بجھے دل کے ساتھ اٹھ کر خود کاکا جان کے بند کمرے کے دروازے کو تکتی برآمدے کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی۔

دھوپ ڈھل رہی تھی۔

''آج کی یہ شام کتنی اداس ہوگئی۔'' ہوا میں ہلکی سی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ستون سے سر ٹکا دیا۔

درختوں کے لمبے ہوتے سائے اس کے دل میں وحشت جگا گئے۔

ہر طرف چپ اور ویرانی۔

''کاکا جان بھی کیسی کیسی باتوں کو دل پہ لے لیتے ہیں، اب اگر یہ چڑیا کے بچے کا معاملہ نہ ہوتا تو چائے کی ایک پیالی کے ساتھ ان کا لکھا ہوا کوئی کالم ہی سن رہی ہوتی۔ اچھا یا برا۔ کوئی آواز تو کانوں میں پڑتی۔''

وہ بیزار سی ہو کر ابا کے کمرے میں آئی۔ وہ ابھی تک دوا کے زیر اثر سو رہے تھے۔ تب ہی کسی نے لکڑی کا دروازہ زور سے بجایا۔ وہ الٹے قدموں واپس آ گئی۔ دروازے کے باہر سلیم کے سائیکل کی گھنٹی بار بار بجتی سنائی دی تو اس نے بے دھڑک دروازے کی کنڈی گرا دی۔ پچھلے ایک ہفتے کے اخباروں کا بنڈل بغل میں دبائے دھوپ کی شدت سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ سلیم نے ایک مختصر سی نگاہ اس پر ڈالی اور سلام کرتے ہوئے سیدھا کاکا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ باورچی خانے میں آ کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔ سلیم کو دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ آج ہفتے کا دن ہے ورنہ دنوں، مہینوں اور تاریخوں کا حساب کتاب رکھنا، اس گھر کے مکین عرصہ ہوا بھول چکے تھے۔

سلیم ہفتے بھر کے اخبار نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ صرف کاکا جان کے لیے اور اب اسے رات گئے تک ان کے پاس بیٹھنا تھا۔ دنیا بھر کی خبروں پر تبصرہ سننے کے لیے، کاکا جان کے خیالات

اور آراء سے مستفید ہونے کے لیے۔

''پتا نہیں سلیم کو کاکا جان سے اتنا عشق کیوں ہے؟''

کمرے کے دروازے پہ ہوتی دستک کو سنتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد سلیم کی سنجیدہ سی شکل باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

''کاکا دروازہ نہیں کھول رہے۔۔۔'' وہ الجھا ہوا تھا۔ ماورا نے لمحہ بھر کے لیے اس کی بات سنی۔

''اگر سلیم کے آنے پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو گویا اب صبح تک کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ پھر یہ چائے کا تکلف۔۔۔؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر چولہا بند کر دیا۔

''جب کبھی دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ یہ دروازہ پہروں بند رہتا ہے۔ اب خدا جانے کمرے میں بیٹھے کب تک اپنے غموں کو روتے رہیں گے۔ سنا تھا وقت بہت سے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ مگر یہاں تو خزاں بھی رلاتی ہے اور بہار بھی، کوئی گھونسلہ بکھر جائے تو اداسی جوبن پر۔

پھول مرجھائیں تو غم کا انت۔۔۔ چڑیا کا بچہ مر جائے تو ماتم شروع۔ ڈار سے کونج بچھڑے تو واویلا، کوئی کہاں تک بہلائے ان کو۔ دیکھتے بھالتے بھی کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے کہ۔۔۔'' اپنے خیالات میں الجھتے اس نے سر اٹھایا۔

سلیم اس کی خاموشی سے تنگ آ کر جانے کب کا جا چکا تھا۔

☆☆☆

خشک دودھ کا ڈبا خالی تھا۔ اس نے مایوس ہو کر ڈبا واپس رکھا اور باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔

ڈھلتی شام میں چائے پینے کو کتنا دل چاہا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔

''آہ یہ مفلسی۔۔۔ دال روٹی ہی چلتی رہے تو بڑی بات۔ وقت بے وقت ایسی عیاشی ہم لوگوں کو نصیب کہاں؟''

وہ چپ چاپ ابا کے کمرے میں آئی۔۔۔ اور بیٹھ کر کرسی جھلانے لگی۔

کاکا جان نے ابا کو کوئی کتاب پڑھ کر سناتے سناتے ہوئے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ کھڑکی سے باہر کسی بے رنگ منظر پہ نگاہ جمائے وہ بہت بے زار سی لگی تھی انہیں۔

''کیوں بھئی۔۔۔ وہ چائے پلانے کا ارادہ کیا ہوا بٹو۔۔۔؟'' کتاب کے درمیان میں انگلی رکھے اسے عارضی طور پر بند کرتے ہوئے وہ اس کی طرف پلٹے۔

''دودھ ختم ہو چکا کاکا۔۔۔''

''وہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے نادان۔۔۔ میں اتنے روز سے قہوے پر ہی تو جی رہا ہوں'' انہوں نے ہنسی میں بات اڑانی چاہی مگر وہ مروتاً بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکی۔

''لیکن مجھے قہوہ اچھا نہیں لگتا۔''

اس کی بات پر کاکا جان لمحہ بھر کے لیے چپ سے ہو گئے۔

''کوئی شربت ہی بنا لو۔۔۔'' گھڑی بھر بعد انہوں نے متبادل پیش کیا۔

''کون سا بناؤں؟ بادام کا۔۔۔؟ انار کا۔۔۔؟ یا مالٹوں کا۔۔۔؟'' معلوم نہیں اس نے شرارت کی تھی یا طنز۔۔۔ کاکا جان پھیکی سی ہنسی ہنس دیے تھے۔

اگلے روز جب وہ جھاڑ پونچھ کر ان کے سب اخباروں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی انہوں نے آواز دے کر بلا لیا۔ اپنے آس پاس بے شمار صفحات پھیلائے، اپنے ضروری اور غیر ضروری کاغذات الگ کرتے ہوئے انہوں نے عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے گھورا۔

''یہ سارا دن کن کاموں میں الجھی رہتی ہو تم جب کہ کرنے کے سب کام جوں کے توں پڑے ہیں۔'' انہوں نے کاغذوں کا ایک پلندا نکال کر اس کے سامنے میز پر پٹخا۔

''کئی روز قبل تم سے یہ کالم عبداللہ ظفر کی میز تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ اب یہ اتفاقاً میرے سامنے نہ آجاتا تو یونہی کاغذوں کے ڈھیر میں خدا جانے کب تک دفن رہتا۔''

''وقت کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ ڈالی اور پھر دیوار پہ لگے کلاک کو دیکھا۔ دونوں کی سوئیاں رکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کلائی سے گھڑی اتار کر میز پہ دھیرے سے ٹھونکی اور پھر اس کی سوئیاں گھمانے لگے۔

''بہرحال۔۔۔ ابھی بیٹھا ہو گا وہ دفتر میں۔ تم یہ کالم لے جاؤ۔'' ان کی پوری توجہ اپنی گھڑی کی جانب تھی۔ وہ چند لمحے کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ تب انہوں نے نگاہ اٹھا کر اس کی ہچکچاہٹ کو جانچا۔

''کبھی کبھار باہر کی فضا میں بھی سانس لے لینا چاہیے۔ کوئی حرج نہیں ہوتا۔''

''آپ خود چلے جاتے۔'' اس نے ایک بار پھر جان بچانا چاہی۔

''بھائی جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ میرا گھر پہ ٹھہرنا ہی مناسب ہے اور یوں بھی مجھے ڈر لگتا ہے بٹو! کہیں تم اس گھر کی تنہائی کا نوالہ ہی نہ بن جاؤ۔ صبح و شام ان درختوں میں گھومتے پھرتے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری جڑیں زمین کے اندر تک اتر جائیں اور پرندے تمہاری شاخوں پر گھونسلہ بنانے لگیں۔''

ان کا لہجہ ڈرا ہوا تھا اور آنکھیں پرنم۔۔۔ وہ اپنے ناخن سے میز کی سطح کھرچنے لگی۔

''کبھی تمہیں اداس اور خاموش دیکھوں تو۔۔۔''

''آپ میری بہت فکر کرتے ہیں کاکا۔۔۔'' انہیں جذباتی ہوتے دیکھ کر اس نے بات کاٹ دی۔

''بھائی جان کے بعد میرے لیے صرف تم ہی تو ہو۔۔۔ تمہیں دیکھ کر اپنے سو غم بھولتا ہوں بٹو! تم کیا جانو تم میرے لیے کیا ہو؟'' ان کی آواز مدھم پڑ گئی۔ وہ کاغذوں کا پلندا اٹھا کر باہر نکل آئی۔

آسمان گدلا سا ہو رہا تھا اور فضا میں ہر طرف گرد اڑ رہی تھی۔

''گھر سے نکلتے ہی آندھی آ گئی تو۔۔۔؟'' تیز ہوا سے درختوں کے پتوں کو شور کرتے دیکھ کر اس نے سوچا۔ مگر ہوا کی خوشگواریت گھر سے نکلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ سو وہ بڑے اطمینان سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ بس کے تکلیف دہ سفر اور پھر بے شمار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ اخبار کے دفتر میں پہنچی تو یہاں کے گھٹن زدہ ماحول نے اسے مزید کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر میز پہ دو چار لوگ سر جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ چند ایک چلا چلا کر دفتر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی آواز پہنچا رہے تھے۔ ایک نوعمر لڑکا میز کے نیچے گھس گھس کر چائے کے خالی کپ نکال رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اور کاغذات کے انبار کی ناگوار سی مہک۔

کاکا جان کہا کرتے تھے۔۔۔ کسی زمانے میں یہ اخبار ملک کے نمبر ایک اخباروں میں شامل ہوتا تھا۔ ہاں ہوتا ہو گا۔۔۔ مگر وہ تو جب سے دیکھ رہی تھی تب سے ایسا ہی تھا۔ معلوم نہیں اس ادارے کے

لوگوں کے علاوہ بھی کوئی اسے پڑھتا تھا کہ نہیں۔ اس کی آمد کا جائزہ خاصے ناقدانہ انداز میں لیا گیا تھا۔ وہ سیدھی عبداللہ ظفر کے کیبن میں گھس گئی۔ اپنے کسی ملازم پر خوب ہی برس کر ہانپتے ہوئے انہوں نے یہاں وہاں میز پہ ہاتھ مارتے ہوئے اپنی عینک ڈھونڈ کر ناک پہ ٹکائی اور اس کا بغور جائزہ لینے لگے۔ اس نے اپنا تعارف کرائے بغیر کالم ان کے سامنے رکھ دیا۔ ایک سرسری نگاہ ڈال کر انہوں نے بس کالم نگار کا نام پڑھا اور پھر ان کاغذات کو میز کی سب سے نچلی دراز میں ڈال دیا۔

''نوشیرواں ہم سے پردہ کرنے لگا ہے کیا؟'' وہ اب پرسکون تھے۔ مادرا کو اس بات کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا تو چپ بیٹھی رہی۔

''اس سے کہنا، اب بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ لوگوں کو سقوطِ ڈھاکہ میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ لکھنا ہے تو سقوطِ بغداد پہ لکھے، فلسطین کے، کشمیر کے مسائل پہ لکھے۔ جو بیت گیا سو بیت گیا۔ لوگ اسے پڑھنا چاہتے ہیں جو ہو رہا ہے۔ آج کے دکھوں پر ماتم کرے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے نوحے میں اب کوئی دم خم نہیں رہا۔ عرصہ ہوا یہ آگ سرد ہو چکی۔ اب تو نئے آتش فشاں نگاہوں کے سامنے ہیں۔''

وہ اپنے بے لچک انداز میں بول رہے تھے۔ مادرا انہیں شک بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

''کیا واقعی ایسا ہی ہے۔ جیسا یہ کہہ رہے ہیں؟''

''نوشیرواں صاحب کو ہمارا بہت سلام کہنا اور ہماری طرف سے یہ انہیں دے دینا۔''

عبداللہ ظفر نے قدرے ترچھا ہو کر غالباً اس سے چھپاتے ہوئے اپنے بٹوے میں سے کچھ رقم نکالی۔ میز کی دو چار درازیں کھنگالنے کے بعد انہیں مطلوبہ چیز نہ ملی تو میز کی بالائی سطح پر ہلا بول دیا۔ کچھ کاغذات اِدھر اُدھر گرے۔ پانی کا گلاس چھلکا۔۔۔ پیپر ویٹ لڑھک کر میز کے نیچے جا چھپا تب انہیں ایک لفافہ ملا جس میں وہ رقم ڈال کر انہوں نے مادرا کے سپرد کی تو اس کے چہرے پہ ہلکی سی سرخی چھا گئی۔

''کالم لگ جاتا تو پھر۔۔۔''

''سنو لڑکی! نوشیرواں نے تمہیں کالم دیا تم نے مجھ تک پہنچا دیا۔ میں تمہیں یہ رقم دے رہا ہوں۔ تم اسے نوشیرواں تک پہنچا دینا اب بتاؤ۔ اس معاملے میں اس سے زیادہ کوئی تعلق ہے تمہارا؟''

وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

ان کی بات درست تھی۔ لیکن انداز۔۔۔ وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

عبداللہ ظفر قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ پھر اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

''اس دفتر کا ماحول اتنا شائستہ اور مہذب بھی نہیں کہ میں اپنی بیٹی کو چائے پلاؤں اور اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کروں۔ اس کام کے لیے میں کسی روز تمہارے گھر آؤں گا۔ تاہم اتنا بتا دوں کہ یہ واقعی میرا اور تمہارے چچا کا معاملہ ہے۔ تم خواہ مخواہ اس کے بیچ ٹانگ مت اڑاؤ۔ سمجھیں؟'' انہوں نے شفقت سے اس کا سر ہلایا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر انہیں سلام کرتی باہر آ گئی۔

''نوشیرواں سے کہہ دینا، باری آنے پر کالم لگ جائے گا۔'' انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سر جھٹک کر مسکرا دی۔ جانتی تھی اور بہت سے کالموں کی طرح اس کالم کی باری بھی شاید کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے ہاتھ میں روپے تھے۔ اور وہ مزید کچھ سوچ کر بدل نہیں ہونا چاہتی تھی اس لیے سیدھی بازار چلی آئی۔

موسم کے تیور بدلے بدلے سے تھے، لیکن پھر بھی وہ ان لمحات سے بہت لطف اندوز ہوئی۔ دکانوں کے شوکیس میں سجی چیزوں کو دیکھتے ہوئے بہت سا وقت بیت گیا۔ تب اس نے تھکن محسوس کرتے ہوئے واپسی کی ٹھانی۔ گھر آ گئی تو خشک دودھ کے بڑے پیکٹ کے ساتھ دال، چاول اور سلاد کے لیے کچھ سبزیاں لائی تھی۔ بقیہ پیسے کاکا جان کی دراز میں ڈال کر وہ کچن میں چلی آئی۔ رات کو اچار اور سلاد کے ساتھ دال چاول کھاتے ہوئے وہ خوشگوار موڈ میں چہک رہی تھی۔ کاکا جان اور ابا اس کی باتیں سن کر مسکراتے رہے۔

☆☆☆

''بھئی سلیم! تم جو ہر وقت اپنی یونیورسٹی میں دندناتے پھرتے ہو تو کیا ہماری ماورا کا داخلہ نہیں کروا سکتے وہاں؟'' کاکا جان کی بات سن کر حوض کے کائی زدہ پانی سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں لکڑی کی بوسیدہ کرسیاں گھاس پہ ڈالے بیٹھے تھے اور بے رنگ میز کاکا جان کے ادھورے مسودوں اور ردی سے لائے گئے اخباروں سے بھرا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور آم کے کچے بور سے مہکتی فضا بیری کے انتہائی گھنے اور طویل قامت درخت سے سرخ پکے ہوئے بیر ٹپاٹپ زمین پہ گر رہے تھے۔ جنہیں چن کر وہ دھونے کے لیے ذرا دیر کو یہاں رکی تھی کہ کاکا جان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

سلیم ان کی بات سن کر ذرا سا چونکا۔ ایک نظر انہیں اور حیران ہوتی ماورا کو دیکھنے کے بعد وہ ان کے قلم کھول کر بغور جائزہ لینے لگا۔

''داخلہ تو ہو سکتا ہے کاکا! اگر آپ چاہیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھا اور ان کا قلم دھونے چل دیا۔

ماورا، کاکا جان کی دماغی حالت پہ شبہ کرتی ان کے قریب چلی آئی۔

''ابھی کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

کاکا جان بغیر جواب دیے اخبار کھنگالنے لگے تھے۔

''گھر کیسے چلے گا۔۔۔؟ ابا جان۔۔۔ ان کی دیکھ بھال، کھانا پکانا۔۔۔؟''

''پہلے سارا کچھ تم ہی کرتی ہو؟'' انہوں نے اخبار تہہ کر کے رکھا اور بیروں کی ٹوکری اپنی طرف کھسکا لی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ بھی بہت مدد کرواتے ہیں لیکن۔۔۔''

''گونگی بوا سے کہہ دوں گا آ جایا کرے گی۔'' ان کا اطمینان ماورا کو کسی طور ہضم نہ ہو رہا تھا۔

(تو کیا یہ سوچ سمجھ کر طے کیے بیٹھے ہیں کہ) وہ کچھ لمحوں کے لیے خود سے الجھی، اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کاکا جان ذرا سا مسکرائے۔

''گھر کی فکر کیوں کرتی ہو؟ میں یہیں تو ہوتا ہوں سارا دن۔ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کچھ اور پریشانی ہو تو کہو؟''

سلیم قلم دھو کر نیا نکور کر لانے کے بعد اب اس میں روشنائی بھر رہا تھا۔

''کتابیں، فیسیں، کپڑے، روز آنے جانے کا کرایہ۔۔۔'' اس نے بہت سوچ سمجھ کر مسئلہ اٹھایا۔

''کتابیں خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے، لائبریریاں بھری ہوئی ہیں کتابوں سے۔ کپڑوں کے ایک دو جوڑے بھی بہت، کوئی فیشن شو میں تھوڑی جانا ہے۔ آنا جانا لوکل بس پہ۔۔۔ باقی رہ گئی فیس، تو دو سال کے لیے کہیں نوکر دو کر ہو جاتے ہیں۔ کر لیں گے کچھ روز محنت، مزدوری۔'' وہ مزے سے بیر کھا کر گٹھلیاں پھینک رہے تھے۔

''اب یہ کام کریں گے آپ۔'' اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا تو وہ جاندار سی ہنسی ہنس دیے۔

''ارے بھئی میں کون سا سچ مچ کرنے جا رہا ہوں۔ اب اتنا دم خم کہاں۔ ہاں وہ کرامت علی ایک عرصے سے پیچھے پڑا ہے۔ ایک، دو ناول لکھ دیتا ہوں اس کو۔۔۔ نام اس کا، دام ہمارے۔''

وہ جل بھن گئی تھی ان کے ارادوں پر۔

''وہی ناول جو اپنی پونجی سے شائع کرانے کی حسرت ایک عرصے سے دل میں لیے بیٹھے ہیں آپ، آخر ایسی کون سی آفت، قیامت آ گئی ہے جو مجھے یونیورسٹی بھجوانے پر تلے ہیں آپ۔۔۔ اور ابا جان بھی کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ خود میرا دل نہیں چاہتا پڑھنے کو۔ بس بی۔اے بہت ہے۔'' اس نے حتمی فیصلہ سنایا۔

''تمہارے لیے بہت ہو گا بی۔اے، ہمارے لیے نہیں ہے۔'' ان کا اطمینان برقرار تھا۔

''تو پھر آپ ہی جائیے یونیورسٹی۔ میرا کوئی ارادہ ہے نہ شوق۔'' وہ بدتمیزی سے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جائیں گی تو بڑو آپ ہی۔'' وہ اس کے پیچھے چالاک سی ہنسی ہنسے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتی ماورا کو غصہ آیا تو دل میں ان کی بات نہ ماننے کا پکا فیصلہ کر لیا۔ مگر وہ کاکا جان ہی کیا جو دوسرے کو اس کے ارادوں پر کاربند رہنے دیں۔

دو تین روز تک قلم ہاتھ میں لیے وہ سفید کاغذوں کو سیاہ کرتے رہے۔ کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ بہت ہوتا تو اٹھ کر اپنے لیے کالی بھجنگ چائے بنائی یا غائب دماغی سے دو چار لقمے لے کر برتن کھسکا دیے۔ ماورا سے بھی سیدھے منہ بات نہ کی، سلیم آیا تو اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔۔۔ وہ مکمل یکسوئی چاہتے تھے۔

ماورا نے تنگ آ کر ابا سے شکایت کی۔

وہ فالج کے مریض۔۔۔ بولنے سے قاصر۔

اس کے شکوے سن کر دھیرے دھیرے مسکراتے رہے۔ کاکا جان کی جاں نثاری پر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''وہ جو کر رہا ہے، اسے کرنے دو۔ ورنہ مان ٹوٹ جائے گا۔'' انہوں نے اشاروں سے سمجھایا تو اس نے بھی چپ سادھ لی۔

چوتھے روز اس نے سلیم کو کاغذات کا پلندا لے جاتے دیکھا تو رہ نہ سکی۔ یونہی رنجیدہ سی ہو کر کاکا جان کے پاس چلی آئی۔

''آپ اچھا نہیں کر رہے کاکا!''

وہ تھکن زدہ سے پاؤں پسارے لیٹے تھے۔ وسط اپریل کی دوپہر میں خاموشی رچی تھی اور کھلی کھڑکی سے گندم کے پکے ہوئے خوشوں کی سنہری مہک گرم ہوا کے ساتھ کمرے میں آ رہی تھی۔

انہوں نے کچھ دیر بڑی سپاٹ سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اس کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہی نرم پڑ گئے۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارے لیے برا کروں گا؟" اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے انہوں نے گمبھیر۔ سی سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال کیا تھا۔

"میرے لیے نہیں مگر اپنے لیے۔"

"شش۔۔۔" انہوں نے فوراً ہی اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "تمہیں کیا معلوم میرے لیے کیا اچھا ہے، کیا برا۔ نادان، ہو بالکل۔" انہوں نے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔

"نادان ہوں، بے حس نہیں۔ آپ نے اپنے خواب بیچ دیے اونے پونے داموں، صرف میرے لیے کاکا جان! میرا دل کٹنے لگتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ آپ کے خیالوں پر، آپ کے لفظوں پر کسی اور نام۔۔۔" روکتے روکتے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔

کاکا جان اس کے ہاتھوں پہ گرتے شفاف آنسوؤں پہ نگاہ جمائے بیٹھے رہ گئے تھے۔

کتنا اطمینان حاصل ہوتا ہے، جب کوئی آپ کے لیے روئے، تڑپے آپ کے لیے آنسو بہائے۔

یہ بات کتنی تسکین بخش ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کا دکھ جانتے ہیں، سمجھتے ہیں اور پھر رو دیتے ہیں۔

کاکا جان نے ایک طویل سانس لی، ان کے چہرے پہ پھیلی آسودگی دیکھنے کے لائق تھی۔

"پگلی! میری ساری پونجی تو تم ہو۔ میرے سارے خواب، سارے خیال تم ہی سے وابستہ ہیں۔ پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤ تو پھر دیکھنا میرے ہر شاہکار پر میرا ہی نام ہو گا اور یہ لفظ ختم تھوڑی ہوتے ہیں۔ تب تک کچھ اور گھاک، کچھ اور عمر رسیدہ ہو جائیں گے۔ کہانی کو جکڑنا آ جائے گا انہیں۔ دو سال کی ہی بات ہے پھر میں تخلیق کروں گا، تم تشہیر۔"

"ایک ڈگری لے کر کون سی دنیا فتح کروں گی میں۔ آپ بھی پتا نہیں کیا کیا سوچ لیتے ہیں۔" اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے۔

"ڈگری بڑے کام کی چیز ہوتی ہے بٹو! علم ہو نہ ہو ڈگری ضرور ہونی چاہیے۔ اسی کے بل پہ عہدہ ملتا ہے، اس سے وزارتیں ملتی ہیں۔ اس ایک دستاویز کے زور پہ میں نے لوگوں کو راتوں رات محل کھڑے کرتے دیکھا ہے۔"

"ابا بھی تو بہت پڑھے لکھے تھے کاکا!" اس نے انہیں خوش فہمیوں کے جال سے نکالنا چاہا۔

"ہاں۔ پر ان کا سارا علم، ساری قابلیت، ساری ڈگریاں ایک من چاہی غلطی کی نذر ہو گئیں۔ دوش ان کا نہیں، قصور ان کی قسمت کا تھا یا پھر اس سماج کا۔ جو ان کی غلطی معاف کر دینے کا ظرف نہیں رکھتا تھا۔ کسی زہر آلود عضو کی طرح انہیں اپنے جسم سے کاٹ کر پھینک دیا۔ تاعمر پچھتاوے میں جتے ہیں۔ رہی سہی کسر پیدا کرنے والے نے پوری کر دی۔ انسان تقدیر کے چکر میں آ جائے تو اس کا اپنا بس نہیں چلتا۔" وہ بات کرتے ہوئے کہیں کھو سے گئے تھے۔

"ہوا کیا تھا کاکا؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہوں۔" کاکا جان نے چونک کر پرسوچ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ٹالنے کے لیے بات ہی بدل گئے۔

"اب مجھے ہی دیکھ لو، پانچ جماعتیں پڑھا ہوں لیکن کوئی ڈگری نہیں۔ ناولز، کالم، سوچ، ہمہ دانائی سب ایک طرف۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔ ہوتی کوئی ڈگری ہاتھ میں تو کسی بڑے انگریزی اخبار میں اچھی سی نوکری کر رہا ہوتا۔ آن بان سے زندگی گزارتے، یوں مر مر کر نہ جی رہے ہوتے۔" ان کا لہجہ ہارا ہوا تھا۔

"بہت سوں سے اچھے ہیں کاکا۔"

"کیا خاک اچھے ہیں بٹو! کیا دل نہیں چاہتا کہ بھائی جان کا علاج کسی اچھے بڑے اسپتال میں ہوتا، اب تک بھلے چنگے ہو چکے ہوتے۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو عجیب بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں، بھائی جان ٹھیک ہوتے تو کیا عیش و آرام کی زندگی ہوتی تمہاری۔" انہیں اپنی ذمہ داریوں سے بڑھ کر اپنی بے بسی کا خیال رلاتا تھا۔

"اب بھی کوئی کمی تو نہیں ہے کاکا! ابا ٹھیک ہوتے، تب بھی میں اتنی ہی مطمئن، پرسکون اور خوشحال ہوتی، جتنی اب ہوں۔ آپ بھی تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ کبھی کسی چیز کے لیے ترسنے نہیں دیا۔" وہ ان کا ہاتھ تھامے سچے دل سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر تم میری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ میں واقعی تمہارے لیے کوئی کمی نہیں چاہتا۔" وہ پھر سے اپنی بات پر آ رکے تھے۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر سر جھکا لیا۔

"مان تو رہی ہوں کاکا! حالانکہ میرا پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"سلیم تمہارے کاغذات جمع کرا دے گا تو پھر تم اس کے ساتھ جا کر یونیورسٹی دیکھ آنا۔ بہت اچھا اور ذمہ دار لڑکا ہے وہ۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہونے دے گا۔"

☆☆☆

بہت عرصہ پہلے کی بات نہ تھی۔ کاکا جان "کتاب گھر" کے بینچ پہ بیٹھے بازار کی رونق دیکھ رہے تھے۔ سلونی شام تھی، غروب ہوتے سورج کی سرخی سامنے مسجد کے میناروں کو دہکا رہی تھی۔ فضا میں اتری ٹھنڈک کلیوں اور گلابوں کی خوشبو سے لبریز۔ وہ کسی سوچ میں محو تھے اور پھولوں کے ہار، گجرے بیچنے والے یکے بعد دیگرے ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے تھے۔

تب ہی ایک نوجوان لڑکا دکان میں داخل ہوا۔ بھٹی صاحب ردی کی کتابوں کے ڈھیر میں گم کاکا جان کی مطلوبہ کتابیں تلاش کر رہے تھے، جب اس لڑکے نے کاؤنٹر بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اپنی کسی کتاب کے بارے میں پوچھ رہا تھا جس کے لیے اس نے کافی عرصے سے بھٹی صاحب کو کہہ رکھا تھا۔

"وہ کتاب نہیں مل رہی بچے!" بھٹی صاحب کے لاپروائی سے دیے گئے جواب سے لڑکے کے چہرے پہ مایوسی پھیل گئی تھی۔

کاکا جان دو تین روز سے اس لڑکے کو باقاعدہ چکر لگاتے دیکھ رہے تھے۔ اس کی اداسی کو شام کے

رنگوں میں کھلتے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کتابیں نکال کر الگ سے رکھ لینا بھٹی! میں چند روز میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بھٹی صاحب کے بعد اس نوجوان سے مخاطب ہوئے وہ قدرے حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''چلے جاؤ! فائدے میں رہو گے۔'' بھٹی صاحب نے ٹہوکا دیا تو وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ان کے پیچھے چل دیا تھا۔

ایک طویل راستہ پیدل چلنے کے بعد وہ جس گھر تک آئے اس کا بڑا سا دروازہ لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے پر ایک مختصر سی روش سامنے آئی جس کے دونوں اطراف کی کچی زمین گھاس سے اٹی ہوئی تھی۔ سبز قطعے میں آم، آڑو اور انار کے درختوں کی بہتات تھی۔ آڑو اور انار کے درمیانے قد کے درختوں کی شاخیں باہم یوں پیوست تھیں کہ کچے سبز آڑو کے ساتھ ہی انار کے سرخ شگوفے کھلے ہوئے تھے۔ اس سبز قطعے کا آدھا حصہ اس طویل قامت بیری کے درخت نے گھیر رکھا تھا جس کی شاخیں جھک کر ایک جھاڑ کی صورت میں زمین پر آ رہی تھیں۔ گھنی بیری کے نیچے کا حصہ دن کی روشنی میں بھی تاریک تھا۔ آم کے درخت کے نیچے چھوٹا سا حوض جس پر جا بجا خشک پتے تیر رہے تھے۔ سامنے برآمدے کے محرابی دروازوں پر سیمنٹ کی جالیاں لگی تھیں اور ان سے پرے کمروں کی قطار، بے رنگ و روغن، بوسیدہ دروازے، بے ترتیب کیاریاں، قدیم درختوں کی شاخوں سے لپٹی ہیبت ناک سی خاموشی جو کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکار رہی تھی۔

سلیم کو خود سے دو قدم آگے چلتا ہوا شخص کوئی بدروح معلوم ہوا تھا اور یہ سارا گھر کسی آسیب کا مسکن۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ پلٹ کر بھاگے اور اس گھر سے بہت دور جا کر ہی دم لے مگر اس دوران وہ شخص اسے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے کی دعوت دے چکا تھا۔

اس نے جھجکتے ہوئے دروازے سے اندر قدم رکھا۔ کمرے کے اندر بھی سناٹے کا وہی عالم تھا۔ وہ چپ چاپ کونے کی دیوار سے جا لگا۔

اس شخص نے جیب سے چابی نکالی اور کمرے میں موجود لکڑی کی واحد الماری کھولنے لگا جس کے شیشے بے حد دھندلے تھے۔

چند لمحے بعد اس کی مطلوبہ کتاب اس کے سامنے تھی۔ وہ حد درجہ حیرت سے اس شخص کو دیکھے گیا۔

''تم پر اعتبار کر کے تمہیں یہ کتاب دے رہا ہوں امید ہے ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔ فی زمانہ کتاب سے زیادہ انسان کا انسان پر اعتبار زیادہ قیمتی ہے۔ بیٹھ جاؤ، چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

عجیب بے نیازی تھی، انداز و اطوار میں، بات چیت میں۔

وہ ان کے جانے کے بعد کمرے کی خالی دیواروں، الماری میں بھری کتابوں، میز پر رکھے بہت سے مکمل، نامکمل مسودوں اور ان کے کھلے قلم کا جائزہ لیتا رہا جس کی نوک پر روشنائی جم چکی تھی۔

وہ چائے لے کر آئے جو بیک وقت بہت کڑوی اور بہت میٹھی تھی۔ زیادہ پتی، زیادہ چینی۔ وہ پہلا گھونٹ لیتے ہی مسکرا دیا تھا۔

''میرا نام سلیم ہے۔'' اس نے پہلی مرتبہ خوف اور ہچکچاہٹ کے بغیر انہیں دیکھا تھا۔

''مجھے سب کاکا جان کہتے ہیں۔''

''کیا میں اکثر آپ سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں؟''

''تمہارا دل چاہے تو ضرور۔''

☆☆☆

یونیورسٹی میں پہلا دن اور سلیم اسے لان میں بٹھا کر غائب۔ ہوا بالکل بند تھی۔ ماحول میں حبس اور قدرے تپش نے اسے حد درجہ بیزار کر دیا تھا۔ فائل میں سے چند پیپرز نکال کر جھلتے ہوئے وہ اپنے سامنے آتے جاتے اسٹوڈنٹس کو دیکھتی رہی۔

''ابھی نکلوں یہاں سے اور بھاگتے ہوئے گھر پہنچ جاؤں۔ بھاڑ میں جائے یونیورسٹی، ڈگری اور پڑھائی۔ ارے اس وقت آم کی چھاؤں تلے کیا مزے سے ستایا کرتی تھی۔ کاکا جان کو بھی عجب سوجھی۔ کیسی مشقت میں الجھا دیا۔ اب یہاں کتابوں سے مغز ماری کیا کروں گی۔'' اس نے دوپٹے کے پلو سے ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھا۔

''اور یہ سلیم کو دیکھو، کاکا نے کہا تھا تمہارا خیال رکھے گا، کوئی پریشانی نہ ہو گی اور حضرت دو گھنٹے سے غائب۔'' اس نے اٹھ کر ایک چھوٹا سا چکر لگا کر یہاں وہاں سلیم کو ڈھونڈا۔ کسی منچلے اسٹوڈنٹ نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے ''مے آئی ہیلپ یو میم'' کا نعرہ لگایا تو وہ چڑ کر دوبارہ اسی بینچ پر آ بیٹھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ اسے سخت بھوک لگ رہی ہے۔

صبح کاکا جان نے بھی کیسی عجلت میں اسے گھر سے نکالا تھا۔ سلیم کو دیر ہو رہی تھی۔ وہ خود تو منہ سے کچھ نہ بولا۔ کاکا جان نے اودھم مچا دیا تھا۔ ماورا کو اگر پہلے سے خبر ہوتی کہ آج یونیورسٹی جانے کا پروگرام ہے تو نماز کے بعد ہی سے تیاری شروع کر دیتی۔ مگر قصور تو سارا کاکا جان کا تھا جو سلیم کے ساتھ پروگرام بنا کر اسے بتانا بھول گئے تھے اور اب سب سے زیادہ آفت بھی انہوں نے ہی مچائی ہوئی تھی۔ جب تک ماورا کپڑے بدل کر آئی، وہ اس کے تمام ضروری کاغذات فائل میں لگا چکے تھے۔ بقیہ چیزیں سلیم کو تھمائیں اور وہ دونوں گھر سے باہر۔ ناشتا بھی نہ کرنے دیا۔

''اور یہ سلیم۔۔۔ یہ بھی تو کاکا جان کا ہی چیلا ہے۔ اب ہے کوئی احساس۔ ایک لڑکی ذات کو تن تنہا یہاں بٹھا کر خود نجانے کہاں کہاں آوارہ گردی کر رہا ہو گا۔''

اس نے تھک کر پہلو بدلا۔ اکتاہٹ اور بے زاری کے بعد ذہن پہ چھائی غنودگی نے اس کی آنکھوں میں سرخی بھر دی۔

تب ہی دور سے سلیم آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کوفت بھرے انداز میں اسے قریب آتا دیکھتی رہی۔

''فیس جمع ہو گئی، یہ رہی رسید، یہ رول نمبر سلپ، یہ کلاسز کا شیڈول۔'' اس نے سارے کاغذات ایک ایک کر کے اسے تھمائے۔

''یہ کچھ نوٹس ہیں اور یہ چند کتابیں۔ ابتدائی طور پر ان ہی سے مدد ملے گی۔ بعد میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا کرتیں۔ انہیں اسٹڈی کر کے جائیں گی کلاس میں تو بہت مدد ملے گی۔''

ماورا نے بے دلی سے ساری چیزیں تھام کر گود میں رکھ لیں۔ سلیم نے ایک نظر اس کے اکتائے ہوئے چہرے پر ڈالی اور پھر بینچ کے دوسرے سرے پر جا بیٹھا۔ ماورا نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

''آپ مجھے یہاں بٹھا کر بھول گئے تھے یا آپ کے پانچ منٹ سے مراد پانچ گھنٹے ہوتے ہیں۔''

''پانچ گھنٹے۔۔۔؟'' سلیم کی نگاہ کلائی پہ بندھی گھڑی پر پھسلی۔ اسے یاد تھا، وہ اسے پانچ منٹ میں واپس آنے کا کہہ کر گیا تھا۔

''بمشکل ایک گھنٹہ ہوا ہے۔ آفس میں رش بہت تھا۔ فیس جمع کرانے میں زیادہ وقت لگا پھر لائبریری سے بھاگم بھاگ کتابیں نکلوائیں۔ ایک دوست سے نوٹس لانے کا کہہ رکھا تھا۔ بعجلت ہی سب کام نمٹا کر آیا ہوں۔'' سلیم نے وضاحت دی تھی۔

ماورا کی کلائی پر گھڑی موجود نہ تھی، وگرنہ وہ کبھی اس کی بات کا یقین نہ کرتی۔

''اب ڈپارٹمنٹ دیکھنے چلیں یا لائبریری؟'' سلیم پوچھ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے، گھر چلتے ہیں۔''

''گھر۔۔۔؟'' سلیم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''اصل میں، میں نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ بھوک، پیاس اور گرمی نے میرا برا حال کر دیا ہے۔'' وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سلیم بری طرح شرمندہ ہو گیا۔

''مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ یہاں کینٹین ہے، میں آپ کو وہاں سے۔۔۔''

''نہیں، گھر ہی چلتے ہیں۔ فی الحال تو مجھے یہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ پتا نہیں ہر روز کیسے آیا کروں گی۔'' وہ بہت بددل لگ رہی تھی۔

سلیم نے اصرار کرنا چاہا تھا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔ موڈ نہ ہو تو کسی بات پر وہ کاکا جان سے بھی تکرار کر لیا کرتی تھی۔ اس کا تو بالکل بھی لحاظ نہ کرتی۔ وہ چپ چاپ شرافت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مارے مروت کے یہ بھی نہ کہا کہ ابھی مجھے ایک بہت ضروری اسائنمنٹ جمع کرانی ہے۔ اس کے موڈ کا بھی کیا بھروسہ، پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو ہر سو خاموشی تھی۔ سلیم اسے چھوڑ کر باہر سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی ابا کے کمرے کی طرف آئی۔ وہ انہیں ڈرانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر کاکا نجانے کہاں سے نکل آئے، اسے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا۔

''آہا۔۔۔ آ گئی ہماری بٹو!''

وہ پہلے بری طرح ڈر کر اچھلی اور پھر ہنستی ہوئی کمرے میں بھاگ آئی۔

''ابا! میں آ گئی۔'' وہ جاتے ہی ان سے لپٹ گئی۔ ابا کا کپکپاتا ہاتھ بمشکل اس کے سر پہ آ کے ٹھہرا۔

''تمہارے بغیر دل بہت اداس ہو گیا تھا۔'' ابا نے آدھی بات زبان سے، آدھی اشاروں سے سمجھائی۔

''اٹھیے بھائی جان! گلے سے لگایے بٹیا کو۔ یوں منہ بسورتے ہوئے تو اسکول میں بھی پہلے دن نہ گئی تھی، جیسے آج یونیورسٹی گئی تھی۔'' کاکا جان نے آ کر اسے چھیڑا۔

''جی اسکول کے پہلے دن مجھے ابا نے تیار کر کے بھیجا تھا۔ ناشتا بنا کر اپنے ہاتھوں سے کھلایا اور لنچ بنا کر ساتھ روانہ کیا تھا۔ آج تو ہمیں کاکا جان نے بھگتایا تھا۔ بغیر ناشتے، بغیر چائے پانی کے۔'' اس نے شرارت سے کہتے ہوئے ان کے چہرے کی بدلتی رنگت کو نہ دیکھا تھا۔ ذرا دیر تک ابا سے

باتیں کر کے وہ اٹھی تو کاکا کمرے میں موجود نہ تھے۔ وہ کوئی خاص توجہ دیے بغیر باورچی خانے میں آ گئی۔ صبح کی ٹھنڈی روٹی پر آم کی چٹنی رکھی۔ ساتھ میں گرم چائے کا کپ بنایا اور مزے سے کھا کر باہر آ گئی۔

فضا میں حبس جوں کا توں موجود تھا۔ درختوں کے پتے ساکت اور ان کی شاخوں میں دبکی چڑیاں بے زار لگ رہی تھیں۔ اس نے شہتوت کے درخت کی شاخوں میں پھنسا کٹورا نکال کر دیکھا۔ بالکل خشک، گرد آلود، وہ حوض کی طرف آ گئی۔ کٹورا دھو کر اس میں صاف پانی بھرتے ہوئے اسے ایک درخت کی اوٹ میں کاکا کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے قدرے حیران ہو کر دیکھا اور کٹورا شاخوں میں دوبارہ پھنسا کر پیچھے سے گھوم کر کاکا جان کے سامنے آ گئی۔

''ارے۔'' اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ سر جھکا ہوا اور یہ موٹے موٹے آنسو ہاتھ کی پشت پر ٹپاٹپ برس رہے تھے۔

''کاکا جان!'' اس نے ایک دم ان کے قریب اٹھ کر ان کا چہرہ اوپر کیا۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی۔ آنسو ان کے پورے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی حساس بچے کی طرح چھپ چھپا کر، بغیر کوئی آواز نکالے وہ بہت زیادہ رو چکے تھے۔

''کیا ہوا ہے کاکا جان!'' انہیں اس حالت میں دیکھ کر ماورا کو لگا، وہ خود بھی ایک دم رو دے گی بغیر کوئی وجہ جانے۔

''بول کیوں نہیں رہے کاکا جان! کیوں رو رہے ہیں؟'' اس نے زور سے ان کا بازو جھنجوڑا۔

''کچھ نہیں ہوا، یونہی اپنی کوتاہی پر رونا آ گیا۔''

''کیسی کوتاہی؟''

کاکا جان بغیر کوئی جواب دیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بازو موڑ کر آستین سے آنسو پونچھے اور حوض پہ آ کر منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگے۔

وہ چند لمحے منتظر رہی پھر اٹھ کر ان کے سر پہ جا پہنچی۔

''آپ بتا کیوں نہیں رہے کاکا! میں کچھ پوچھ رہی ہوں آپ سے؟''

''ارے کچھ نہیں بٹو! تم تو خوامخواہ۔'' انہوں نے کترا کر نکل جانا چاہا مگر اس نے زبردستی روک لیا۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ یوں چھپ چھپا کر روتے رہیں اور کوئی آپ سے پوچھے بھی نا۔ یوں غیریت برتیں گے تو عمر بھر بات نہیں کروں گی آپ سے۔'' اسے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔

کاکا جان چند لمحے ہونٹ کاٹتے رہے پھر بمشکل بولے۔

''سارا قصور میرا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی ہے، میں بھی سٹھیاتا جا رہا ہوں۔ پہلے سلیم کے ساتھ پروگرام بنایا تو تمہیں یونیورسٹی جانے کی اطلاع نہ کی۔ صبح پکڑ دھکڑ کر یونیورسٹی بھیجا تو ناشتے کا خیال نہ کیا، یعنی غلطی پہ غلطی۔ حالانکہ جانتا تھا، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ سلیم کو بھی صرف فیس کے پیسے دیے تھے، ورنہ وہیں سے کچھ دلا دیتا۔ پتا نہیں کیوں مجھ سے ایسا ہو جاتا ہے، حالانکہ میں کرنا تو نہیں

چاہتا مگر غلطی بس ہو ہی جاتی ہے۔" ان کی آواز دوبارہ بھرّا گئی۔

ماورا نے سر تھام لیا۔

"کیوں ایسی بات منہ سے نکالی۔ بے چارے کا کا جان کا دل توڑ دیا۔" وہ جی بھر کر پچھتائی۔

"تم نے سارا دن بھوک میں گزارا ہوگا۔" وہ دل کی باتیں زبان پہ لا رہے تھے۔

"پلیز کا کا۔" ماورا نے چیخ کر انہیں چپ کرا دیا۔

"کیوں اتنے حساس ہو جاتے ہیں آپ! اتنی سنجیدگی سے لیتے ہیں آپ ایسی باتوں کو۔ مجھے جانتے نہیں ہیں کیا۔ کتنا فضول بولتی ہوں میں۔ کبھی تول کر نہیں بولی بلکہ بول کر بھی نہیں تولتی۔ جو منہ میں آتا ہے، کہہ دیتی ہوں۔ معنی و مطلب کی پروا کیے بغیر۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا آپ یوں سوچیں گے۔ قسم لے لیجیے جو دل میں ذرا سا بھی شکوہ ہو۔ بس یونہی زبان پھسل گئی اس پل اور پھر میں کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں جو اتنی سی بھوک بھی برداشت نہ کر سکوں گی۔ کا کا جان بہت برے ہیں آپ! آج تو حد کر دی ہے۔ کتنی شرمندگی ہو رہی ہے مجھے، آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ سچ مچ پانی پانی ہو رہی تھی۔

کا کا جان اس سے بڑھ کر شرمندہ کہ بے چاری بچی پریشان ہو گئی۔

فوراً ہی موڈ درست کر لیا۔ ہونٹ مسکرانے سے انداز میں پھیلا لیے۔ بات بدل ڈالی، یونہی یونیورسٹی کے متعلق پوچھنے لگے۔

ماورا بھی تڑتڑ بولتی رہی پھر کا کا جان، ابا کے پاس چلے گئے۔ وہ ابا کے لیے دلیہ پکانے کو اٹھ گئی۔

کام سے فارغ ہو کر کچن سے باہر نکلی تو موسم اپنا رنگ بدل رہا تھا۔ آسمان کا رنگ زردی مائل سرخ ہو رہا تھا۔ ہوا میں تیزی اور ٹھنڈک۔ گرد اڑ اڑ کر برآمدوں تک آ رہی تھی۔ اس نے بالٹی اٹھائی اور پانی بھر بھر کر برآمدے سے آگے کی کچی زمین پر چھڑکنے لگی۔

شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ
عطروں سے بڑھ کر تیرا پسینہ
شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ

بیری کی شاخوں میں چھپے طوطوں نے شور مچا رکھا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر زور زور سے نعت پڑھنے لگی۔

ہوا میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ درختوں کی شاخیں زور زور سے ہلکورے لینے لگیں۔ ماحول میں مٹی کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ اڑتی ہوئی گرد آنکھوں میں گھسنے لگی تو دوپٹہ کھینچ کر گھٹنوں تک تان لیا۔ یہ بچپن کی عادت تھی۔ نعت پڑھ کر بہت سرور ملتا تھا۔ ایک نعت ختم ہوئی، دوسری شروع۔

کوئی لفظوں میں کیسے بتائے
ان کے رتبے کی حد ہے تو کیا ہے
ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے
صرف اللہ ان سے بڑا ہے

کسی نے سر پہ زور کی دھپ لگائی۔ اس نے ہڑبڑا کر گھونگھٹ الٹا۔ شوں کی آواز کے ساتھ آندھی آئی اور دوپٹہ دور تک اڑا لے گئی۔ اس نے بمشکل ایک کونے سے تھام کر دوپٹہ سنبھالا۔

"بھاگ جاؤ کمرے میں پھر چیخ چیخ کر روؤ گی۔" کا کا جان کمرے کے دروازے بند کر رہے تھے۔

تیز آندھی نے دل دھڑکا دیا۔ ایسا موسم اسے بہت خوفزدہ کرتا تھا۔ ڈر کر بھاگی سیدھی ابا کے کمرے میں۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے تسبیح کر رہے تھے۔ یہ فوراً ان کے کاندھے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

کا کا جان دروازے کھڑکیاں بند کر کے آئے اور آتے ہی اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

"یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور آندھی سے ڈرتی ہے۔ واہ واہ۔۔۔ کیسی دلیر ہے ہماری بھتیجی۔"

"بہت دلیر ہوں، درختوں کے پیچھے چھپ چھپ کر نہیں روتی، ہاں۔" اس نے بھی ان کی کمزوری پکڑلی تھی۔

"زیادہ باتیں مت بناؤ، ابھی ٹھوکریں مارتی ہوا آئے گی۔ سب دلیری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ بہت خوفناک طوفان ہے۔ بارش بھی ہوگی، بادل بھی گرجیں گے۔"

شام کے چار بجے تھے اور باہر آدھی رات کا منظر۔ گرد سے اٹے بادلوں نے قیامت کا شور مچا رکھا تھا۔ دن کی روشنی غائب تھی۔ ہر چیز پر سیاہی غالب۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ ابا تسلی آمیز انداز میں اسے تھپکیاں دینے لگے۔

کا کا جان نے بھی بات بدل دی اور پوچھنے لگے۔

"یونیورسٹی میں کس کس سے ملیں، کیسے دوست بنایا، کیا کیا دیکھا؟"

"لو، پہلے دن ہی دوستیاں گانٹھنے بیٹھ جاتی۔ ابھی تو بس دور دور سے ہی سب دیکھا اور وہاں کی لڑکیاں۔۔۔ کا کا کچھ مت پوچھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک لباس۔ آپ تو کہتے تھے دو جوڑوں میں گزارہ ہو جائے گا لیکن وہاں تو واقعی فیشن شو لگتا ہے۔ اتنے اچھے اچھے کپڑے۔ لیجیے اب اور کیا کہوں۔ یہ سب بتاؤں گی تو آپ پھر حساس ہونے لگیں گے کہ بٹو کے پاس زیادہ کپڑے کیوں نہیں۔ سمجھیں گے کہ ماورا شکوہ کر رہی ہے۔ لو بھئی، ہم تو الٹی سیدھی کہنے سے بھی گئے۔ زبان پہ تالا لگانا پڑے گا اگر یہ ہی صورت رہی تو۔"

وہ بولتی رہی۔ کا کا دل پہ پتھر رکھ کر مسکراتے رہے۔

مفلوج ابا نے آنکھوں میں آئی نمی کو گرد کے بہانے پونچھا۔ تسبیح کے دانے بے ترتیب ہو کر ان کی کپکپاتی انگلیوں سے نکلتے گئے۔ اپنی بہت ہی پیاری بیٹی کے معصوم چہرے سے نگاہ ہٹا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے انہوں نے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔

"کاش میں کسی قابل ہوتا۔"

☆☆☆

تازہ کلیوں کی مہک ایکدم اس کی سانسوں میں شامل ہو گئی تھی۔ ہارون اسرار نے قطعی غیر ارادی طور پر اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے عین سامنے وہ لڑکی بیٹھی تھی اور یہ تیسری مرتبہ ہوا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا تھا۔

"کیوں؟" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

"اس لڑکی کے قطعی اجنبی خدوخال میں اتنی اپنائیت کیوں؟"

''ہر بار یہ چہرہ مجھے چونکا دیتا ہے۔ اپنی جانب کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں کوئی پرانی جان پہچان؟'' اس نے کھلی کتاب پر سے نظریں ہٹا کر اس لڑکی کو دیکھا اور پھر اپنی یادداشت کو کھنگالا مگر کہیں کچھ بھی نہ تھا۔ بس وہی دو واقعات تھے جو ننھے جگنوؤں کی طرح ذرا ذرا سی دیر بعد دل و دماغ میں جل بجھ رہے تھے۔

اسے یاد تھا، اس روز وہ پروفیسر افضال ناصر کے پاس کسی کام سے گیا تھا۔ کلاس روم میں داخل ہونے پر اسے پہلا چہرہ یہ ہی نظر آیا تھا۔ پروفیسر افضال اپنی نئی کلاس سے تعارف حاصل کر رہے تھے اور یہ لڑکی کہہ رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم مستقبل میں، میں اس ڈگری کو کس طرح استعمال کروں گی۔ میرے یہاں آنے کا خواب کسی اور آنکھوں نے دیکھا تھا۔ میں تو بس اس خواب میں رنگ بھرنے کو یہاں آ گئی ہوں۔''

''گویا تمہاری زندگی کے اہم فیصلے دوسرے لوگ با آسانی کر سکتے ہیں۔'' پروفیسر صاحب کا اندازہ یقیناً درست تھا مگر اس لڑکی نے بڑی سہولت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں رد کر دیا تھا۔

''سب لوگ نہیں سر! لیکن جو شخص میرے حوالے سے... دیکھے گئے ایک خواب کے لیے اپنے سب خواب بیچ ڈالے، اس کا ہر حرف میرے لیے حرفِ آخر ثابت ہوگا۔''

ہو سکتا ہے اس کے اور پروفیسر صاحب کے درمیان مکالمہ کچھ دیر اور جاری رہتا مگر پروفیسر صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ لڑکی سر جھکا کر اپنی سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔

اور ہارون اسرار کو یہ بھی یاد تھا کہ اس دن ایک چہرہ پل بھر کے لیے دن کے نجانے کس حصے میں اس کی نگاہوں کے سامنے گھوما بھی تو اسے یاد نہ آ سکا تھا۔ اس نے یہ چہرہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔

''اے ہارون! کیا خیال ہے۔ یہ انیب چوہدری اس بار یونین کا الیکشن...'' احمد کیانی اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

ہارون اسرار نے اپنے شعور میں ڈوبتی ابھرتی سوچ کا کونہ پکڑتے ہوئے احمد کیانی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

اور محض دو دن قبل اس نے اس لڑکی کو کوریڈور میں ایک لڑکے سے ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ لڑکا بہت عجلت میں تھا اور اس انداز سے اس سے ٹکرایا تھا کہ اس کی ہاتھ میں پکڑی فائل اور فائل میں رکھے بہت سے کاغذات کوریڈور میں بکھر گئے تھے۔ وہ اسی تیزی میں معذرت کے دو بول کہتا آگے بڑھ گیا تھا اور اس لڑکی کو سخت بے زاری کے عالم میں اپنے تمام کاغذات اٹھاتے دیکھ کر ہارون کو اس بدتہذیب لڑکے پر بلا کا غصہ آیا تھا۔ اس وقت یہ لڑکی اپنے تمام کاغذات اٹھا کر فائل میں لگانے کے بعد کلاس روم میں جانے کے بجائے وہیں کوریڈور کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی تھی۔ فائل اس کی گود میں تھی اور بند مٹھی پہ چہرہ جمائے وہ گویا خود سے باتوں میں محو ہو گئی تھی۔

اور ہارون کو یہ بھی یاد تھا کہ اس روز، اس پل، اس نے یونہی بے وجہ ہی کوریڈور میں کئی چکر لگائے تھے۔

اس روز موسم بہت خوبصورت تھا اور بارش کی نمی سے لبریز ہوا اس روز بھی کلیوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر سیدھا ہو بیٹھا پشت کرسی سے ٹکا کر نگاہیں اس کے چہرے پہ جما دیں۔

اور آج تیسری بار وہ لڑکی اس کے سامنے تھی۔ لائبریری کے روشن اور پُرسکون ماحول میں اپنے سامنے ایک کتاب کھولے وہ خود ایک بند کتاب کی مانند اسے متاثر کر رہی تھی۔ کلیوں کی بہت مدھم سی خوشبو آس پاس سرسرا رہی تھیں۔

''اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ ان شاہزادیوں کا خیال آ جاتا ہے جو اپنے محل کے جھروکے میں بیٹھی، دریا پہ ڈولتی کشتیوں کے عقب میں ڈوبتے سورج کو دیکھا کرتی تھیں اور اُداس رہتی تھیں۔'' احمد نے کتاب بند کر کے سامنے میز پر کھسکائی اور دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

ہارون نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ایک نظر احمد کو دیکھا اور پھر کھلی کتاب کے کئی صفحات ایک ساتھ پلٹتے ہوئے پوچھا۔

''جانتے ہو اسے؟''

''کچھ خاص نہیں، بس اتنا ہی کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے اور بولنے میں ایک خاص ردھم۔ میں نے ابھی تک اسے دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ گھلتے ملتے نہیں دیکھا۔''

احمد کیانی کھڑا ہو کر اپنی کتابیں سمیٹ رہا تھا۔

جبکہ ہارون اسرار کے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ سلیم، کاکا جان کے ساتھ کھانا کھا کر ابھی ابھی گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو جھوٹے برتن یونہی پڑے تھے۔ لمبی دم والی گلہری روٹی کا ننھا سا ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے بڑی نزاکت سے کھا رہی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر اس کا تیزی سے چلتا ہوا منہ ساکت ہوا اور اگلے ہی پل وہ باہر نکل گئی۔ ماورا نے جھوٹے برتن اٹھائے، کمرے کو ذرا سا سیٹ کیا اور باہر نکل گئی۔ آج موسم اچھا خاصا گرم تھا۔ گرم ہوا بدن کو جھلسائے دے رہی تھی۔ اس نے ابا کے کمرے میں جھانکا تو انہیں قدرے بے چین دیکھ کر وہ تولیہ بھگو لائی۔ چہرے، گردن، بازوؤں پہ گیلا تولیہ پھیر کر اس نے پنکھا تیز کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہزار بار بٹن گھمانے کے بعد بھی وہی رفتار رہی تو ابا بے اختیار مسکرا دیے۔ وہ بھی کھسیا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کن چونچلوں میں پڑی ہو، یہ دیکھو۔'' کاکا جان نے اندر آ کر بھگو کر نچوڑی ہوئی چادر ابا کے اوپر ڈال دی۔ ہوا نم آلود ٹھنڈک کے ساتھ ان کے بدن تک پہنچی تو ان کے چہرے پہ خود بخود آسودگی پھیل گئی۔ کاکا نے آگے بڑھ کر کھلی، کھڑکی بند کی۔ دروازے کے سامنے پردہ گرایا اور خود باہر نکل گئے۔ وہ وہیں بیٹھ کر کتابیں کھنگالنے لگی۔ نیم تاریک کمرے میں اسے کتاب پر جھکے دیکھا تو ابا باہر جا کر پڑھنے پر اصرار کرنے لگے۔ اس نے ساری کتابیں اٹھائیں اور کاکا کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ان سے ایک اسائنمنٹ لکھوانا چاہ رہی تھی۔

''آخر ہمیں بھی تو کچھ فائدہ ہو۔''

مگر کاکا نے صاف انکار کر دیا۔

''پکا پکایا حلوہ کھانے کا شوق ہے تو ابھی بنائے دیتا ہوں مگر یہ کام نہیں کرنے کا۔ استاد سے بے ایمانی۔ توبہ... سارا علم دھول، مٹی۔'' لیکچر دینے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

اس نے کتابیں کھینچ کر اپنے سامنے رکھ لیں۔

"کچھ مدد تو کروا سکتے ہیں کہ نہیں۔" اس نے آخری حربے کے طور پر امید سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے بڑے چست انداز میں اپنی الماری کھولی اور دو چار کتابیں اس کے سامنے رکھ کر خود باہر چلے گئے۔

"اوہ خدایا" یہ موٹی موٹی کتابیں دیکھ کر اس کا دل اوب گیا۔ جمائی پہ جمائی آنے لگی۔ آنکھیں نیند سے بھر گئیں۔ اس سے پہلے کہ ان ہی کتابوں کو اوڑھ بچھا کر سو جاتی کاکا جان پرچ میں چائے کا کپ کھڑکھڑاتے سر پہ آن پہنچے۔

"کڑک چائے۔"

"کاکا! اتنی گرمی میں؟"

"تو جاؤ، پہلے نہا دھو کر تازہ دم ہو آؤ۔ یوں سست ہو کر پڑھنے لگیں تو ہو چکا کام۔ اٹھ جاؤ، ورنہ دو جھانپڑ لگا کر ساری نیند رخصت کر دوں گا۔" ان کی آنکھوں سے سچ مچ کا غصہ چھلک رہا تھا۔

"تب تک تو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" اس نے کپ تھاما اور چسکیاں لینے لگی۔ ساتھ ساتھ اسائنمنٹ کی آؤٹ لائن بھی تیار کر لی۔

"ایک کالم لکھ رکھا ہے۔ صبح لیتی جانا۔ واپسی پر عبداللہ ظفر کو دے آنا۔ صبح کے وقت تو وہ دفتر میں نہیں ہوتا۔"

کاکا جان کی بات سن کر اس کا چلتا ہوا قلم یکلخت تھم گیا تھا۔ کئی باتیں ایک ساتھ یاد آ گئیں تو اس نے خالی کپ آہستگی سے چٹائی پر رکھ دیا۔ کاکا جان کرسی پر اس کی طرف پشت کیے بیٹھے تھے۔ وہ کئی لمحے نہیں دیکھتی رہی پھر کتاب کی بے جان سطروں پر نگاہ جما دی۔

وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ پچھلا کالم شائع ہو گیا؟ اگر نہیں تو ایک بار پھر کیوں؟ مگر پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ کتنے پل بیت گئے، تب جانے کیسے زبان پھسل گئی۔

"کاکا، کہتے ہیں سقوطِ ڈھاکہ کے نوحے میں اب کوئی دم خم نہیں رہا، بات پرانی ہو گئی ہے اور یہ کہ اب اس آگ میں کوئی چنگاری باقی نہیں رہی۔"

کاکا جان اس کی بات سن کر چپ ہو رہے تھے۔ اتنی طویل چپ کہ اسے ان کی طرف سے کسی جواب کی امید نہ رہی۔ تب وہ بولے بھی تو یوں گویا ہر سانس ہچکی لے رہی ہو۔

"جسم کا کوئی حصہ کٹ جائے تو وقت صرف زخم بھرتا ہے بٹو! محرومی کا کربناک احساس کبھی دم نہیں توڑتا، خواہ دن گزریں یا ماہ و سال۔ جس نے جھیلا ہو، وہی جانتا ہے۔ ہنستے بستے گھروں میں ویرانی یوں اتری تھی کہ دل آج بھی کھنڈر ہیں۔ پر کیا کریں کہ جو دکھ میرا ہے، وہ میرا ہی ہے۔ اسے نہ تم جان سکتی ہو، نہ کوئی اور۔"

ماورا نے طویل سانس لے کر سر جھکا دیا۔ بے اختیار ہی ابا کی ڈائری کا لکھا ہوا ایک صفحہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

"دو ہفتے ہو گئے ہیں اور یہ نوجوان یہیں رہتا ہے۔ نیم دیوانہ، نیم پاگل سا، زیادہ تر غشی طاری رہتی ہے۔ ہوش میں آئے تو اس کا رونا دیکھا نہیں جاتا۔ رانیہ جی جان سے اس کی خدمت کرتی ہے۔ بسا

اوقات اس کے رونے کرلانے پر خود بھی رونے لگتی ہے۔ اسی کی منت سماجت پر گلی گلی اس کی شناخت کے لیے گھوما ہوں۔ تب جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو اپنے تنکا تنکا بکھرے آشیانے کا چلتا پھرتا نوحہ ہے۔ گھر جل چکا تھا اور ہر طرف اڑتی ہوئی راکھ نے آسمان بھی دھندلا دیا تھا۔ آس پاس کے لوگوں نے بتایا کہ اسی راکھ میں نوشیرواں کی بیوی کی لاش بھی دبی تھی۔ اس بیوی کی لاش جس کی کوکھ میں نوشیرواں کا سات ماہ کا بچہ پل رہا تھا۔ میں اس اجڑے بیاباں سے نکل بھاگا۔ میرا بھی ایک گھر تھا جس میں میری بیوی میری منتظر تھی۔ یہ وحشت ناک سیاہ دھواں مجھے اپنے گھر کی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ میں دیر کر بیٹھوں۔ گھر پہنچا اور پھر رانیہ اور نوشیرواں کو لے کر سیدھا پاکستان آ گیا ہوں۔ جس دیوانے کو گھر اٹھا لانے پر میں رانیہ سے خفا تھا، وہی شخص اب دل سے قریب محسوس ہونے لگا ہے۔ خوابوں، امیدوں اور تمناؤں کو کھو دینے والا انیس سالہ شخص۔ مظلوم و مقہور۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی طاقت ہوتی کہ اس کی سیاہ آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کی جگہ مسکراہٹ کی روشنی بھر سکوں۔ یہ شخص اتنا پیارا ہے کہ اب تو لگتا ہے عمر بھر اس کی جدائی بھی برداشت نہیں ہو گی۔"

کاکا جان نے اس کی طرف رخ موڑ لیا تھا۔ وہ جو بہت دیر سے ان کے سرمئی بالوں پہ غالب آتی سفیدی پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ سر جھکا کر آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلنے لگی۔

"کہنے والوں کو بتا دیا کرو بٹو! کہ دکھ کبھی ماند نہیں پڑتا۔ تقسیم کا واقعہ تو سقوطِ ڈھاکہ سے بھی بہت پہلے کا ہے ناں۔ پر لوگ آج بھی اپنے پیاروں کو روتے ہیں جن کی بے گور و کفن لاشیں راہ کی دھول مٹی میں پڑی رہ گئیں۔ اب اور کیا کہیں جو بچھڑ گئے ان کی یاد رہ رہ کر آتی ہے اور جو کبھی نہ مل سکے ان کے ملنے کی امید نہیں جاتی۔ ہاں بات پرانی ہو گئی ہے مگر دکھ پرانا نہیں ہوا۔ اس خطے کے ایک کونے میں ہم اپنا دل بھول آئے بٹو! وہ پکارتا ہے ہمیں تو اندر ایک نہیں، ہزار چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ من بھسم ہو جاتا ہے اور لوگ کہتے ہیں، اس آگ میں چنگاری باقی نہیں رہی۔"

☆☆☆

سیمینار روم خالی ہو چکا تھا۔ آخری اسٹوڈنٹ کو بھی اپنے سامنے سے گزرتے دیکھ کر احمد کیانی نے اکتا کر دوبارہ اندر جھانکا۔ بہت سی خالی کرسیوں کے درمیان بیٹھے ہارون اسرار کے اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ دیکھ کر وہ بری طرح جھنجلایا۔

"ایکسکیوز می۔" وہ اسے پکارنے کو تھا، جب وہ لڑکی ایکدم اس کے سامنے آ گئی۔ ہلکی سی گھبراہٹ، اور بے چینی اس کے ہر، ہر انداز سے نمایاں تھی۔

احمد کیانی نے ہٹ کر اسے راستہ دیا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ لڑکی اب کرسیوں کے آس پاس کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی۔

"کس گیان دھیان میں مصروف ہو۔ چلنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" وہ ہارون سے مخاطب تھا۔

"تم چلو، میں آ رہا ہوں۔" وہ بڑے اطمینان سے اپنی فائل کھولنے لگا تھا۔

"او کے لیکن اگر تم نے پانچ منٹ سے زیادہ دیر لگائی تو ہو سکتا ہے میں تمہیں پارکنگ میں نہ ملوں۔" وہ اسے گویا تنبیہ کر رہا تھا۔

"ایکسکیوز می۔ میرا پین کہیں کھو گیا ہے۔ کیا آپ میں سے کسی نے دیکھا یا کسی اور کو اٹھاتے

ہوئے دیکھا ہو تو۔'' وہ لڑکی دور کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''وہ پین گولڈ کا تھا؟'' احمد نے اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''گولڈ کا؟'' وہ لڑکی حیران ہوئی اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''آپ شاید میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ پین میرے لیے گولڈ سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔''

''میں نے کسی کا مذاق نہیں اُڑایا اور نہ ہی میں نے کوئی پین دیکھا ہے۔'' احمد نے کندھے اچکائے اور باہر کی جانب چل دیا۔

وہ چند لمحے کھڑی آس پاس دیکھتی رہی اور پھر ہاتھ مسلتی باہر کی جانب چل دی۔

سیمینار روم کے ٹھنڈے ٹھار ماحول میں تنہا بیٹھے ہارون اسرار نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس لڑکی کو بہت دور تک جاتے دیکھا اور پھر اپنی فائل میں سے ایک پین نکال کر اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پہ اس وقت ایسی مسکراہٹ تھی کہ کوئی بھی دیکھتا تو جان لیتا کہ چور کون ہے۔

کاکا جان اس پہ اتنا برسے تھے کہ حد نہیں۔ وہ دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں میچے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''حد ہو گئی، ایک قلم تک تم سے سنبھالا نہیں گیا اور کیا کرو گی تم زندگی میں۔ جانتی ہو، ایک قلم کار کے لیے اس کا قلم کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں اپنی اولاد کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا اسے۔ اتنے سالوں میں وہ ایک بار بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوا اور تم ہو کہ ایک روز میں اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اگر پتا ہوتا کہ اِدھر اُدھر پھینک آؤ گی تو کبھی نہ دیتا اور تم نے مانگا کیوں تھا مجھ سے، ہیں۔'' اس کے سر پہ ہاتھ گاڑ کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

''جانتی ہو نا، انکار نہیں کر سکتا تمہیں، اس لیے مانگ کر لے گئیں۔ اچھا آئندہ کے لیے تمہیں کوئی چیز دوں تو پھر کہنا۔'' اس کے سر پہ اچھی خاصی چپت لگا کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔

اس نے سارا غبار ابا کے پاس آ کر نکالا۔

''سمجھا لیں اپنے بھائی صاحب کو۔ ایک ناکارہ پین کے بدلے اتنی باتیں سنائی ہیں مجھے۔ کھونے والی چیز تھی، کھو گئی۔ اب کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی میں۔ پاگلوں کی طرح ایک ایک سے تو پوچھتی پھری میں مگر نہیں ملا۔ لوگ پوچھ رہے تھے۔ کیا گولڈ کا پین تھا؟''

''اب شکایتیں لگا رہی ہو چغل خور۔'' کاکا جان نجانے کہاں سے گھوم پھر کر واپس آ گئے تھے۔

''میں نہیں لگاتی، آپ لگا لیں۔'' انہیں ابا کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ چڑ کر اٹھ گئی۔

''بھائی جان! میرا قلم گم کر آئی ہے یہ لڑکی۔'' وہ ابا کا ہاتھ تھامے دلگیر لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''ہونہہ! ایک بار پھر وہی تکرار۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے باہر آ گئی۔ شام ہو رہی تھی۔ درختوں پہ واپس آتی چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ فضا میں ہلکی سی گرد تھی اور سورج کی لالی درختوں کے آخری سروں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا۔ بے زاری حد سے سوا ہوئی تو لمبے بانس کا ڈنڈا لے کر اس نے سارا غصہ آم کے درخت پر نکالا۔ ٹپاٹپ، بے شمار کیریاں یہاں وہاں گرتی رہیں۔

کاکا جان کمرے سے چیخنے لگے۔

''کیوں رزق کی بے حرمتی پہ تلی ہو۔ سارا پھل پیروں تلے آئے گا۔ ارے کچا پھل کس کام کا، ایسی بربادی۔''

اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بہت سی کیریاں گرا چکی تو چڑیوں کی دشمن ہو گئی۔ چھٹاک، چھٹاک۔۔۔ درختوں کی شاخوں پہ ڈنڈا مار کر سب چڑیوں کو اڑا ڈالا۔ بہت سے پتے ڈالیوں سے ٹوٹ کر زمین پہ آ رہے۔ اس درجہ بدتمیزی پر کاکا جان اور کتنا خاموش رہ سکتے تھے۔ زور سے دھاڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے تو وہ ڈر کے مارے سب چھوڑ چھاڑ بھاگ کر کمرے میں جا چھپی۔ چارپائی پہ گر کر تکیے میں منہ چھپا لیا۔ بہت دیر تک بے آواز آنسو بہاتی رہی پھر ہلکی سی جھپکی آ گئی۔

آنکھ کھلی تو کمرہ تاریک تھا۔ کچھ دیر کسلمندی سے پڑی رہی پھر مجبوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔ برآمدے میں زیرو پاور بلب روشن تھا اور اس سے پرے آنگن کی ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کاکا جان دوسرے کمرے میں ابا کو کھچڑی کھلا رہے تھے۔ وہ دانستہ چپل گھسیٹتے ہوئے کمرے کے سامنے سے گزری تا کہ ان کے موڈ کا اندازہ ہو سکے مگر وہ دروازے کی طرف پشت کیے بدستور اپنے کام میں مصروف رہے تھے۔

وہ بددل ہو کر باورچی خانے میں آ گئی۔ کیریوں سے بھری ٹوکری سامنے دھری تھی۔ اس نے چند کیریاں چھیل کر چٹنی بنائی۔ آٹا گوندھ کر روٹی بنانے تک وہ ساری ناراضی بھول کر شرمندہ ہوتی رہی۔

''افوہ۔۔۔ کیا جن بھوتوں کی طرح آفت مچائی تھی میں نے۔ حد ہو گئی بھئی۔'' اسے خود پہ کاکا جان والا غصہ آیا تھا۔ اسی کشمکش میں آخری روٹی جل گئی تھی۔ اسے اپنے لیے رکھ کر باہر جھانکا۔ کاکا جان چارپائیاں آنگن میں بچھا رہے تھے۔ وہ باورچی خانے میں بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی پھر خود ہی کھانا تیار کر کے باہر آئی تو وہ چارپائی پہ چت لیٹے تھے۔ ابا ساتھ والی چارپائی پہ لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔

چاند غائب تھا، چاروں اور مکمل تاریکی، ہلکی ہلکی ہوا کلیوں کی نوخیز مہک سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''کاکا! کھانا۔'' وہ پائنتی پر بیٹھ گئی۔

وہ چند لمحے اندھیرے میں اسے دیکھتے رہے پھر چنگیر اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

''تم بہت بدتمیز ہو گئی ہو بٹو!'' ان کے لہجے میں شکایت تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ وقت یونہی گزرا پھر یکدم ہاتھ بڑھا کر قریب سے گزرتے جگنو کو مٹھی میں لے لیا۔

''کاکا معاف کر دیں۔'' اس نے جگنو ان کے بالوں میں چھوڑ کر دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

''پگلی۔'' کاکا جان خوش دلی سے ہنس دیے۔

ماورا کو لگا وہ ایک جگنو ہزار جگنوؤں میں بدل کر اس کے آس پاس منڈلانے لگے ہیں۔

☆☆☆

زمین سے آسمان تک پھیلے خلا میں وہ تنہا بیٹھی تھی۔ اتنی تنہا کہ آس پاس بکھرے لوگوں کا وجود اس کے لیے کہیں بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں کی بہت سی باتیں، بہت سی آوازیں اگر تھیں بھی تو اسے سنائی نہ دے رہی تھیں۔ ایک مہیب خاموشی تھی جس میں اس کا وجود بہت ہولے ہولے تیر رہا تھا۔ ہاں، واحد احساس

جواس کی رگوں میں ایک خوشبو سی دوڑا کر اسے تازہ دم کر رہا تھا، ننگے پیروں تلے شبنم میں بھیگی گھاس کی ٹھنڈک کا احساس تھا۔ یونیورسٹی کے سبزہ زار میں بینچ سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے وہ بڑی فراغت سے بیٹھی تھی۔ تبھی ہولے سے کوئی سرسراہٹ اس کے بہت ہی قریب اُبھری۔ کوئی انجانی سی مہک، نامعلوم سا احساس۔ اس کی پلکیں لرز کر ایک دوسرے سے ذرا سی جدا ہوئیں تو سب سے پہلی نگاہ گود میں پڑے گلاب کے پھول پر جا کے رکی تھی۔ کھلا ہوا بے حد سرخ پھول۔

اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔

بائیں طرف کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بہت اطمینان سے اس کے برابر بیٹھا تھا۔ اس سے نگاہ ملتے ہی وہ ایک خوبصورت اندرونی حصار جو بہت دیر سے اسے اپنے گھیرے میں لیے بیٹھا تھا، یکلخت ہی ایک چھناکے سے ٹوٹ سا گیا تھا۔ اپنے حواسوں میں واپس آنے میں اسے بس چند لمحے لگے تھے۔ ایک بار پھر گلاب کے پھول کو اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے کر وہ کچھ حیران اور کچھ پریشان ہوئی تھی۔

''یہ۔۔۔؟'' پھول اٹھا کر اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جس کے لبوں پہ ٹھہری مبہم مسکراہٹ گویا اس کی رنگ بدلتی کیفیات سے محظوظ ہونے کی دلیل تھی۔

''یہ آپ کے لیے ہے۔'' بڑا ہی پُرسکون انداز تھا۔ ماورا نے کتنے ہی پل اسے دیکھنے اور سمجھنے میں لگا دیے تھے۔ بہترین لباس، چمکدار چہرہ اور آنکھوں سے چھلکتی بشاشت۔ وہ یقیناً کسی امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

''میرا نام ہارون اسرار ہے۔'' اسے پوری طرح اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے تعارف کرایا۔ ماورا نے ایک طویل سانس لے کر نگاہوں کا زاویہ بدلا۔

''تمہارے تعارف کے لیے بس اتنا ہی کافی ہوتا کہ تم ایک مرد ہو، خوشحال مرد۔ نام کوئی بھی ہو سکتا ہے مگر کام۔۔۔؟'' استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سوچا اور پھول کی پتیوں کو اپنی پوروں سے چھو کر اس کی نرمی محسوس کرنے لگی۔

''میں فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں اور۔۔۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

''اپنی دولت اور حسن کا خراج وصول کرنے کے لیے مجھ جیسی لڑکیوں کو چارہ ڈالنا۔۔۔'' اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے پیروں میں جوتا پھنسایا۔

''میں آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں۔'' وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آیا۔

''انداز ماہرانہ، طریقہ بوگس۔۔۔ وہی روایتی جملے بازی جن کے بارے میں کبھی صرف افسانوں میں پڑھا کرتے تھے۔ درس گاہ کو بھی اپنی تفریح کی جگہ سمجھ لیا ہے انہوں نے۔'' وہ عجب اکتاہٹ سی محسوس کرتے ہوئے اپنا بیگ اور فائل اٹھانے لگی تھی۔

''میں نے آپ کا نام۔۔۔'' اس کے دوبارہ بولنے پر وہ کچھ دیر کو ٹھہری۔

''نام کے بعد چائے یا کولڈرنگ کی آفر، پھر دوستی کی پیشکش، پھر تحفے تحائف کا تبادلہ، چند روز عیاشی اور پھر تو کون، میں کون؟'' طنزیہ انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم مجھے فلرٹ سمجھ رہی ہو؟'' اس کی روشن آنکھوں میں حیرت اور غصہ ایک ساتھ چھلکا ہوا تھا۔

''اس کے بعد میں تمہیں اور کیا سمجھ سکتی ہوں۔''

گلاب کا پھول اس کی نگاہوں کے سامنے لہرا کر بینچ پر پھینکتے ہوئے وہ پلٹی تو ایکدم ہی اس کا ہاتھ تھام کر روکتے ہوئے وہ اس کے مقابل آ گیا تھا۔

''دیکھو، تم اس طرح۔۔۔''

ایک لمحے کے لیے ماورا کا سارا جسم سُن ہو گیا تھا۔

اگلے ہی پل کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اس نے بجلی کی سی تڑپ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''اپنی حد میں رہو، ورنہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔'' کپکپاتی آواز میں اس نے بمشکل کہا اور پھر بھاگتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ وہ اس سے دور ہوتی گئی۔

ہارون اسرار حیرت کی انتہا پہ کھڑا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا کہ اس نے کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہو اور وہ لڑکی اس سے یوں ناراض ہو گئی ہو۔

☆☆☆

وہ وقت سے پہلے گھر آ گئی تھی۔ لکڑی کا دروازہ بجاتے بجاتے اس کے ہاتھ سرخ ہو کر دُکھنے لگے تھے۔ دھوپ کی شدت اور انتظار کا یہ عالم کہ بند دروازے سے سر پھوڑنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بہت دیر بعد دروازے کے دوسری طرف قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ کھلا تو کاکا اجڑے بالوں، سرخ آنکھوں سمیت حواس باختہ سے سامنے کھڑے تھے۔

''تم اس وقت۔'' یونیورسٹی کے بعد لائبریری میں اچھا خاصا وقت لگا کر آیا کرتی تھی، سو ان کی حیرت جائز تھی۔

وہ بغیر کچھ کہے اندر آ گئی۔

کاکا جان نے ایک بار پھر کریدا۔

''خیریت تو ہے نا، یوں بے وقت کیسے آ گئیں؟''

''بس یونہی۔ ذرا گرمی سی محسوس ہو رہی تھی اور سر میں درد بھی ہونے لگا، اس لیے جلدی واپس آ گئی۔'' اس نے سوچ سمجھ کر بہانا بنایا۔ وہ بھی شاید کچی نیند سے اٹھ کر آئے تھے، فوراً ہی ٹل گئے۔

''کہا تو تھا، ٹھنڈی چیزیں کھایا کرو۔ وہ شہتوت کا سارا پھل یونہی مٹی میں رُل جاتا ہے۔ آج ہی پنہ بچھا دیتا ہوں۔ کل تک شہتوت اکٹھے کر کے شربت بنا دوں گا۔ گرمی کو پاس پھٹکنے نہیں دے گا۔'' وہ جواب میں کچھ نہ بولی تھی۔

کاکا باہر نکل گئے، تب ایک لمبا سا سانس کھینچ کر وہ چارپائی پہ گر گئی۔

کچھ دیر یونہی چھت پہ نگاہ ٹھہری رہی پھر اچانک وہ اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر بغور اسے دیکھنے لگی۔

کچھ بھی نہیں تھا مگر نجانے کیوں پانچ دہکتی ہوئی انگلیوں کا لمس جیسے اس کے ہاتھ پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔

بمشکل دو کلاسز لے پائی تھی وہ اور اس سارے وقت میں اس کی نگاہ بار بار پھسل کر اپنے ہاتھ کی پشت پر جا رکتی تھی۔ لیکچر کا ایک لفظ بھی سماعتوں میں نہ پڑا تو وہ بےزار ہو کر گھر چلی آئی۔

"یہ عجیب مصیبت ہے۔" وہ آنکھوں میں نمی لیے اٹھ بیٹھی۔
"اپنی وقت گزاری کے لیے دوسروں کی جان عذاب میں ڈال دو۔ کسی کی پل بھر کی تفریح، لمحے بھر کی عیاشی اور کسی کی جان کا روگ۔" وہ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔
"اللہ کرے آج کے بعد کبھی اس کی شکل دکھائی نہ دے۔" اس نے دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی جانے کو تیار تھی، پر نجانے کیوں سستی دکھا رہی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد یونہی کتنی دیر تک وہ ٹہلتی رہی۔ درختوں کی شاخوں پہ ادھر سے اُدھر اڑتے ہوئے پرندے اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ وہ پھرتی پھراتی کلیوں کے جھنڈ کے پاس آ گئی۔ خوب کھلی کھلی سی کلیاں توڑ کر آنچل بھرا اور حوض کے کنارے آ بیٹھی۔ ایک ایک کر کے بہت ساری کلیاں حوض کے پانی پہ تیرنے لگی تھیں۔ اس بے معنی سے کھیل میں نجانے کیوں اتنا مزہ آ رہا تھا۔ گول گول گھومتی ہوئی کلیاں، کبھی دائرہ بنتا، کبھی ٹوٹ جاتا۔ اس کھیل سے اکتائی تو باقی کلیاں لے کر ابا کے پاس چلی آئی۔ کاکا کی مدد سے نہانے دھونے کے بعد خوب تازہ دم ہو کر وہ تسبیح کر رہے تھے۔ ماورا نے آنچل ان کے سامنے پھیلایا تو انہوں نے مٹھی بھر کلیاں اٹھا کر سینے پہ پھیلا لیں۔ کاکا جان کیاریاں درست کرتے ہوئے بڑی دیر سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ معمول سے زیادہ وقت ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
ماورا روش پہ چلتے چلتے ایک دم پلٹی تو کاکا بیگ لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔
"آؤ تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آؤں۔" وہ اس کے گریز کی وجہ نجانے کیا سمجھ رہے تھے۔ ماورا ذرا سا ہنس دی۔
"میں چلی جاتی ہوں کاکا!" اس نے بیگ ان سے لیا اور دروازے سے باہر آ گئی۔ کاکا جان دروازے میں کھڑے بہت دیر تک اسے سست قدم اٹھاتے دیکھتے رہے اور تب ہی پلٹے، جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
یونیورسٹی تک کا سارا سفر اس نے بہت بے دلی سے طے کیا تھا۔
"مجھے آج آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ ایک طویل سانس کھینچتی پوائنٹ سے اتری تو حسب معمول کوئی قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے حیران تو ہوئی مگر سر جھکاتے چلتی رہی۔
"اسے دیر ہو گئی تھی یا اتنا وقت انتظار میں برباد کیا؟" یہ سوال بڑے شریر سے انداز میں نگاہوں کے سامنے ناچا۔
ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ خود بخود آ رکی تھی، دل میں گہرا اطمینان۔ ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
سیاہ پینٹ، اخروٹی رنگ کی شرٹ، سلیقے سے بنے ہوئے بال۔
کاکا کے پاس ہمیشہ ملگجے سے شلوار قمیص میں آیا کرتا تھا۔ بے ترتیب بال کنگھی سے بے نیاز، بس بات کرتے کرتے انگلیوں سے بال سنوار لیا کرتا تھا۔ پیروں میں ایک بدرنگ سی چپل ہوتی اور بس۔ یونیورسٹی میں ہمیشہ بِک سِک سے درست ہو کر آتا تھا۔ ماورا ہر بار ہی دیکھ کر چونک جایا کرتی۔ جب سے

وہ یونیورسٹی آنے لگی تھی، دیر سویر بھی ہو جاتی تو پوائنٹ سے ہمیشہ اس کے ساتھ ہی اترا کرتا تھا۔ خدا جانے کب اور کس وقت سوار ہوتا تھا۔ ماورا کو کبھی خبر نہ ہو سکی تھی۔ بغیر کچھ کہے، بولے وہ چپ چاپ برابر برابر چلتے رہتے۔ ڈپارٹمنٹ میں پہنچ کر وہ اپنی کلاس میں داخل ہو جاتی، تب وہ راستہ بدل لیتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کبھی چڑتی، کبھی کلاس فیلوز کی معنی خیز نظروں سے خائف ہوتی مگر آج اس کے ساتھ چلنا برا نہیں لگا تھا۔
"چلو گھر سے باہر بھی نکلوں تو کوئی تو ہوتا ہے نا آس پاس۔" دل میں دوسراہٹ کا احساس جاگزیں ہوا تو موڈ خود بخود درست ہو گیا تھا۔
"سلیم! آج مجھے سینٹرل لائبریری جانا ہے۔"
ڈپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے گھڑی بھر کے لیے رکتے ہوئے کہا تھا۔
"میں تھرڈ پیریڈ میں آ جاؤں گا۔" سلیم نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر احمد ضیاء کا لیکچر حرف بہ حرف نوٹ کرتے ہوئے اسے اپنے اطراف میں بڑھتی ہوئی تاریکی کا قطعاً احساس نہ ہوا تھا۔ آس پاس کی دبی دبی سرگوشیوں پر توجہ اس نے نہ پہلے کبھی دی تھی، نہ اس وقت دی۔ غیر معمولی صورت حال کا ادراک اسے اس وقت ہوا تھا جب بند دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور لڑکیوں کے منہ سے چیخوں کی دبی دبی آواز نکلی۔ گرد آلود ہوا کا تیز جھونکا پل بھر میں کمرے کے کونے کھدروں تک جا پہنچا تھا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا اور پھر دم بخود رہ گئی۔ موسم کا اعتبار کبھی بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا موسم۔ اس کا دل سکڑ سمٹ کر سینے کے نجانے کس گوشے میں جا چھپا۔
پروفیسر صاحب نے موسم کے تیور دیکھ کر "انجوائے یور سیلف" کا نعرہ لگایا اور کلاس سے باہر لڑکے ہو ہا کرتے ان سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ وہ فائل سینے سے لگائے لڑکیوں کے جمگھٹے میں باہر نکلی مگر کوریڈور سے باہر آتے ہی اس کے سارے حوصلے جواب دے گئے۔ اس کی اولین خواہش اس لمحے گھر پہنچنے کی تھی۔ دم بہ دم بڑھتی ہوئی ہولناک تاریکی میں بادلوں کی ہیبت ناک گرج چمک۔ آندھی کے زور سے ٹل کر چنگھاڑتے ہوئے طویل قامت درخت۔ لڑکیوں کے چہرے پہ پھیلتا خوف و ہراس، کوریڈور کے ستون سے لگی وہ زرد چہرے کے ساتھ ہولے ہولے کانپتی رہی۔ سینے پہ بندھے بازوؤں میں فائل یوں جکڑ رکھی تھی کہ انگلیوں کی پوریں سفید ہو رہی تھیں۔ آسمان سے پانی کی تیز بوچھاڑ زمین پہ اتر آئی تھی۔ ہوا کے زور سے سفیدے کے درخت کا کوئی ٹہنا چیخ کر زمین پہ آ رہا تو بیسیوں منچلوں کی زوردار مصنوعی چیخوں نے ماحول کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی مگر اسی پل نجانے کس طرف سے لڑکے لڑکیوں کا ایک بڑا سا گروپ بارش سے بچتا بچاتا کوریڈور میں آ گیا۔ ان کی دھکم پیل سے وہ لڑکھڑائی تو پیچھے ہٹتے ہٹتے کلاس روم کے دروازے تک آ گئی۔
"یا اللہ۔" بجلی کڑکی تو اس کا رہا سہا دم بھی نکل گیا۔ بمشکل لڑکھڑاتی ہوئی وہ کلاس روم میں داخل ہوئی اور پہلی کرسی پر گر گئی۔
"ابا۔۔۔ کاکا جان۔۔۔" اس کی سرگوشی سسکی بن کر لبوں سے خارج ہوئی تھی۔ بچپن سے یہ موسم اسے خوف کی انتہائی بلندیوں پر لے جا کھڑا کرتا تھا۔ ذرا بڑی ہوئی تو لرزتے کانپتے دل کے ساتھ گھٹنوں

میں سر دیے روتی رہتی۔ اب بھی آنسو ایک قطار میں آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''یا اللہ! آندھی رک جائے، بارش ختم ہو جائے، میں گھر پہنچ جاؤں۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے گڑگڑا رہی تھی۔ یہ طوفان ایک آدم خور اژدھا تھا جو اس کے آس پاس پھنکار رہا تھا۔

''خوف زدہ ہو؟'' مردانہ آواز اتنے قریب سے ابھری تھی کہ ایک پل کے لیے اس کے دل کی دھڑکن بھی ساکت ہو گئی تھی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھے بغیر ایک چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

''تم تنہا تو نہیں ہو، نہ ہی کھلے آسمان تلے کھڑی ہو پھر اتنی خوفزدہ۔'' اس نے تمام قوتیں مجتمع کرتے ہوئے بمشکل سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ طویل قامت عین اس کے سامنے سینے پہ بازو باندھے کھڑا تھا۔ انداز بہت دوستانہ، لہجہ اپنائیت بھرا۔ یوں جیسے برسوں کا شناسائی ہو۔

سختی سے دانت بھینچتے ہوئے، سر جھکا کر اس نے دل سے سلیم کی آ جانے کی دعا کی تھی۔

''میں سمجھتا تھا تم بہت بہادر ہو مگر۔۔۔''

''ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔'' اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی۔

وہ ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا۔

''تم نے اس روز بھی میری پوری بات نہیں سنی تھی۔''

''میں نہیں سننا چاہتی۔''

''کیوں؟''

''تم جانتی ہو، میں کتنے دنوں سے۔۔۔'' وہ پنجوں کے بل اس کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ کوئی کھلی کھڑکی ایک دھماکے سے بند ہوئی تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہارون اسرار سر جھٹک کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

''انسانوں سے بھی ڈرتی ہو اور موسموں سے بھی۔ کوئی دوست نہیں تمہارا۔ کسی سے بات کرنا تمہیں پسند نہیں۔ ماورا! کس بستی سے آئی ہو تم؟'' وہ پلٹ کر اس سے پوچھنے لگا۔

''یہ میرے نام سے واقف ہے۔'' اسے اپنا ساکت وجود بے حد کمزور محسوس ہوا۔

''اور وہ احمد کیانی! اسے تم کسی مخل کی۔۔۔'' وہ نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

دھواں دھار بارش کا شور، کورس میں گانے کی آوازیں۔

وہ بہت کچھ کہہ رہا تھا اور ماورا کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ اسے دیکھتی رہی۔

''فلرٹ کرنے کے لیے میرے سرکل میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔ مجھے محض وقت گزاری کے لیے، عیاشی کے لیے تمہاری کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ اور ہے ماورا! جو مجھے تمہاری جانب کھینچتا ہے۔'' وہ دروازے کے کھلے پٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''فار گاڈ سیک۔ چپ کر جاؤ، یہ سب جھوٹی باتیں۔ اوہ خدایا۔۔۔'' اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے تھے۔

''میں نے کبھی دانستہ تمہیں نہیں سوچا۔'' وہ دو قدم آگے بڑھا۔

''نہ ہی میں جان بوجھ کر تمہارے راستوں میں آتا ہوں۔ یہ سب میرے لیے ایک نئی چیز ہے۔

میں خود نہیں جانتا، میں گھنٹوں لائبریری میں کیوں بیٹھا رہتا ہوں۔ تمہیں دیکھنے کی خواہش کیوں مجھے اپنے دوستوں سے بھی بے زار کر دیتی ہے۔ میں ایسا تو نہیں تھا پھر۔۔۔''

''خربوزے لے لو، خربوزے۔'' کوئی پاٹ دار آواز دروازے کے بے حد قریب اُبھری تھی۔

زرد لباس پہنے ایک لڑکی بے تحاشا ہنستی ہوئی کلاس روم میں آئی تو ان دونوں کو دیکھ کر ایک پل کے لیے سنبھلی اور پھر سامنے کھڑکی میں جا بیٹھی۔ اس کے پیچھے ایک اور گروپ اٹکھیلیاں کرتا کمرے میں آیا تھا۔

کہہ رہا ہے دل او جاناں

بے ہنگم آوازیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ ہارون اسرار لب بھینچے کھڑا تھا اور مجرمانہ انداز میں سر جھکائے۔

''کس نے کیا دیکھا اور کیا سوچا ہوگا؟'' وہ بُھر بُھری مٹی کی طرح ڈھے جانے کو تھی، جب ہارون اسرار کے عقب سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ متلاشی نگاہوں میں بے قراری تھی۔

''سلیم!'' اس کے وجود میں جیسے کوئی نئی روح پھونک دی تھی اس کی آمد نے۔ اسے پکارتے ہوئے وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔

''کہاں تھے تم۔۔۔ کتنی دیر سے۔'' اس کی آواز رُندھ گئی۔ کچھ بولا ہی نہ گیا تو اسی تیزی سے وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

''بارش ہی رکنے میں نہ آ رہی تھی۔ اب ذرا کم ہوئی تو میں بھاگم بھاگ۔۔۔''

''یہاں نہیں، آگے چلتے ہیں۔'' ماورا نے اسے وہیں کھڑے ہوتے دیکھ کر اس کی بات کاٹی۔

''ابھی بارش تیز ہے، ہم گھر نہیں جا سکیں گے۔''

سلیم کو اس کی جلد بازی پر حیرت ہوئی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے کوریڈور کے آخری سرے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

بارش کا زور پہلے سے ٹوٹ چکا تھا۔ تاہم تیز ہوا کے ساتھ آتی بارش کی بوچھاڑ اسے بھگوئے دے رہی تھی۔ اسے پہلے کی طرح ڈر نہیں لگا۔ اس طوفان سے زیادہ خطرناک طوفان وہ تھا جسے وہ اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

''تم بہت دیر سے آئے تھے سلیم! مجھے اس سے بہت ڈر لگنے لگا تھا۔'' اس کی مدھم آواز سلیم بمشکل سن پایا تھا۔

''کس سے؟'' سلیم نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا تو وہ ایک پل کے لیے چونک گئی۔

ہارون اسرار کی تیز نگاہوں نے جس سرعت سے سلیم کو جا لیا تھا، وہ ماورا سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز، ماورا کو بے اختیار جھرجھری سی آ گئی۔

''کس سے ڈر لگ رہا تھا ماورا!'' سلیم دوبارہ پوچھنے لگا۔

''موسم سے۔'' بارش کا کڑوا پانی آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

☆☆☆

سلیم اسٹاپ سے گھر تک اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھا تو سلیم کو اندر آنے کی

آفر کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی وہ غائب دماغی سے اندر داخل ہوئی۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی مگر باریک بوندوں کی شکل میں۔ روش اور اس کے برابر سبز قطعے بارش کے گدلے پانی تلے چھپ چکے تھے۔ وہ معمول سے دو ڈھائی گھنٹے لیٹ آئی تھی مگر یہاں انتظار کی وہ بے چینی نہ تھی جو اس کے خیال میں ہو سکتی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی بہت بہتر تھا۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں وہ بہت کچھ سوچ کر اتنا ہلکان ہوئی تھی کہ اب کسی کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی تھی۔

یہ ہلکی پھلکی بارش بھی اسٹاپ سے گھر تک اسے پوری طرح بھگو چکی تھی، اس لیے بغیر کسی تکلف کے کھڑے پانی میں چھپاک چھپاک قدم رکھتی وہ برآمدہ عبور کر کے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ دروازہ بند کر کے، گیلے کپڑوں سے چھٹکارا پا کر وہ چارپائی پہ گر گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ جسم سرد ہو رہا ہے۔ ذرا سی دیر کے بعد ہلکی سی کپکپی طاری ہونے لگی تو نہ چاہنے کے باوجود اس نے اٹھ کر الماری سے چادر نکالی اور اپنے اوپر ڈال کر لیٹ گئی۔

''نہ سلام کیا نہ کلام اور آ کر یہاں پڑ گئی۔ کاکا جان بھی کیا سوچیں گے، یہ نہ ہو میری تلاش میں اسٹاپ تک ہی جا نکلے ہوں۔ ابا کو بھی شکل نہ دکھائی۔ بے چارے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' غنودگی میں جاتے جاتے اس کے دماغ نے غوطہ کھایا تو چادر ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔

''آہ۔۔۔'' بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دماغ میں کیا کھچڑی سی پک رہی تھی، رہ رہ کر کچھ یاد آ رہا تھا۔ کوئی ادھورا فقرہ، کوئی مکمل بات۔ دھواں دھار بارش کے شور میں اس کا مدھم لہجہ، گیلی مٹی کی خوشبو رچی بسی کسی قیمتی پرفیوم کی مہک۔

اس نے سر جھٹک کر جیسے ایک ایک پل کو بھول جانے کی کوشش کی۔

''کس مشکل میں ڈال رہا ہے یہ مجھے۔ نجانے کون ہے، کیا چاہتا ہے۔'' وہ چارپائی سے اتر کر اپنی چپل ڈھونڈنے لگی۔

''ہاہ۔۔۔ اکیسویں صدی میں محبت کی باتیں کرتا ہے، انجانے جذبوں کا شکار۔ معلوم نہیں خود بے وقوف ہے یا مجھے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' اس نے سیاہ انگوٹھے کی چپل پیروں میں پھنسائی۔

''ایسا نہ ہو پہلی ملاقات کا بدلہ لے رہا ہو۔ سختی سے بولی تھی۔ اگر کبھی کوئی بدتمیزی کر ڈالی تو۔۔۔''

وہ بری طرح فکر میں گھری تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی پہلی شکل کاکا جان کی دکھائی دی۔

''آ گئی ہو بٹو! جاؤ باورچی خانے میں، کھانا کھا لو۔'' ان کا انداز عجلت بھرا تھا۔ اتنا کہہ کر باہر کو لپکے تو وہ حیرت سے انہیں دیکھتی باورچی خانے میں آ گئی۔

''خبر نہیں، کن چکروں میں ہیں۔ بھول ہی گئے کہ بٹو اتنی دیر سے گھر آئی ہے۔ شدید موسم کا شکار، کیسے پہنچی، کب آئی؟'' وہ تو ہزاروں سوالوں کا جواب دینے کو تیار تھی مگر یہاں تو پرواہی نہ تھی۔

وہ باورچی خانے میں آ گئی۔

صبح ناشتے کے بعد اب شام ہو رہی تھی کہ وہ کچن میں آئی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی، سو دل نہ چاہنے کے باوجود چند لقمے تو کھانے ہی تھے۔ اس نے مختلف برتن اٹھا کر دیکھے۔ سب کے سب خالی، دوپہر کا بچا کھچا بھی نہ تھا۔ اسے حیرت کے ساتھ قدرے پریشانی بھی ہوئی۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ کاکا گھر میں

کوئی دال، سبزی بگھار کر چاول ابال لیا کرتے یا چپاتی ڈال لیا کرتے تھے پھر آج۔۔۔؟

اسے ایکدم ہی ان کا پریشان سا چہرہ نظر آیا پھر نجانے جی میں کیا آئی کہ لپک کر ابا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ دھیان آیا کہ باورچی خانے میں دلیے کا پیالہ جوں کا توں دھرا ہے۔

''صبح سے اب تک کھایا کیوں نہیں؟ یا اللہ طبیعت ٹھیک ہو ان کی۔'' کمرے کا بند دروازہ ٹھک سے کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو ابا اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ابا! آپ ٹھیک تو ہیں نا، اس طرح کیوں لیٹے ہیں۔'' وہ عجلت میں ان کی طرف لپکی مگر ان کی نظریں بدستور دروازے پر جمی تھیں۔

''ابا!'' اس نے قریب ہو کر ان کا بازو ہلایا۔

ساکت پلکوں میں ذرا جنبش نہ ہوئی تھی، لب خاموش، وجود ساکت۔

''ابا!'' اس نے قدرے بلند آواز سے پکارتے ہوئے زور سے انہیں جھنجوڑا مگر حرکت مفقود تھی۔ کسی انہونی کے ادراک کا چابک دل و دماغ پر لہرایا تو وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔ تب اسے احساس ہوا۔ ابا کے چہرے پر زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ پیلی پھٹک رنگت، آنکھوں کی پتلیاں جامد۔

''نہیں۔۔۔ میرا وہم ہے، دھوکا ہے۔'' وہ الٹے قدموں باہر کو بھاگی تو اندر آتے کاکا جان سے ٹکرا گئی تھی۔ ایک زوردار چیخ اس کے لبوں سے خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر کمرے سے باہر آ گئی۔

''کاکا۔۔۔ ابا۔۔۔ میرے ابا۔۔۔'' اس نے بے یقین لہجے میں انہیں کچھ بتانے کی کوشش کی۔

''صبح سے طبیعت خراب ہے بھائی جان کی، یہاں شور مت کرو۔'' کاکا نے قدرے پریشان لہجے میں اسے ڈانٹ دیا۔

''نہیں کاکا۔۔۔ ابا۔۔۔ آہ۔۔۔'' اسے لگا روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

کاکا جان نے از حد حیرت سے اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔

''کیا ہو رہا ہے تمہیں؟''

''ابا مر گئے، مجھے لگتا ہے ابا مر گئے۔'' ٹوٹی پھوٹی سانسوں میں اس نے بہت مشکل سے کہا۔

''کیا۔۔۔؟ پاگل ہوئی ہو کیا۔'' کاکا دھاڑتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگے۔

وہ برآمدے میں سینے پہ ہاتھ رکھے جھکتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ ہے تو اسے سانس کیوں نہیں آ رہی۔ زور زور سے سینے میں دم توڑتی سانس کو کھینچتے ہوئے وہ گرتی پڑتی کمرے کی طرف بھاگی کہ کاکا جان کی دلدوز چیخوں نے اس کے سارے واہموں، خدشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ وہیں گھٹنوں کے بل فرش پہ گر گئی۔

''آہ۔۔۔ بھائی جان۔۔۔ ماورا! بھائی جان مر گئے، ماورا! بھائی جان مر گئے۔'' وہ اپنا سر پیٹتے باہر آئے۔ ماورا کو لگا اس کا دل کچلا جا رہا ہے۔

''نہ روئیں کاکا! اس طرح مت روئیں۔'' ڈوبتی آواز کے ساتھ وہ بمشکل چیخی۔ اسے رونا نہیں آ رہا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا اور کاکا جان کے روتے کرلاتے بین اس کا دل بند کر رہے تھے۔

''ہم یتیم ہو گئے بٹو! گھر بکھر گیا۔ ہمارا سایہ چھن گیا بٹو! ہم تنہا رہ گئے۔'' وہ اپنے بال نوچتے نوچتے دیوانے ہو رہے تھے۔

"کوئی ہے۔۔۔ارے دیکھو، ہم ایک بار پھر اُجڑ گئے۔ دل نوچ لیا ہمارا۔" وہ سینہ کوبی کر رہے تھے۔

"کاکا!" وہ پوری قوت سے چلائی۔

کاکا آہ وزاری کرتے بیرونی دروازے تک جا پہنچے تھے۔

"کاکا! مجھے چھوڑ کر نہ جائیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے کاکا! رک جائیں، میرے پاس آجائیں۔ آہ۔ی۔" راہ میں نجانے کس چیز سے ٹھوکر کھائی تھی کہ وہ منہ کے بل کئی قدم آگے جا کر گری۔ جانے چوٹ آئی تھی یا نہیں مگر چاروں جانب پھیلے ملگجے سے اندھیرے پر گھور تاریکی اس طرح غالب آئی تھی کہ پھر اسے کچھ سجھائی نہ دیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔

کتنی ہی دیر تک ایک عجیب و غریب کیفیت نے اسے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ احساسات تک منجمد تھے۔ نہ پوری طرح دکھائی دے رہا تھا، نہ سنائی۔ دماغ کچھ بھی سوچنے سے قاصر پھر رفتہ رفتہ کوئی احساس جاگا۔ چہرے پہ قطرہ قطرہ پانی گر رہا تھا۔ اس نے بمشکل بند پپوٹوں کو حرکت دی۔ آس پاس تاریکی بھی بے حد گہری اور خاموش تھی۔ اس نے اپنے ساکت وجود کو حرکت دینا چاہا تو احساس ہوا اس کے اردگرد بہت سا پانی جمع ہے اور اس پانی میں پڑا اس کا وجود شاید حرکت کرنے سے محروم ہو چکا ہے۔

"کیا یہ کوئی خواب ہے، میں کہاں ہوں؟" اس کا سویا ہوا ذہن بیدار ہونے میں نہ آرہا تھا۔ تبھی کسی چیونٹے نے یکلخت کیاری کے پانی میں ڈوبی اس کی بے جان کلائی پہ اپنے دانت گاڑے تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو رہی تھیں۔ اپنی کلائی مسلتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوپٹہ غائب، چپل ندارد۔

"کیا میں سوتے میں یہاں آگئی تھی۔" اسے کچھ یاد نہ آرہا تھا۔

برآمدے میں اندھیرا تھا۔ صرف ابا کے کمرے میں روشنی تھی اور وہ ان ہی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ برآمدے کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی وہ ذرا سا چونک گئی۔

"ماورا! ہم یتیم ہو گئے۔" صدمے سے چور آہ و بکا فضا میں گونجی تو اس کے وجود میں ہلکا سا چھناکا ہوا۔ یوں جیسے کانچ کی بہت ہی نازک سی چیز زمین پہ گر کر ہزار ریزوں میں بٹ جائے۔ اس چھناکے سے اس کے ذہن پہ چھایا جمود یونہی ٹوٹ کر بکھرا تو ساتھ ہی کوئی روتی کرلاتی آواز سماعتوں میں جاگ اٹھی، وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

کھلے دروازے سے اندر کا منظر واضح تھا۔ ابا دروازے پر نگاہیں ٹکائے وہیں تھے، کچھ بھی خواب نہ تھا، سب کچھ حقیقت تھا۔ بھیانک، بے رحم اور سفاک حقیقت۔

وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر چیخی تو زمین و آسمان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا بھی تو یوں کہ آس پاس کہیں کوئی روشنی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو کم از کم اسے دکھائی نہ دے رہی تھی۔

رات گئے اس کی چیخ و پکار سن کر آس پاس کے چند لوگ وہاں نہ آتے تو نجانے کیا ہو جاتا۔ شاید اس گھر سے انہیں ایک کے بجائے دو لاشیں اٹھانی پڑتیں۔ ڈر، خوف، صدمے سے اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ ایک کونے میں سمٹی وہ پہلے جیسی ماورا لگ ہی نہ رہی تھی۔ آنے والے پوچھ رہے تھے۔

"کسی رشتے دار، دوست، عزیز کا پتا۔۔۔کوئی تو ہو جسے اطلاع کی جاسکے۔" وہ ٹکر ٹکر ان کا منہ دیکھتی رہی۔ کس کا کہتی، کون سا پتا بتاتی۔

"کاکا جان کو ڈھونڈو، وہ کہاں چلے گئے، ان کا پتا چلاؤ۔ وہی سب کچھ تھے، ہر رشتہ ان ہی سے تھا، کہاں کھو گئے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں مجھے تنہا چھوڑ دیا۔" وہ بلک بلک کر روتی رہی۔

کوئی کرن ایسی نہ تھی جو اس کے آس پاس کے بڑھتے ہوئے اندھیروں کو کاٹ سکتی۔ وہ رو رو کر تھک چکی، تب خیال آیا۔

"سلیم۔۔۔مگر اس کا اتا پتا خدا جانے۔" وہ تیز بخار میں پھنکتی گرتی پڑتی اٹھی۔ سلیم کا نام اور ڈیپارٹمنٹ لکھ کر دیا۔

"یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، کاکا جان کے بعد بس اسی سے واقفیت ہے۔"

"میں جانتا ہوں اسے۔ اکثر آتے جاتے دیکھا ہے۔" کوئی ایک وہ چٹ پکڑ کر فوراً روانہ ہو گیا۔

"کاکا جان! خدارا لوٹ آئیے، غیروں کے ہاتھ ابا کو قبر میں ڈالیں گے، میرے آنسو پونچھیں گے۔ کیسا لگے گا کاکا۔۔۔ہم ہمیشہ مل کر روئے تھے، اب کیسے تنہا چھوڑ دیا مجھے آپ نے۔" وہ سسکتی ہوئی ابا کی چارپائی کے پاس آبیٹھی۔

رات سے وہ اس بے جان وجود سے خوفزدہ تھی مگر اب وہ خوف درد میں ڈھل گیا تھا۔ "ابا میرے پیارے ابا۔۔۔کس مفلسی میں دن کاٹے آپ نے اور کس خاموشی سے مر گئے۔ میرا انتظار بھی نہ کیا۔ جاتے سے کچھ باتیں تو کرتے مجھ سے۔" وہ ان کے ہاتھ چوم کر بے آواز روتی رہی۔ وہ لب جن پر ہمیشہ ایک صبر آمیز مسکراہٹ رہتی تھی، بالکل خاموش تھے۔ آنکھیں جو اس سے ہزار باتیں کہتی تھیں، ہر جذبے سے عاری تھیں۔ ان کا کمزور، لاغر وجود جھریوں زدہ نرم ہاتھ اور دکھوں کی گرد سے اٹے سفید بال۔ وہ بار بار آنسو پونچھتی انہیں غور سے دیکھتی رہی۔

"آج کے بعد یہ چہرہ دیکھنا کہاں نصیب ہوگا۔"

کوئی تیز رفتاری سے قدم اٹھاتا قریب آیا تھا۔

"آگیا۔۔۔سلیم آگیا۔۔۔"

ماورا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دل گرفتگی سے ابا کی چارپائی پہ جھکا نم آنکھوں سے بغور ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"جوان! بہت دیر ہو چکی ہے۔ جلد از جلد کفن دفن کا انتظام کرو۔" کسی نے کہا تھا۔

ماورا نے ابا کا ہاتھ بھینچ کر لبوں سے لگالیا۔

☆☆☆

دھوپ اتنی تیز تھی کہ درختوں کی جڑوں کو گرمائے دے رہی تھی۔ ننھی چڑیاں کیاری میں جمع پانی میں پر پھلا پھلا کر نہاتیں اور پھر سے اڑ کر درختوں کی شاخوں میں جا چھپتیں۔ ایک پیاسی چڑیا اپنی پیلی

چونچ کھولے حوض کنارے کھڑی تھی۔ بارش کے پانی کی باس نمی سبز گھاس کی جڑوں میں ابھی بھی موجود تھی۔ روش کے کناروں کی بوسیدہ اینٹیں تیز دھار بارش سے اکھڑی ہوئی تھیں اور روش کے دوسرے سرے پر دروازے کی لکڑی مزید خستہ ہوگئی تھی۔

برآمدے کی سیڑھیوں کے سامنے لگی اینٹوں کے بیچوں بیچ سبزہ خود بخود سر اٹھا رہا تھا۔ سلیم نے تا دیر اس پر نگاہ جمائے رکھنے کے بعد جیسے کسی سوچ کے خاتمے تک پہنچ کر طویل سانس لی اور پھر مڑ کر ماورا کو دیکھنے لگا۔ گزشتہ چند روز سے وہ گونگی بوا کے رحم و کرم پر تھی۔ دن میں وہ خود چکر لگا لیا کرتا، رات کو بوا اس کے پاس سو جاتی۔ ان چند دنوں کی بے خوابی اور بخار نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ گہری سوچ اور تفکر نے آنکھوں کے گرد حلقے سے ڈال دیے تھے۔

''کاکا جان کا کہیں کچھ پتا نہیں چلا۔'' اس نے آزردہ سی چپ کو توڑنے کی کوشش کی۔ ماورا نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

''بہت سے لوگوں سے پوچھا ہے، بہت سی جگہوں پہ گیا ہوں مگر۔۔۔''

''مجھے ڈر ہے، انہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ انہیں خبر تھی کہ ابا کے بعد مجھے ان کی کتنی ضرورت ہے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا سلیم کہ وہ جانتے بوجھتے کہیں چلے گئے ہوں۔'' وہ از حد پریشانی کے عالم میں سر تھامے بیٹھی تھی۔ گونگی بوا کب تک اس کا ساتھ دے سکتی تھیں۔ آج نہیں تو کل وہ ساتھ چھوڑ جائیں، تب۔۔۔؟ وہ بے چین ہو کر پیشانی مسلنے لگا۔

''اگر کاکا جان نہ آئے سلیم! خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن فرض کرو اگر کاکا جان نہ آئے تو میرا کیا ہوگا، میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟'' سو فکر، پریشانیاں اس کی جان سے لپٹی تھیں۔ ہزاروں خدشوں، واہموں نے اسے ہلکان کر رکھا تھا۔

''کیا مجھے دارالامان جانا پڑے گا لیکن میں، میں وہاں کیسے رہوں گی سلیم!'' بے بسی کے شدید احساس نے اسے رلا دیا۔

سلیم چپ چاپ بیٹھا ہونٹ کاٹتا رہا۔ وہ یقیناً اس سے مدد کی خواہاں تھی مگر وہ خود ایک کمرے کو چار لڑکوں میں بانٹ کے رہنے والا۔

''کیا مدد کروں میں اس کی، کیسے۔'' وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھا تھا۔ کاکا جان کے بڑے احسانات تھے اس پر۔ اس گھڑی احسانوں کا بدلہ نہ چکاتا تو احسان فراموش کہلاتا۔

''ماورا! تم میرے ساتھ چلو گی؟''

''آہ۔۔۔'' ماورا کے دل پر خنجر کی طرح لگا تھا یہ جملہ۔ میری کم مائیگی کہ خود اس کے سامنے دستِ سوال دراز کر بیٹھی ہوں۔ اب انکار کی جرأت ہے نہ ردّ کرنے کا حوصلہ۔

''کہاں؟'' اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہے ایک جگہ۔ اس سے بڑھ کر جائے پناہ تمہارے لیے اس وقت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

☆☆☆

بڑے سے بازار کی قدرے تنگ اور تاریک گلی جس کے اوپر دھوپ، بارش اور سردی سے بچنے کے لیے کہیں ترپال، کہیں ٹین اور کہیں سرکنڈوں کی چھت ڈالی گئی تھی۔ اس گلی میں بیسیوں دکانیں تھیں۔

پرچون کی، منیاری کی، دودھ دہی کی، پان کی اور درزیوں کی دکانیں اور ان ہی دکانوں جیسی تیسرے درجے کی انسانی مخلوق اپنے مدقوق چہروں اور زرد آنکھوں سمیت اس کے آس پاس ہنس رہی تھی، بول رہی تھی۔

ماورا کو یکدم سانس لینے میں دشواری سی محسوس ہونے لگی تو ہاتھ میں پکڑے بیگ پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

''لاؤ، یہ مجھے دے دو۔'' سلیم نے آگے بڑھ کر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خود اسی گلی میں چائے والے کی دکان کے ساتھ اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جن پر پہلا قدم رکھتے ہی اس کی ٹانگوں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔

''اس اندھیر نگری کا اختتام جانے کہاں ہوگا۔'' خستہ حال سیڑھیوں پہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گول گول انداز میں گھومتی اوپر کو جاتی سیڑھیاں تاریکی میں غرق تھیں۔

تب ہی اس کے عقب سے دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ اس نے دیوار پر ہاتھ جما کر پلٹ کر دیکھا۔

کوئی لڑکی تھی، دوپٹہ لاپروائی سے گلے میں پڑا تھا، ہاتھ میں دودھ کا برتن پکڑے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتی وہ ان کے برابر سے ہو کر آگے نکلی اور پھر لمحوں میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔ ماورا نے حیرت سے اس لڑکی اور پھر سلیم کو دیکھا جو آخری سیڑھی پہ یقیناً اسی کا منتظر تھا۔

سیڑھیوں کا خاتمہ ڈیوڑھی نما کمرے میں ہوا تھا جس کے فرش پہ پانی —— چھڑکا ہوا تھا اور اس کی نم آلود ٹھنڈک میں دو لڑکیاں کھڑی باآواز بلند قہقہے لگا رہی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ ایکدم ہی خاموش ہوئیں مگر سلیم انہیں مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ماورا اس کی تقلید میں جس کمرے میں داخل ہوئی، وہاں کے نیم تاریک ماحول میں بلب کی زرد روشنی ناکافی لگ رہی تھی۔ کمرے کے دائیں طرف کچھ جستی ٹرنک پڑے تھے، جن پر کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ کچھ کپڑے استری شدہ حالت میں کھونٹی سے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر لکڑی کے سیاہ فریم میں کچھ تصویریں ٹنگی تھیں، جن کے شیشے دھندلا چکے تھے۔ بائیں طرف نواڑی پلنگ پہ ایک عورت بیٹھی اپنے بال بنا رہی تھی۔ باہر کی جانب کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں اور کمرے میں سیلن زدہ سی تنہائی کی باس منڈلاتی پھر رہی تھی۔

سلیم نے اس کا بیگ رکھتے ہوئے اسے ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک میلی سی تپائی پر ٹک گیا۔ وہ عورت کئی لمحوں کی حیرت کے بعد چونکی تو فوراً ہی کنگھا پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بال بکھر کر اس کے سینے پہ آ گئے تھے اور دوپٹہ پلنگ پہ پڑا رہ گیا تھا اور وہ خود ایک عجیب ہی سرخوشی کے عالم میں آگے بڑھی اور دونوں ہاتھوں میں سلیم کا چہرہ تھام کر اپنے کپکپاتے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے تھے۔

ماورا نے از حد حیرت سے اس عورت کو اور پھر بیزاری و اکتاہٹ کے ساتھ سلیم کو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔

''بس ٹھیک ہے۔'' اس نے قدرے رکھائی سے اس عورت کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے۔

"یہ ماورا۔۔۔ کچھ دن یہیں رہے گی۔ بہت ہی شریف اور معتبر گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ پڑھائی کے سوا کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اب مجبوری آن پڑی ہے سو۔۔۔"

وہ اس کی بے بسی و بے چارگی کی کہانی سنانے جا رہا تھا۔

ماورا کے حلق میں نمکین آنسوؤں کا گولہ سا اٹک گیا۔

"کل تک سب کچھ تھا میرے پاس۔۔۔ گھر، سائبان، نگران، محافظ۔۔۔ اور آج۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایک معذور باپ اور ایک بے شناخت سے انسان نے کس قدر مضبوط حصار میں لے رکھا تھا مجھے۔ ابا تو اجل کے سامنے مجبور ہو گئے۔ مگر آپ نے میرے ساتھ کیا کیا کاکا!" گرم گرم آنسو اس کے گال بھگو گئے تھے۔

سلیم دروازے سے باہر نکل گیا اور سلیم جاتے جاتے اسے کچھ کہہ رہا تھا مگر اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

ہاں جب عورت اس کے پاس آ کر بڑی شفقت سے اس کا سر سہلانے لگی۔ کچھ اور لڑکیاں اس کے آس پاس آ کر کھڑی ہوئیں۔ تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زاروقطار رو دی تھی۔ اس کے اردگرد سب لوگ اجنبی تھے۔

اور وہ خود۔۔۔ اکیلی تھی۔

☆☆☆

"پہلے قلم کھو گیا۔۔۔ اور پھر قلمکار، آج بیس دن ہو گئے ہیں کہ کاکا جان کا کہیں کچھ پتا نہیں چلا۔ سلیم اس دن سے سڑکوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے مگر حاصل وصول کچھ نہیں۔ خدا جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ابا کے مرنے کا سانحہ ایسا ہی جاں گسل ہوتا تو سب سے پہلے میں دیوانی ہو کر کہیں کھڑی ہوتی۔ ہاں، کوئی پرانا زخم کھل گیا ہوگا۔ درد بس سے باہر ہوا اور وہ ہوش گنوا بیٹھے۔ ہائے کاکا! کہاں سے ڈھونڈوں آپ کو۔ کیسی چھپر چھایہ تھا آپ کا وجود کہ دھوپ کی ہلکی سی تپش کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ اور اب دیکھیے۔ کہاں آن پڑی ہوں۔۔۔" اس نے بھاری ہوتے سرخ پپوٹوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے اپنی جلتی آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

زمانی بیگم! اپنے پلنگ پہ بیٹھی تھیں۔۔۔ تیسری منزل کے اس کمرے کی بیرونی کھڑکی کھلی تھی۔ باہر آسمان سیاہ تھا اور ہوا تیز۔

رات بہت بیت چکی تھی۔ سو کمرے میں ہلکی سی خنکی بند کمرے میں بھی محسوس ہو رہی تھی شام سے اس حبس زدہ کمرے میں بند ہو کر، پنکھے کے گھر گھر سنتے ہوئے اس نے کوئی ہزار بار ابا اور کاکا جان کے بارے میں سوچا تھا۔ جہاں کہیں سوچ کا سلسلہ ٹوٹتا۔ وہ آنکھیں کھول کر زمانی بیگم کو دیکھنے لگتی۔

وہ دونوں ہاتھ گود میں دھرے بے حد خاموش بیٹھی تھیں۔ اور نگاہیں کھڑکی سے باہر آسمان پر کچھ کھوج رہی تھیں۔

ماورا کو یاد آیا۔ وہ اسے اپنی کہانی سنا رہی تھیں اور انہوں نے کہا تھا۔

"سلیم میرا اکلوتا بیٹا ہے۔" اس نے سنا تھا وہ سن کر سوچ میں ڈوب گئی۔

"آپ نے کہا تھا سلیم آپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔" ماورا کے کہے پر وہ بری طرح چونکیں تو اسے خیال آیا کہ انہوں نے بہت دیر پہلے یہ بات کی تھی اور نہیں معلوم وہ اپنی کہانی کو کس موڑ پر لے جا کر چپ ہوئی

تھیں۔

"ہاں، سلیم میرا اکلوتا بیٹا ہے۔" وہ خود بھی سوچ کے لمبے سفر سے پلٹ کر آئی تھیں۔ جوڑ جوڑ میں تھکن سی محسوس ہوئی تو نیم دراز ہو کر رخ اس کی طرف موڑ لیا۔

"پہلے میں ریڈیو پہ سنگیت کرتی تھی۔ پرانا زمانہ تھا پھر وقت بدلا تو حالات اور زمانے بھی بدل گئے۔ پیٹ پالنے کو نجی محفلوں میں گانے لگی۔ بیٹا سال کا ہوا تو شوہر مر گیا۔ ان دنوں تنہائی سے گھبراہٹ ہونے لگی تو اپنے استاد تفضل حسین کو ان کی بیٹی سمیت اپنے پاس لے آئی، استاد صاحب بوجہ ضعف چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ یہیں ایک کمرے میں چاہنے والوں کو تربیت دینے لگے۔ ایک ہمارے طبلہ نواز کی بیٹی تھی نرگس۔۔۔ ہم دونوں محفلوں میں جاتیں جو ملتا، مل بانٹ کر کھا لیتے۔ پھر استاد صاحب چل بسے۔ ان کی بیٹی بھی میرے پاس نہ رہی۔ تب دو چار لڑکیوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ان ہی سے گوانے لگی۔ سلیم ہمیشہ ہر محفل میں میرے ساتھ جایا کرتا تھا۔۔۔"

"اور سلیم نے ایک مرتبہ کہا تھا، میرے گھر والے دیہات میں رہتے ہیں اور بغرض تعلیم یہاں شہر میں۔۔۔ یا اللہ! لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو کس صفائی سے۔" اس نے کروٹ بدلی اور بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھ لیا۔

"پھر خبر نہ ہوئی سلیم کب بڑا ہو گیا۔ اندر، باہر جانے لگا تو کچھ اچھی بری بھی کانوں میں پڑی ایک روز کہنے لگا۔

"ماں! یہ گانا بجانا چھوڑ دو۔۔۔"

میں ہنس دی اور کہا۔

"جس روز تو کما کر کھلانے والا بنے گا، اس روز چھوڑ دوں گی۔" میں نے تو بات مذاق میں ٹالی تھی۔ مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔ کب وہ آٹھ سے اٹھارہ سال کا ہو گیا۔۔۔ ایک صبح سامان باندھ کر کمرے سے نکلا اور کہنے لگا۔

"ہاسٹل میں رہ کر پڑھوں گا۔ اگر کبھی راہ چلتے ملاقات ہو تو بیٹا کہہ کر مت پکارنا۔۔۔ تجھے ماں کہتے ہوئے شرم آئے گی۔"

وہ کہہ کر چلا گیا۔۔۔ میں بت بنی بیٹھی رہ گئی۔۔۔ دو سال اس شہر سے باہر گزرے۔۔۔ لوٹ کر آیا بھی تو میری دہلیز پہ قدم نہیں رکھا۔ میں نے بھی دل مار لیا۔ خود 'بوبو' بن کر گھر میں بیٹھ جاتی تو جو چار، چھ گھر میں رکھ چھوڑی تھیں۔ انہیں کہاں سے کھلاتی۔۔۔ ایک کی ماں فلم کی ایکسٹرا تھی۔ شوٹنگ کے دوران پہاڑی سے گر کر مر گئی۔ بیٹی روتی دھوتی میرے پاس آ گئی۔ ایک کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ لڑکا یہاں آ کر غائب اور یہ میرے ہتھے لگ گئی۔ دو یتیم خانے میں پلی بڑھی تھیں انہیں وہاں سے نکال کر یہاں لے آئی۔

یہ چاروں شادی بیاہ پہ جا کر گاتی ہیں۔ ماہیے، ٹپے، فلمی گانے۔ اچھے گھروں کی شریف عورتیں خود بلاتی ہیں انہیں۔ غزل کے لیے تہمینہ کو لے کر جاتی ہوں۔ اس کی آواز میں سوز بہت ہے۔ لوگ اپنے اپنے غموں پہ روتے ہیں جس پل وہ گا رہی ہو۔ اس کے لئے ہر شام سسکنے لگتی ہے اور رات آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہے۔ اس بے چاری کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ سُر میں درد نہ جھلکے تو اور کیا ہو۔۔۔ ہاہ۔۔۔ میرے

مالک! کیسے کیسے لوگوں سے بھردی ہے یہ کائنات۔۔۔کیا کیا غم نہیں ملتے دیکھنے کو۔۔۔''

انہوں نے طویل سانس لی اور کروٹ بدل کر چند لمحے بڑبڑاتے رہنے کے بعد خاموش ہو گئیں۔

اس ایک عورت کی کہانی، کئی کہانیوں میں بدل کر رات کے سیاہ سینے پہ کندہ ہو گئی تھیں۔ ماورا چت لیٹی ان کہانیوں کو اپنی نگاہوں سے ٹٹولتی رہی۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' کوئی کانٹا سا دل میں چبھا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

''کسی بہت ہی اپنے کو خود سے کاٹ کر الگ کر دینا۔ اس کے وجود کی مکمل نفی کرنا محض اس لیے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، وہ ہمیں اور ان لوگوں کو پسند نہیں جن کے درمیان ہم رہ رہے ہیں۔''

زمانی بیگم کی گہری سانسوں کی سرسراہٹ کمرے کی خاموشی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر وہیں دہلیز پہ بیٹھ گئی۔

''اور کاکا جان کہا کرتے تھے۔۔۔'' ''تمہارا باپ سیدزادہ تھا۔ اور اس نے شادی اس لڑکی سے کی جو ناٹک کرنے کے لیے شہر شہر گھوما کرتی تھی۔ نتیجتاً گھر کے سب دروازے اس پر بند، ماں نے دودھ نہ بخشنے کی قسم کھالی اور باپ نے اپنی ساری بددعائیں اس کے نام لکھ دیں۔''

''اور ان بددعاؤں نے تاعمر میرے باپ کا ساتھ نبھایا تھا۔'' ابا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تو آنکھ ایک بار پھر بھر آئی۔

''ساری عمر صبر شکر سے کاٹ لی مگر مفلسی کا عالم تو یہ تھا کہ مرتے ہوئے کسی اپنے کا کندھا بھی نصیب نہ ہوا۔'' اس نے نڈھال ہوتے ہوئے اپنا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا دیا۔

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ اس کے سامنے ڈیوڑھی اور چکر کھاتی سیڑھیوں پہ سناٹا دم سادھے پڑا تھا۔

تیسری منزل گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہوا سبک رفتار ہو چکی تھی۔ اور قریب کے کمرے سے ہولے ہولے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔

زمانی بیگم سوتے میں ایک دم ہی اٹھی تھیں۔ ماورا اپنی جگہ پر چونکی اور پھر دروازہ بند کر کے چپ چاپ واپس آلیٹی۔

☆☆☆

سورج کب کا نکل چکا تھا۔ وہ بہت دیر تک اکڑوں بیٹھی زمانی بیگم کے اٹھنے کا انتظار کرتی رہی تھی۔۔۔ اور پھر انہیں بے سدھ دیکھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ برآمدے میں تین چارپائیوں پہ چادروں پہ لپٹے وجود ابھی تک گہری نیند میں غرق تھے۔ وہ چارپائیوں کے درمیان کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ کروٹ بدلتے ہوئے ایک لڑکی نے چادر ہٹا کر ایک پل کے لیے خمار آلود آنکھوں سے اسے دیکھا۔۔۔ اور پھر غڑاپ سے چادر کے اندر غائب ہو گئی۔

سیڑھیوں پہ کسی کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتی برآمدے سے نکل کر چپہ بھر کھلے آسمان تلے آگئی، جسے صحن کہا جا سکتا تھا۔ کافی دیر بعد ایک لڑکی کا چہرہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا۔ گوری رنگت۔۔۔ سیاہ بال اونچے سے جوڑے کی شکل میں باندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی چند آوارہ لٹوں میں اس کا چہرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

پانی سے بھری ہوئی بالٹی بمشکل اٹھا کر ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی تک رکھتے ہوئے وہ بالآخر اوپر پہنچ ہی گئی تھی۔ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر سانس ہموار کرتے ہوئے اس کی نظر ماورا پر پڑی تو فوراً مسکرا کر اس کی طرف آگئی۔

''اٹھ گئیں تم۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ پانی کہیں اور سے لانا پڑتا ہے؟''

''کئی ماہ سے نل خراب ہے۔ مالک مکان کہتا ہے، خود سے ٹھیک کراؤ۔ اور ہمارے لیے یہ زیادہ آسان ہے کہ جا کر دوسری منزل سے پانی لے آئیں۔ آؤ پہلے تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں بعد میں نہا لوں گی۔'' اس نے بالٹی اٹھا کر غسل خانے میں رکھی جس کے دروازے پر صرف پردہ لٹک رہا تھا۔

ماورا اس عنایت پر اس کا شکریہ ادا کرتی غسل خانے میں چلی گئی۔ فارغ ہو کر باہر نکلی تو وہ لڑکی باقی لڑکیوں کو جگانے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ کسی کا پاؤں ہلا کر کسی کی چادر کھینچ کر وہ نہانے چلی گئی۔ ماورا کچھ پل وہاں کھڑی رہی۔ پھر دوبارہ کمرے میں آگئی۔ زمانی بیگم کے جاگنے کے ابھی تک کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ اپنی چارپائی پہ بیٹھ کر یونہی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ تب کافی دیر بعد وہ لڑکی نہا دھو کر گیلے بال جھٹکتے ہوئے آئی۔

''تم میرے کمرے میں آجاؤ۔''

ماورا چپل پہن کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ اس کا کمرا زمانی بیگم کے کمرے سے کہیں بہتر حالت میں تھا۔ پلنگ پہ بچھی چادر ہلکے رنگوں کی، صاف ستھری اور بے شکن تھی۔

''میں ناشتے کا کہہ کر آئی تھی۔ لڑکا آتا ہی ہو گا۔ تب تک تم یہ بسکٹ کھا لو۔'' اس لڑکی نے الماری کھول کر بسکٹوں کا ڈبا نکالا اور پلیٹ میں بسکٹ ڈال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

''میرا نام تہمینہ ہے۔'' وہ آئینے کے سامنے جا کر کنگھی کرنے لگی۔

''یہاں پر دو ہی کمرے ہیں؟'' ماورا نے کسی سوچ کے زیر اثر پوچھا۔

''ہاں۔۔۔''

''باقی لڑکیاں کہاں رہتی ہیں؟''

''میرے کمرے کے علاوہ پورے گھر میں رہتی ہیں۔'' تہمینہ ذرا سا ہنسی پھر کنگھا رکھ کر اس کے پاس آبیٹھی۔

''میرے اور ان کے مزاج میں بہت فرق ہے ماورا! میرے لیے ان کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔ اس کمرے کے بدلے مجھے ان تینوں کے برابر کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔''

ماورا کے حلق میں پہلا بسکٹ ہی پھنسنے لگا۔

''اس ڈربے میں تمہاری گنجائش کہاں نکلے گی ماورا؟'' اس نے بے بسی سے سوچا اور پلیٹ پرے کھسکا دی۔

تہمینہ نے کچھ کہے بغیر اس کے اترے اترے چہرے کو دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنی کچھ چیزیں سمیٹنے لگی۔

تب ہی باہر سے کسی نے آواز لگائی تھی۔ ماورا بری طرح چونکی جب کہ تہمینہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

واپس آئی تو ایک ٹرے میں حلوہ پوری اور چنے کا ناشتا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''رات بھی تم نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لو اب آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے تہمینہ! تم نے خوامخواہ زحمت کی۔''

''بھوک کیسے نہیں ہے۔ اور اب نہیں لگی تو تھوڑی دیر بعد لگ جائے گی۔'' وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''یہ پیٹ کا کنواں ہے پیاری۔۔۔ جیتے جی کبھی نہیں بھرتا۔۔۔ دل بجھ جاتے ہیں روح مر جاتی ہے مگر بھوک نہیں مرتی۔ تمہارا تو صرف باپ مرا ہے ماورا! مجھے دیکھو۔۔۔ سب کچھ کھو چکی ہوں۔ پھر بھی پیٹ بھر کر کھاتی ہوں۔'' وہ آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے ہنس ہنس کر نوالے بنانے لگی۔

ناشتا کرنے کے بعد ماورا اس کے کہنے پر وہیں لیٹ گئی تھی۔

رات بہت کم سونے کی وجہ سے سر بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد اس پر ہلکی ہلکی غنودگی سی چھانے لگی تھی۔

''تہمینہ! ماورا کو جگاؤ۔ ناشتا کر لے۔'' زمانی بیگم کی آواز ماورا کو کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''ناشتا کر چکی ہے وہ۔''

''سنو تہمینہ! اگر برا نہ مانو تو کیا تم اسے اپنے کمرے میں رکھ سکتی ہو؟ تم جانتی ہو نا؟ یہ سلیم کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتی۔۔۔ اسے ہماری پاس کوئی تکلیف ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں آپا! یہ میرے پاس رہے گی۔''

ان دونوں کی بات چیت کے دوران ہی نیند اس کے ذہن پر پوری طرح غلبہ پا چکی تھی۔

☆☆☆

بہت سے تعزیتی جملے۔ بہت سا اظہارِ افسوس۔۔۔ مغفرت کی بہت سی دعائیں۔ آج کئی دنوں بعد اسے اپنا غم ایک بار پھر تازہ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کامن روم میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ فائنل ایئر کے تمام طلباء و طالبات آئے تھے۔ وہ سر جھکائے۔ نم پلکوں سے ان سب کی باتیں سنتی رہی۔ صبر کی تلقین۔۔۔ تسلیم و رضا کی نصیحت۔۔۔ وہ ایک ایک کی بات پر اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

پھر رفتہ رفتہ سب لوگ اٹھتے گئے۔ کامن روم تقریباً خالی ہو رہا تھا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ایک لڑکا اس کے قریب آیا۔

''میرا نام احمد کیانی ہے۔ فائنل ایئر میں ہوں۔ یہاں ڈرامیٹک سوسائٹی کا رکن ہوں اور یونیورسٹی کے سالانہ میگزین کا ایڈیٹر بھی ہوں۔ آپ کے والد صاحب کا سن کر بہت دکھ ہوا، اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔'' وہ لڑکا بے حد شائستہ لہجے میں بول رہا تھا۔

''آپ بہت دنوں کے بعد یونیورسٹی آئی ہیں۔ اگرچہ اتنا آسان تو نہیں ہوگا، مگر کوشش کر کے اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ اس سے آپ کا ذہن بٹ جائے گا۔ اور ہاں میں یونیورسٹی کا بہت بیبا سا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لڑکیوں کو کوئی بھی مشکل درپیش ہو بلا جھجک احمد کیانی کو یاد کر لیتی ہیں۔ آپ کو خدانخواستہ کبھی کوئی

پرابلم ہو تو مجھے یاد رکھیے گا۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔'' احمد کیانی رواں لہجے میں بہت سادگی سے بولتا تھا اور یہ ہی سادگی بولنے والے کو سب سے پہلے متاثر کرتی تھی۔

''شکریہ۔۔۔ اگر ایسا کوئی موقع آیا میں ضرور زحمت دوں گی۔''

''او کے۔۔۔ پھر میں چلتا ہوں۔ اور ہاں۔۔۔'' وہ الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹا۔ اور پھر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ہارون اسرار آپ کے بارے میں بہت پوچھتا رہا۔ میرا خیال ہے اسے آپ کے والد کے انتقال کی خبر نہیں ہو سکی ورنہ وہ ضرور آتا۔ گزشتہ دو دن سے وہ بھی یونیورسٹی سے غائب ہے۔''

ماورا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''بھلا اس شخص کو کیا ضرورت ہے اس خصوصیت سے اس کا ذکر کرنے کی؟''

احمد کیانی جا چکا تھا۔ اس نے بمشکل دو کلاسز لی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد یونیورسٹی آنے کے بعد آج پہلے دن اس کا دل کسی طور پر کتابوں میں نہ لگا تو وہ جلد ہی واپس چلی گئی تھی۔

☆☆☆

صبیحہ، نائلہ اور ارم شادی پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ آج مہندی تھی۔ لڑکے والے آ رہے تھے۔۔۔ لڑکی والوں کی خاص تاکید تھی۔

''بھرپور تیاری کر کے آنا، مقابلہ ہار گئے تو ایک اٹھنی نہ ملے گی۔''

گانوں کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ سینکڑوں کیسٹیں جمع تھیں ان کے پاس، دن رات، چلا چلا کر سنا کرتی تھیں۔ ایک سے ایک نیا گانا ازبر تھا۔ اب تو بس کپڑے لتے، میک اپ کی فکر تھی۔ تاکہ کسی سے کم نظر نہ آئیں۔ نائلہ ابھی ابھی تہمینہ سے اپنے سوٹ کا ہم رنگ کھسہ مانگ کر نکلی تھی۔ زمانی بیگم، ارم پر خوب برس رہی تھیں نائلہ کی کھی کھی جاری تھی۔

''اور چڑھاؤ لسی کے گلاس پر گلاس، کہاں نکلے گی آواز تمہاری۔ پھٹا ہوا بانس، ہزار بار پہلوان سے کہا ہے یہ کھٹی میٹھی چیزیں ہمیں راس نہیں آتیں۔ مگر وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ ہے۔''

''تہمینہ! یہ گجرے بالوں میں سیٹ نہیں ہو رہے۔۔۔'' صبیحہ، تہمینہ کے سامنے آ کر سج گئی تھی۔

''اور تو بھی سن لے۔۔۔ پچھلی بار کی طرح مرے ہوئے ہاتھوں سے ڈھولک تھاپی تو پھر دیکھنا بیچ بچ ٹنڈی کر کے بٹھا دوں گی ہاں۔۔۔'' زمانی بیگم نائلہ کی طرف پلٹیں تو کھی کھی کرتے ہوئے آخری فقرے پہ وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

زمانی بیگم کتنے پل غصیلی نظروں سے اسے گھورتی رہیں اور پھر یکدم سے ان کی ہنسی نکلی تو وہ چھپا نہ سکیں۔ نائلہ کے قہقہے مزید آزاد ہو گئے تھے۔ ارم اور صبیحہ ان کا موڈ خوشگوار ہوتے دیکھ کر چہکنے لگیں۔ سرخ مہندی سے رنگے ہوئے ہاتھوں میں ڈھیروں ڈھیر چوڑیاں پہن کر وہ ہنستی کھلکھلاتی نیچے اتر گئیں۔ پیچھے پیچھے زمانی بیگم تھیں۔ ان کی آوازیں کچھ دیر تک گھر میں گونجتی رہیں، پھر ایک دم ہر طرف سناٹا سا اتر آیا تھا۔

تہمینہ جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ماورا ان تینوں کی پھیلائی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگی۔

''ماورا! چھت پر چلیں؟'' تہمینہ نے اچانک کہا تو وہ چونک گئی۔

''چھت پر۔۔۔؟''

''ہاں، میں اکثر جایا کرتی ہوں آؤ۔۔۔'' تہمینہ نے اٹھ کر لکڑی کی سیڑھی دیوار سے لگائی۔

نیچے کے حبس زدہ ماحول کی نسبت اوپر کی کشادہ فضا بہت دلفریب لگ رہی تھی۔ آسمان ان کے اوپر جھکا ہوا تھا اور چاند اتنا قریب کہ ہاتھ بڑھا کر چھو لینے کو دل چاہے، تہمینہ بازو پھیلائے۔ چہرہ اوپر کیے۔ سبک رفتار ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کر رہی تھی۔

ماورا کو اس بلندی سے شہر کو دیکھنے کا موقع پہلی بار ملا تھا۔ وہ چھت کے بیچوں بیچ کھڑی دور دور تک شہر کی جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔

''اتنی روشنیاں ہیں شہر میں کاکا! آپ کو کن اندھیروں نے نگل لیا کہ واپسی کا راستہ ہی بھول گئے۔'' اس کے دل میں ہوک سی اٹھی تو وہ اداس ہو کر منڈیر پر بیٹھ گئی۔

''مجھے یہ خاموشی اور سکوت بہت اچھا لگتا ہے۔ اتنی آزاد فضا ہے یہاں کی۔ دل چاہتا ہے اڑان بھروں، اور سیاہ آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو جاؤں۔۔۔'' تہمینہ کہہ رہی تھی۔

''اور ان روشنیوں سے سجے آباد گھروں سے بہت دور۔۔۔ کچے راستے پر ایک کھنڈر مکان ہے جو چند روز پہلے میرا گھر ہوا کرتا تھا۔ وہاں کوئی روشنی نہیں اور میں اس تاریکی میں بھی کلیوں کے جھنڈ کے پاس بہت سے جگنوؤں کو اڑتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ دم سادھے درختوں کی شاخوں میں چھپے پرندوں کی اداس بولیاں مجھے یہاں بھی سنائی دے رہی ہیں۔'' وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

''ننھی چڑیوں کا کٹورا خالی ہوگا۔ حوض کے پانی پر کائی جم گئی ہوگی اور سبز رنگ پر پیلاہٹ اتر آئی ہوگی۔''

دھیرے دھیرے بہتی ہوئی رات اس کے آنسوؤں سے نم ہونے لگی تو تہمینہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ بالکل خاموش، چپ چاپ نہ کوئی تسلی نہ دلاسا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی رو دھو کر چپ ہو گئی۔ آنسوؤں سے تر چہرہ دوپٹے سے اچھی طرح خشک کر کے اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل ساکت اور خاموش بیٹھی تھی۔

ماورا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

''زمانی بیگم بتا رہی تھیں کہ تم غزل بہت اچھی گاتی ہو۔ کیا واقعی؟''

''شاید۔۔۔'' تہمینہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''مجھے سناؤ گی؟''

''تم سنو گی۔۔۔؟'' اس نے الٹا اسی سے پوچھا تو ماورا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہی پھر بہت دھیرے دھیرے اسے سنانے لگی۔

یہ دل، یہ اجڑی ہوئی چشم نم، یہ تنہائی
ہمارے پاس تو جو بھی ہے مال درد کا ہے
اسیر ہے میری شاخ نصیب پت جھڑ میں
میرے پرندۂ دل پر بھی جال درد کا ہے
ہم اس کو دیکھتے جاتے ہیں، روتے جاتے ہیں

یہ صحن شب میں پڑا ہے جو تھال درد کا ہے

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ چاندنی تہمینہ کے نم گالوں پر بوسہ دینے زمین پر اتر آئی تھی۔ اس کی آواز وائلن کے سروں سے مشابہ تھی۔ دردناک دل کی وحشتوں کو جگاتی ہوئی۔ زمانی بیگم نے اس کے متعلق کچھ بھی غلط نہ کہا تھا۔

اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا
یہ بات طے ہوئی لیکن سوال درد کا ہے
وہیں کہیں کسی گھاٹی میں تیرا ہجر بھی ہے
میرے لہو سے جہاں اتصال درد کا ہے

''تمہاری آواز میں سوز بہت ہے۔'' وہ چپ ہوئی تو ماورا نے بے اختیار کہہ دیا، تہمینہ ہولے سے ہنس دی۔

''سارا وجود ہی سوز میں ڈھل گیا ہے پیاری! ریشے ریشے میں غم بستا ہے۔ میر شعر کے پردے میں غمِ دل کہتا تھا، میں نے گائیکی کی آڑ لے لی۔''

''محفلوں میں گانا کیسا لگتا ہے تہمینہ!'' ماورا دل کی بات زبان پر لے آئی تھی۔

''محفل مجھ پہ نشہ طاری کر دیتی ہے ماورا! بہت سے لوگوں کے درمیان وہ سب کہہ جاتی ہوں جو کسی سے کہہ نہیں سکتی۔ اور مزے کی بات، اس پل کوئی مرے دکھ کو سمجھ نہیں پاتا۔ خود ہی کہتی ہوں پھر خود ہی سسکنے لگتی ہوں۔'' تہمینہ نے اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔ اس کے وجود کی ہلکی سی لرزش ماورا سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

''پچھتاوا میرے اندر پنجے گاڑے بیٹھا ہے ماورا! سوچتی ہوں، میں نے کیا کیا تھا؟ کس کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑا۔۔۔؟ ہاتھ میں سوئی بھی چبھ جاتی تو ماں باپ، بھائی بہنیں بھاگ کھڑے ہوتے تھے مگر میں نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ اور اپنے ساتھ۔۔۔ اب رات رات بھر روتی ہوں کوئی آنسو پونچھنے کو نہیں ملتا۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

''وہ خود تو بہت مزے میں ہوگا نا ماورا! مجھ جیسی کوئی اور مل گئی ہوگی۔ ہم نادان لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ کسی نے محبت کے دو چار بول بولے اور ہم نے اپنا آپ رول ڈالا اس کے لیے۔۔۔ ہا۔۔۔'' اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

''محبت کے راستے میں کوئی قدم نہ رکھے پیاری! محبت دکھ دیوے ہے۔ مار ڈالے ہے۔ زندگی بھر کا روگ ہووے ہے۔ چار دن کا کھلواڑ ہے رے اور بس۔۔۔'' وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''نائلہ ایسے ہی بولتی ہے اور مجھے اس کا بولنا بہت اچھا لگتا ہے۔'' عام سے انداز میں بات کرتی تہمینہ دوبارہ سے اپنے خول میں سمٹ گئی۔

ماورا کی آنکھوں میں جانے کیوں ایک چہرہ بار بار سامنے آتا رہا۔

عشق میں چند چمکتے ہوئے پل
بیت جانے تھے سو بیت گئے

تہمینہ چھت پر ٹہلتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ ماورا گھٹنوں پہ سر رکھے اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

''یونیورسٹی کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہوگا جہاں یہ شخص میرے پیچھے نہ آسکے۔'' وہ ہارون اسرار کو اپنے مقابل بیٹھے دیکھ رہی تھی۔

''لائبریری، کیفے ٹیریا۔۔۔ سیمینار روم، وہ کہاں کہاں سے کترا کر نکلتی تھی۔ مگر کہیں نہ کہیں بے تاب نگاہوں میں بہت سی ان کہی لیے وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔

''میری طرف دیکھو۔۔۔ میری آنکھوں میں جھانکو۔ کیا تمہیں میری باتوں میں، میرے جذبوں میں کوئی سچائی نظر نہیں آتی۔'' وہ جیسے اس کی سنگ دلی پہ حیران تھا۔ ماورا نے ساری توجہ کتاب کی طرف مبذول کرنی چاہی مگر وہاں بھی تو یہ لفظ تحریر تھا۔ اس نے کتاب بند کی اور سیاہ جلد پر یونہی لکیریں سی کھینچنے لگی۔

''لوگ کہتے ہیں، لڑکیاں، ہارون اسرار پر مرتی ہیں۔ اور یہ کہتا ہے کہ مجھے تم جیسی کوئی دوسری دکھائی نہیں دیتی۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا۔ رت جگے کی اذیتیں۔ کج ادائی کا زخم، بے قراری کی تپش، اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ غلط نہ کہہ رہی تھی۔

''میں نہیں جانتا، میں کن راستوں پر قدم رکھ چکا ہوں۔ مجھے نہیں خبر یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں۔ مگر یہ کسک جو محبت کی دین ہے۔ مجھے جاں سے بھی عزیز تر ہے۔'' وہ پوری سچائی سے کہہ رہا تھا۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

''مت گھسیٹو مجھے اپنے ساتھ کانٹوں پر۔ ابھی اتنا درد سہنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔'' وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔

''تم بات کیوں نہیں کرتیں ہو مجھ سے؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''کیا بات کروں میں تم سے؟ جو کچھ تم مجھ سے کہتے ہو ان میں سے کسی بات کا جواب میرے پاس نہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ماورا! تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔'' وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔ تب وہ اس کی طرف پلٹی۔

''کیا چاہتے ہو۔۔۔؟ کیا بات کروں میں تم سے۔۔۔؟'' وہ بہت سادہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

''تم کہتے ہو تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ ٹھیک ہے کرتے رہو محبت۔۔۔ اس میں میرا نقصان کیا ہے؟ لیکن جواب میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس کے بے تاثر لہجے پر ہارون کا چہرہ ایک پل کے لیے متغیر ہوا۔

''کیا میں بھی تم سے ویسی ہی محبت کا دعوا کروں۔۔۔ جیسی تم مجھ سے کرتے ہو۔۔۔؟ لیکن میرے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے۔۔۔ پھر۔۔۔؟ کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہارے ساتھ محبت کا راگ الاپوں، جب کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔۔۔؟ ماورا کو خود معلوم نہ تھا کہ وہ اتنی کٹھور بھی ہو سکتی ہے۔

وہ لب بھینچے چپ چاپ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''محبت کا راستہ میرے لیے بنا ہی نہیں ہے ہارون اسرار۔'' وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے پلٹی۔

''میں جن خارزاروں میں الجھی ہوں۔ وہاں محبت کی گنجائش نہیں نکلتی۔ ابھی تو میں خود زمین و آسمان کے درمیان معلق ہوں۔ اپنا آپ سجھائی نہیں دیتا تمہارے لیے کہاں سے سوچوں۔۔۔؟'' وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی اس سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

''دستک ان دروازوں پر دی جاتی ہے جن کے کھلنے کی امید ہو۔ میں جن بند کواڑوں کے پیچھے رہتی ہوں۔ وہ وقت اور حالات کے ہاتھوں سیل ہو چکے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو انہیں تمہارے لیے نہیں کھول سکتی۔''

☆☆☆

''چھوٹے۔۔۔ ارے او چھوٹے۔۔۔ کتنی دیر سے تجھ کو دو چائے کا بولا ہے رے۔۔۔ دیوے گا کہ میں خود آؤں نیچے۔'' نائلہ کی پاٹ دار آواز تیسری منزل سے گونجی تو ہر کوئی ہڑبڑا کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ڈھلتی شام کی گلابی میں وہ دیوار سے لٹکی براہ راست اپنے پیغامات نیچے بازار میں بھجوا رہی تھی۔

''پر اتنا یاد رکھیو پہلوان جی! نائلہ خود آئی تو جرمانے میں پاؤ بھر مٹھائی ساتھ لے جاوے گی۔''

''آ۔۔۔ آ۔۔۔'' زمانی بیگم نے نائلہ کو کمر سے دبوچا تو سیدھا چارپائی پر لا پٹخا تھا۔

''ہائے۔۔۔ کیوں موری پتلی کمریا پر اتنا ظلم ڈھاوے ہے جالم۔۔۔ کوئی چک مک پڑ گئی تو بدبخت پروڈیوسر فلم میں کسی کبڑی ہیروئن کا چانس بھی نہ دیوے گا۔'' اس کی کھلکھلاہٹیں بڑی جاندار ہوتی تھیں۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ آنکھوں سے ہمہ وقت چھلکا کرتی وہ ماورا کر پُرجوش زندگی کی بے حد خوبصورت اور نٹ کھٹ مثال لگتی تھی۔

''ایکسٹرا بنے گی ماں کی طرح۔۔۔'' زمانی بیگم، ارم سے ساڑھی کی فال درست کروا رہی تھیں۔

''اور اسی کی طرح پہاڑی سے کود کر مرے گی۔'' صبیحہ نے لقمہ دیا۔

''ارے جا۔۔۔ نائلہ، ماں جیسی پاگل نہ ہووے۔ چالیس کے پیٹے میں آئے ہیرو کے ساتھ پہاڑی پہ چڑھ کر بس وہی ٹھمکے لگاوے۔۔۔'' وہ چارپائی پہ اوندھی ٹانگیں ہلاتی بڑے اطمینان سے جواب پہ جواب دیے جا رہی تھی۔ تب ہی کسی بچے نے آخری سیڑھی سے جھانک کر آواز لگائی تو نائلہ اچھل کر بھاگتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

''پہلوان جی نے کہا ہے۔۔۔ نائلہ جی سے کہنا پاؤ بھر مٹھائی جرمانے میں بھجوا رہا ہوں، اب نیچے آ کر اپنا کہا پورا کریں۔'' رٹو طوطے نے جواب دیا۔

''کیا۔۔۔؟'' زمانی بیگم کے کان کھڑے ہو گئے۔

''ہزار بار بولا ہے، اپنی حد میں رہا کرو۔ اب دیکھ لیا۔۔۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کسی روز یونہی پاؤ بھر بٹھائی کے بدلے تجھے اپنی تجوری میں بند کر لے گا وہ بدمعاش۔ ابھی پوچھ کر آتی ہوں اس سے۔۔۔'' وہ سیڑھیوں سے کھٹ کھٹ کر کے اترتے ہوئے بھی بڑبڑا رہی تھیں۔

''اب ہوش آویں گے پہلوان جی کو۔۔۔'' نائلہ مزے سے برفی چائے میں ڈبو کر کھانے لگی تھی۔
''تم کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو۔ یہ تو ان کے روز کا ڈراما ہے۔۔۔'' تہمینہ نے اسے ٹوکا تو وہ ذرا سا مسکرا دی۔

''آج ہم ایک محفل میں جا رہے ہیں ماورا! آپا کہہ رہی تھیں، تمہیں بھی ساتھ لے چلوں۔''

''دل نہیں چاہ رہا۔ تم لوگ ہو آؤ۔'' اس نے بڑی آسانی سے اسے ٹال دیا۔ مگر زمانی بیگم اس کے بجھے بجھے چہرے کو دیکھ کر اس کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔

''ذرا دیر کو دل بہل جائے گا بچی! چلی چلو۔۔۔ تمہارا یوں گم صم رہنا دل کو ذرا نہیں بھاتا۔ ان لڑکیوں کو دیکھو۔ کہاں کی آسودگی دیکھی ہے انہوں نے۔ پھر بھی ہنستے کھیلتے دن بتا رہی ہیں۔ چلو تیار ہو جاؤ، شاباش۔۔۔''

ان کے اپنائیت بھرے انداز پر وہ مزید انکار نہ کر سکی تو اٹھ کر تہمینہ کے پاس چلی آئی۔

''ان دونوں میں سے کوئی ایک سوٹ پہن لو۔'' تہمینہ نے سیاہ اور سفید رنگ کے سوٹ نکال کر اس کے سامنے لہرائے۔

''کون سا پہنوں؟''

''میرا خیال ہے سیاہ رنگ مجھ پہ جچے گا اور سفید رنگ میں تم پیاری لگو گی۔''

تہمینہ نے ایک ادا سے کہا تو ماورا نے سفید سوٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

جس پل وہ تینوں وہاں پہنچیں آسمان کے کنارے سیاہ پڑنے لگے تھے۔ گلابوں سے مہکتی شام رنگا رنگ روشنیوں میں ڈوب گئی تھی اور ان روشنیوں میں گھرے زندگی کے غموں سے بے نیاز، پرنور، خوش باش چہرے ماورا کو ایک پل کے لیے اتنے خوبصورت لگے کہ وہ مبہوت رہ گئی۔

''ارے مجھے تو خبر ہی نہ تھی۔ دنیا اتنے رنگوں، اتنی خوشبوؤں، اتنی خوبصورتیوں سے بھری ہوئی ہے۔'' اسے اپنا آپ ایک ایسے بچے کی طرح لگا جس نے اس حیرت کدے میں ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔

تہمینہ اسے ساتھ لے کر کونے کی میز پر جا ٹکی تھی۔ زمانی بیگم ادھر اُدھر کے لوگوں میں جان پہچان ڈھونڈنے لگیں۔ وہ تہمینہ کے ساتھ حیران حیران سی رنگِ محفل دیکھتی رہی۔ کھانا، پینا، ہنسنا بولنا سب ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ذرا دیر بعد زمانی بیگم خود ہی اسے لینے چلی آئیں۔

''یوں کونے میں چھپ کر بیٹھنے سے کیا خاک مزہ آئے گا۔ آؤ میں تمہیں کچھ لوگوں سے ملواتی ہوں۔۔۔'' وہ زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔

''یہ فاروق صاحب ہیں، ہمارے بہت بڑے قدردان۔۔۔ ان کے گھر کی کوئی محفل آج تک ہمارے بغیر نہیں سجی۔۔۔'' وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھیں۔

''اور یہ ماورا ہے فاروق صاحب! ہماری بیٹی۔'' فاروق صاحب کے عقب میں کوئی بجلی کی سی تیزی سے پلٹا تھا۔ ماورا کی نگاہ ایک پل کے لیے اس کی جانب اٹھی تو پھر کئی لمحوں کے لیے پلٹنا بھول گئی تھی۔

فاروق صاحب غالباً کچھ کہہ رہے تھے۔ اس کی غائب دماغی پر زمانی بیگم نے ٹہوکا دیا تو وہ تیزی سے سر جھکا گئی۔

''خوبصورت تو تہمینہ بھی ہے زمانی بیگم! لیکن ماورا کے مقابلے کی نہیں۔ انہیں کب سنوار رہی ہیں۔ بلکہ آپ کہیں تو کل ہی ایک محفل۔۔۔'' فاروق صاحب بڑی بے تکلفی سے کہہ رہے تھے۔ ان کی بات سن کر زمانی بیگم گڑبڑا سی گئیں۔

''نہ جی۔۔۔ اسے غزل کا کوئی شوق نہیں۔ یہ تو کتابوں کی رسیا۔۔۔'' زمانی بیگم انہیں ٹال رہی تھیں۔۔۔ مگر جو کچھ اس کے بارے میں کہا جا چکا تھا۔ اس کا ردِعمل ان شرارا اگلتی آنکھوں میں بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔

''کاش۔۔۔ کاش۔۔۔'' اس کے دل سے خواہش ابھری تھی۔

''کاش۔۔۔!'' میں نے زمانی بیگم کی بات نہ مانی ہوتی۔ کاش! میں یہاں نہ آئی ہوتی۔ یا پھر ''وہ'' نہ آیا ہوتا۔''

زمانی بیگم آگے بڑھ گئیں۔ وہ ان سے معذرت کر کے وہیں ایک کرسی پر ڈھے گئی۔ ''بھلا مجھے کیا ضرورت ہے پروا کرنے کی۔''

تہمینہ غزل سنانے کے لیے اسٹیج پر جا چکی تھی۔ اس نے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہونا چاہا۔ مگر نگاہ بھٹک بھٹک کر اس تک جاتی رہی، جس کے چہرے پہ ٹھہرے گداز تاثرات کو ایک پل میں پتھریلی سنجیدگی میں ڈھلتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے، میں جو بھی ہوں۔۔۔ جیسی بھی ہوں۔ اسے اس سے کیا غرض؟'' اس نے خود کو ٹال کر غزل سننے کی کوشش کی۔

''کیا سوچا ہوگا اس نے میرے بارے میں۔۔۔؟'' تھک ہار کر ایک سوچ پھر سے اس کے ذہن پہ غلبہ پانے لگی تو اس نے خود کو جھڑک دیا۔

''یہ کن اندیشوں میں گھری ہوں۔ جب اس سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھنا تو پھر ڈر کیسا۔۔۔؟ خوف کیونکر۔۔۔؟''

''وہ محبت کرتا ہے تم سے۔۔۔ اپنے دل میں کس بلندی پر بٹھا رکھا ہوگا اس نے تمہیں۔ اور ب۔۔۔؟'' یہ پتا نہیں کون اس کے آس پاس بول رہا تھا۔

''یہ محبت وحبت کا خناس میرے دل میں کہاں سے آسمایا۔۔۔؟'' اس نے اپنا سر جھٹکا اور اٹھ کر قریب رکھی کرسی پر آ گئی۔

تہمینہ دوسری غزل شروع کر چکی تھی اور اس کی آواز کا طلسم جیسے سب لوگوں پر سحر پھونک گیا تھا۔ میزبان کی طرف سے تمام خواتین کو گجرے پیش کیے جا رہے تھے۔ بھرپور کھلی ہوئی مہکتی کلیاں اس تک پہنچیں تو نگاہ بے اختیار ہی اس نیم تاریک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں وہ سر جھکائے، تلخ کافی گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتار رہا تھا۔

مجھ سے ملنے کے وہ کرتا تھا بہانے کتنے
اب گزارے گا میرے ساتھ زمانے کتنے

ماورا کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔ ان آنکھوں کا تنفر ایک پل کے لیے یاد آ کر معدوم ہو گیا تھا۔ تہمینہ کی آواز دل کی آواز سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ وہ نم پلکوں کے ساتھ گجرے کا ایک ایک پھول توڑتی رہی۔

میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن
سوچتا ہوں مجھے آئے تھے اٹھانے کتنے

''تو یہ تھی تمہاری اصلیت۔۔۔'' ماورا کے ہاتھ اپنی جگہ تھم سے گئے۔ وہ نجانے کب اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

''اور میں سمجھا کرتا تھا ماورا سکندر! کہ تم کسی انتہائی مولوی ٹائپ گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ کسی لڑکے سے بات کرنا، اس کی حوصلہ افزائی کرنا تمہارے نزدیک گناہ ہے۔'' اس کی آواز کا سرد تاثر ماورا کے لیے غیر متوقع قطعاً نہ تھا۔

''اور تم۔۔۔ تم ایک گائیکہ کی بیٹی ہو۔ دوسری گائیکہ کی بہن، ایک ریڈیو پہ آواز کا جادو جگاتی تھی۔ دوسری محفل میں گا رہی ہے۔ اور تم۔۔۔ تم ایک مرد سے بات کرتے ہوئے کتراتی تھیں۔'' وہ کرسی کھینچ کر سامنے آ بیٹھا تھا۔ ماورا نے رخ موڑ کر نگاہیں تہمینہ پر جما دیں۔

تم نیا زخم لگاؤ، تمہیں اس سے کیا ہے

''کس بات کا زعم تھا تمہیں ماورا! اور کیا سمجھ رکھا تھا تم نے مجھے۔۔۔ میں کوئی گرا پڑا انسان تو نہیں تھا۔ میرے جذبوں میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ پھر۔۔۔؟''

اس کے لب و لہجے کی تلخی ناقابل برداشت تھی مگر اسے اپنا آپ آزمانا تھا۔

تم نیا زخم لگاؤ تمہیں اس سے کیا ہے
بھرنے والے ہیں ابھی زخم پرانے کتنے

تہمینہ جانے کیوں بار بار ایک ہی شعر دہرا رہی تھی۔ ماورا کو اپنے حلق میں کوئی نمکین سی چیز گھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ روشنیاں آنکھوں کو چبھنے لگی تھیں۔

''بیسیوں لوگوں کا دل بہلاتی ہو تم لوگ، صرف اس لیے کہ یہ تم لوگوں پہ روپے نچھاور کرتے ہیں۔ سچے جذبے لٹانے والوں کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ارے اظہار تو کرتیں ماورا! میں تمہیں روپوں میں تول دیتا۔ ان گنت لڑکیاں مجھ پہ مرتی ہیں ماورا سکندر! مگر افسوس۔۔۔ صد افسوس۔۔۔ میرا دل ٹھہرا بھی تو کس مقام پر۔۔۔؟''

وہ ناراض تھا یا خفا۔۔۔ تحقیر کر رہا تھا یا طنز۔۔۔ مگر کچھ تو ایسا تھا جو اس کی باتوں سے ٹوٹتے کانچ کی سی صدا دے رہا تھا۔ وہ کیا تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔ جو ہونٹوں پر کپکپاہٹ بن کر اتر رہا تھا۔ اور یہ قدموں میں ڈگمگاہٹ کیسی؟

وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ لمحوں میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

''یہ عورت میری ماں ہے نہ وہ لڑکی میری بہن ہارون اسرار! میں ایک سید زادی ہوں۔ میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ۔۔۔؟'' وہ چیخ چیخ کر بتا دینا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی۔

''میں سلیم کی طرح کٹھور نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں سے دکھ سکھ کی سانجھ ہو۔۔۔ ان سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا۔ چلو اسی بہانے تمہاری ''محبت'' کھل کر سامنے آ گئی۔ اب راہ بدلو گے بھی تو کم از کم مجھے خود سے کوئی گلہ نہیں رہے گا۔''

☆☆☆

صبح آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ اَدھ کھلی کھڑکی سے روشن آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چھٹی کا ارادہ کر کے یونہی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ لیکن پھر جانے دل میں کیا آیا کہ اٹھ کر غسل خانے میں گھس گئی۔ تیار ہو کر یونیورسٹی پہنچی تو کلاس شروع ہو چکی تھی اور اس دوران کلاس میں جانے کا مطلب پروفیسر صاحب سے اپنی بے عزتی کرانا تھا۔ سو چپ چاپ پلٹ کر لائبریری میں آ گئی۔ ارادہ نوٹس بنانے کا تھا مگر آنکھوں میں ادھوری نیند کی کڑواہٹ بھری تھی۔ دو چار حرف پڑھتی تو آنکھوں میں پانی بھر آتا تھا، سو بے دلی سے کتابیں بند کر کے بیٹھ گئی۔

ساتھ والی کرسی پر بیٹھی لڑکی نے پڑھتے پڑھتے اخبار کا اندرونی صفحہ کھول کر پھیلایا تو سرسری نگاہ سے اخبار کا جائزہ لیتی ماورا بری طرح چونک گئی۔ اخبار کسی ناآشنا لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔ مگر تصویر۔۔۔ اتنی اپنی تھی کہ اس نے جھپٹ کر اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا۔

''کاکا جان!'' اس نے اس تڑپ سے انہیں پکارا گویا اخبار میں چھپی تصویر سے باہر نکال لینا چاہتی ہو۔ برق رفتاری سے اس کی نگاہوں نے تصویر کے نیچے تحریر عبارت کو پڑھا، دل ایک لمحے کے لیے سکڑ کر دوبارہ اپنی جگہ واپس آ گیا تھا۔

سلیم کی طرف سے تلاش گمشدہ کا اشتہار تھا۔ ماورا نے مرے مرے سے انداز میں اس لڑکی کو اخبار واپس کیا اور خود وہاں سے اٹھ کر سلیم کے ڈیپارٹمنٹ تک چلی آئی۔ راستے میں اس کا دوست ملا تو وہ اسے کیفے ٹیریا میں بیٹھنے کا کہہ کر سلیم کو ڈھونڈنے چلا گیا۔

''کتنے دن ہو گئے مجھے سلیم کو دیکھے ہوئے۔۔۔'' اس نے بیٹھ کر حساب کتاب کرنا شروع کیا۔

''اس گھر میں داخل ہونے کا گناہگار بھی غالباً صرف میری وجہ سے ہوا تھا۔ جہاں اس کی ماں ہر روز ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر پوچھا کرتی ہے۔ آج سلیم سے ملی تھیں تم۔۔۔؟''

''تم یہاں کیسے؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' سلیم ایک دم سے میز پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف جھکا تو وہ بری طرح چونک گئی۔

''ہاں۔۔۔ خیریت ہے۔۔۔'' چند ثانیے بعد اس نے جواب دیا تو وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''کہاں گم رہتے ہو آج کل؟'' ماورا نے بغور اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت بہتر حالت میں لگ رہا تھا۔ صحت بھی اچھی ہو گئی تھی اور چہرے پہ رہنے والا تفکر بھی اب قدرے اطمینان کا تاثر دے رہا تھا۔

''کہیں نہیں۔۔۔ بس ذرا پڑھائی کی مصروفیت تھی۔''

''اچھا۔۔۔'' وہ ذرا سا ہنسی۔

''میں سمجھی مجھے اس گھرانے میں شامل کر کے مجھ سے بھی قطع تعلق کر بیٹھے ہو۔ یا پھر اپنے جھوٹ پر نادم ہو اسی لیے نظریں چرائے پھرتے ہو۔''

''طنز کر رہی ہو۔۔۔؟'' سلیم کا جھکا ہوا سر اسے ذرا بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔

''نہیں۔۔۔'' اس نے سادگی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''وہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا تمہیں۔۔۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سلیم نے سر اٹھایا۔

''نہیں۔۔۔سب لوگ بہت خیال رکھتے ہیں۔'' اس کے جواب میں سلیم کچھ کہے بغیر ہاتھ میں پکڑے کی رنگ کو میز پر گھماتا رہا۔

''اخبار میں کاکا جان کی تصویر تم نے دی تھی؟''

''ہاں۔۔۔ہمارے پاس آخری راستہ بس یہ ہی تھا۔''

''پھر۔۔۔؟''

''تاحال کسی نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ اشتہار گزشتہ تین روز سے چھپ رہا ہے۔'' سلیم کے جواب نے اس کے دل سے رہی سہی امید بھی نوچ کر پھینک ڈالی تھی۔

''پتا نہیں کیوں سلیم! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ اب میں ان سے کبھی نہیں مل پاؤں گی۔'' وہ بری طرح مایوس ہو رہی تھی۔

''اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھو۔۔۔ میں ابھی تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو منگواتا ہوں۔۔۔'' سلیم نے اسے اٹھتے دیکھ کر اصرار کیا۔

''نہیں۔۔۔ یہ میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔ چلتی ہوں اب۔۔۔'' سلیم کے انداز میں پہلے کی سی اپنائیت مفقود تھی۔ سو وہ جلد ہی وہاں سے اٹھ آئی۔

☆☆☆

''مجھے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جس کی آواز میں جھرنوں کی سی روانی بھلے نہ ہو مگر کوئل کی کوک جیسی ضرور ہونی چاہیے۔'' احمد کیانی نے اپنے تمام کریکٹرز کے چناؤ کے بعد ایکدم کھڑے ہو کر اعلان کیا تو اظفر کے ساتھ ڈائیلاگ کی تصحیح کرتے ہارون اسرار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ماریہ کہاں گئی۔۔۔؟'' کسی اور نے پوچھا۔ وہ ان کی مستقل فنکارہ تھی۔ ایکٹنگ کے ساتھ ساتھ سنگنگ کی ماہر۔

''انگلینڈ۔۔۔اور دو ماہ سے قبل واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

''ایک لڑکی ہے تو سہی کیانی! لیکن اس کی آواز میں کوئل جیسی کوک نہیں۔ ہاں البتہ ابابیل کی گنگناہٹوں جیسی مٹھاس اور نغمگی ضرور ہے۔ سنو! تم نے کبھی صبح کے ملگجے سے اجالوں میں ابابیل کو گنگناتے سنا ہے۔۔۔؟'' وہ کرسی جھلاتے جھلاتے ایک دم سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ احمد کیانی کو اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کس کے متعلق بات کر رہا ہے۔

''بہت آگاہ ہو گئے ہو اس کی خوبیوں سے۔۔۔'' احمد کیانی نے کرسی کی ہتھیوں پہ ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بڑے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا تو وہ بے اختیار ہی ہنس دیا۔

''چاہنے والوں کی خبر تو رکھنی پڑتی ہے نا؟''

''اوہ! تو مانتے ہو اس بات کو کہ تم بھی چاہنے والوں میں شامل ہو چکے ہو۔''

''ہاں۔۔۔'' اس کا سادگی سے کیا گیا اعتراف احمد کیانی کو حیران کر گیا۔

''کیا یہ وہی ہارون اسرار ہے جو ہر لڑکی کے ہاتھ بڑھانے پر کہا کرتا تھا۔

''یہ میرا دل ہے، میں اسے چٹکی چٹکی دوسروں میں بانٹنا نہیں چاہتا۔ بس ایک ہی دفعہ پورے کا پورا دوں گا، اسے، جسے میرا دل چاہے گا۔'' احمد کیانی سیدھا ہو کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے ہم کسی اور ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔'' ہارون اسرار نے بات بدلی۔

''تب ہارون اسرار کو یہ خبر نہ تھی کہ دل جیسی چیز کو لوگ چٹکیوں میں مسل کر پھینک دیتے ہیں۔ یہ کہانی قریب الختم ہے کیانی! جسے تم آغاز سے دیکھ رہے ہو۔'' دھندلائی آنکھوں سے احمد کیانی کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

''اس کی آواز بلاشبہ بہت خوبصورت ہے مگر اس میں اسٹیج کانفیڈنس نہیں ہوگا۔۔۔''

''تم ایک بار پھر اسے اسٹیج تک لاؤ تو سہی۔ تم سب کو حیران نہ کر دے تو کہنا۔۔۔'' اس نے بہت سادگی سے دعوا کیا۔

''چلو دیکھتے ہیں۔'' احمد کیانی پی کیپ اپنے سر پہ ٹکاتا اسی وقت باہر نکل گیا تھا۔

''یہ کانفیڈنس تو اس کی گھٹی میں پڑا ہو گا احمد کیانی! تم کیا جانو۔۔۔؟'' وہ گہری سانس لے کر دوبارہ اظفر کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

''یہ کیا کہا ہے اس نے؟''

احمد کیانی کی بات سن کر وہ بہت دیر تک بس اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔

''آپ کی آواز اتنی خوبصورت ہے کہ یہ کام آپ کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔''

اسے لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔

یا پھر در پردہ یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہے کہ۔۔۔آپ جیسی پروفیشنل کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوگا۔

''تو کیا یہ بات پوری یونیورسٹی میں پھیل چکی ہے۔'' اسے کھڑا رہنے کے لیے کرسی کا سہارا لینا پڑا۔

''یہ ایک چیریٹی شو ہے ماورا! اس کار خیر میں۔''

وہ احمد کیانی کے ملتے ہوئے ہونٹ دیکھ رہی تھی مگر مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

''واہ ہارون اسرار! خوب بدلہ لیا ہے تم نے۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تم کبھی یوں میری تذلیل کا باعث بھی بنو گے۔''

''ہاہ۔۔۔ایک گائیکہ کی بیٹی۔۔۔دوسری گائیکہ کی بہن۔۔۔'' کوئی طنزیہ آواز میں اس کے قریب آ کر ہنسا۔

''آپ فوری طور پر جواب نہیں دینا چاہتیں تو میں کل اسی وقت دوبارہ آ جاؤں گا۔'' احمد اسے گم صم ہوتے دیکھ کر اسی وقت لوٹ گیا۔

''تمہیں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی احمد کیانی! تمہارے آنے سے پہلے میرا انکار تم

تک پہنچ جائے گا۔'' وہ پختہ ارادوں کے ساتھ وہاں سے اٹھی مگر ایک ہیولے نے اس کی راہ روک لی تھی۔

''کیوں انکار کر رہی ہو تم۔۔۔؟ محفلوں میں گا سکتی ہو۔ یونیورسٹی میں نہیں۔ روپوں کے لیے گا سکتی ہو تو کارِ خیر کے لیے کیوں نہیں؟''

''تم صرف طعنہ دینے کے لیے مجھے ہزاروں تماش بینوں کے سامنے لانا چاہتے ہو۔'' وہ بہت تیزی سے کلاس روم سے باہر نکل آئی۔

''تم مجھے میری اوقات یاد دلا کر میری تذلیل کرنا چاہتے ہو۔ اور بس۔۔۔ تم مجھے صرف یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ میں ایک گائیکہ کی بیٹی ہوں۔ دوسری گائیکہ کی بہن، اس کے باوجود میں نے تمہاری پذیرائی نہیں کی۔'' اس نے راستے میں آنے والے ہر پتھر کو اپنی ٹھوکر سے اڑا دیا۔

''اوہ خدایا! یہ ذلت بھی میرے حصے میں لکھی جانی تھی۔۔۔'' وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی پوائنٹ پر سوار ہو گئی۔

''ذلت۔۔۔ کیسی ذلت۔۔۔؟'' زمانی بیگم کی شرارے اگلتی آنکھیں اس کی فائل پر اگ آئی تھیں۔

''میرے پاس ہو تو گائیکہ کی بیٹی کہلائی ہو۔ سگی ماں زندہ ہوتی تو ناٹک والی کی بیٹی کہلاتیں۔۔۔ درجہ تو گائیکہ کا بھی وہی۔ نوٹنکی والی کا بھی وہی۔ تو ذلت کیسی بنو۔۔۔ اپنی اصلیت پہچانو۔۔۔ ایسی کہاں کی اعلا وارفع ہو تم۔۔۔'' اس نے تیزی سے فائل کو اوندھا کر دیا۔

''ارے۔۔۔ جب ہم لوگوں کا کھاوے ہے تب تیری تذلیل نہ ہووے ہے۔ جب ہماری چھت کے نیچے سووے ہے۔ ہماری آسائشوں کو جی بھر کے لوٹے ہے۔ ہمارے ساتھ مل کر ہنسے، رووے ہے۔ تب تیری تذلیل نہ ہووے ہے۔'' نائکہ کی پاٹ دار آواز بس کے ہارن سے نکلی تھی۔

''جب تم ہمارے حوالے سے جانی جاتی ہو تو پھر خود کو ہم سے الگ کیوں کرنا چاہتی ہو؟ اسٹیج پر گانا نہیں چاہتیں کہ ایک گائیک گھرانے سے تعلق پر تصدیق کی مہر لگ جائے گی تو لگ جانے دو۔ ایسا کون سا بٹہ لگ جائے گا تمہارے نام پر جو کچھ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھ سن چکا ہے۔ اسے کیسے جھٹلاؤ گی تم۔۔۔ تردید کرنا چاہتی ہو؟'' تہمینہ کتاب کے صفحے سے جھانک رہی تھی۔

''نہیں نا؟ تو صرف اپنی ذات کو سامنے رکھو۔ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ گائیک کیچڑ نہیں ہوتے کہ جن سے تعلق کا چھینٹا تمہیں داغدار کر دے گا۔'' تہمینہ کے بولنے کا اپنا ایک انداز تھا۔ مدھم سروں سے لبریز۔

''گائیک کنول کا پھول بھی تو ہو سکتا ہے نا ماورا! جس کی اوک میں پانی کا ننھا، شفاف اور معطر قطرہ کبھی کبھی دوسروں کی پیاس بھی بجھا دیتا ہے۔''

پورے جادوگر تھے یہ سب لوگ۔۔۔ وہ پوائنٹ سے اتری تو ذہنی کیفیت کسی نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد یکسر بدل چکی تھی۔

☆☆☆

آیئے ہاتھ اٹھائیں، ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں

ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدایا نہیں

اس کی آواز سننے والوں کو مبہوت کر گئی تھی۔

افسردگی سے بوجھل، غم کے اثر سے گونجتی۔۔۔ بانسری کے رسیلے سروں کی سی آواز مائیک سے ابھری تو احمد کیانی نے ہارون اسرار کے دعوے کو سو فیصد درست قرار دے دیا تھا۔

پرفارم کرنے والے لیلیٰ اور وصی تھے۔

''یار اس لڑکی کی آواز اور اس نظم نے ڈرامے کے تاثر کو کس قدر پاورفل بنا دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے ہماری ساری محنت وصول ہو گئی ہے۔'' احمد کیانی پردے کے پیچھے اپنی کامیابی پر پرجوش ہو رہا تھا۔

ماورا اور ہارون اسرار مائیک پر موجود تھے۔

ماورا جس بند کو ترنم سے پڑھتی تھی۔ اسی بند کو بیک گراؤنڈ میں ہارون اسرار تحت اللفظ میں پڑھتا۔ ماورا کی مدھم ہوتی آواز پر ہارون اسرار کا لب و لہجہ ایک دم ہی غالب آ جاتا تھا۔

عشق کا سر نہاں جان تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

اور اس کی آواز کی سرسراہٹوں میں کسی تتلی کے نازک پروں کی سی کومل آواز رفتہ رفتہ ابھر کر ماحول پہ چھانے لگی تھی۔

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

اسی نظم پر ڈرامے کا اختتام ہوا تھا۔ پردے برابر ہوئے تو تالیوں کا شور سن کر پردے کے پیچھے تمام طلباء طالبات چیخیں مار مار کر اپنی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے لگے تھے۔ ماورا کسی کو اپنی طرف متوجہ ہونے کا موقع دیے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ گلابی شام میں سرمئی رنگ گھلنے لگا تھا۔ دن بھر کی تپش کا زور ٹوٹ گیا تھا اور ہوا میں قدرے ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہاں چائے کا دور چلنا تھا۔ اس لیے اکا دکا اسٹوڈنٹ ہی باہر نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھیمی رفتار سے چلتے ہوئے روش تک آ گئی تھی۔ بیگ کندھے سے لٹکا کر اس نے روش کے کنارے لگے پودوں سے خوب کھلے کھلے دو چار پھول توڑ کر ہاتھوں میں بھر لیے۔

عشق کا سر نہاں جان تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے

اس کی نگاہ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی پر جمی تھی۔

عشق کا سر نہاں جان تپاں ہے جس سے

تنہائی میں گانے کا اپنا ہی لطف تھا۔ وہ ایک ہی شعر کی تکرار کر رہی تھی نجانے کیوں۔
اپنی آواز کے پس منظر میں ابھرتی ایک اور آواز۔ کسی قدر واضح اور دلفریب تھی۔

آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
آج اقرار کریں اور۔۔۔۔

قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔ اس نے لب بھینچ لیے اور سر جھکا کر اپنے قدم گننے لگی۔ نجانے کیوں تھکن سے محسوس ہو رہی تھی۔

کام بھی تو بہت مشقت طلب تھا۔ دو دن تک مسلسل ایک ہی نظم کی ریہرسل اور وہ بھی ہارون اسرار کی معیت میں۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔

''خود کو صاف شفاف و کھرا ثابت کرنے کے لیے اپنی ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہونے کے لیے انسان کتنے کشٹ اٹھاتا ہے۔''

اس نے سر اٹھایا اور پھر اپنے برابر چلتے ہارون اسرار کو دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔

''اندھیرا ہونے کو ہے۔۔۔ کہو تو میں چھوڑ آؤں؟'' اس نے راہ میں آئے کنکر کو اپنی ٹھوکر سے اڑایا۔

ماورا نے چلتے چلتے گردن موڑ کر بغور اسے دیکھا۔ اس روز کا کوئی ایک تاثر بھی اس کے چہرے پہ نہ تھا۔

''اور یہ شخص ایک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلا آیا ہے۔''
اس کا دل چاہا ایک لمحے کے لیے رک کر اسے کہہ دے۔

''تم ناز و نعم میں پلے ہو ہارون اسرار! محبت کا ذرا سا دکھ تمہاری برداشت سے باہر ہوا تو تم سب کچھ بھلائے ایک بار پھر میرے سامنے کھڑے ہو۔۔۔ مجھے دیکھو۔۔۔ دکھوں کی تیرگی میں روشنیوں کو کھوجتی ہوں کہ زندگی بتا سکوں۔ محبت کی راہ میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ اس کا اختتام بھی کسی تاریک منزل پر ہوا تو شاید جی نہ پاؤں۔ اعتبار کرنے میں وقت تو لگتا ہے نا؟'' وہ دونوں یونیورسٹی سے باہر آ چکے تھے۔

بس اس کے عین سامنے آ کر رکی تو وہ بغیر وقت ضائع کیے اس پر سوار ہو گئی۔ ہارون اسرار نے وہیں سے اپنے قدم واپس موڑ لیے۔

کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے اس نے کوئی چوتھی مرتبہ اپنا بیگ کھول کر دیکھا اور پھر بند کر دیا۔ تہمینہ سے ادھار لیے گئے روپوں میں سے بس اتنے باقی تھے کہ وہ واپسی کا کرایہ ہو جاتا۔ اور اس کے بعد۔۔۔ ذہن پر ایک نئی فکر سوار ہوئی تو لیکچر میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

زمانی بیگم سے کچھ مانگنا اس کے لیے باعثِ شرم تھا۔ یہ کیا کم تھا کہ دو کمروں کے اس مکان میں پانچ افراد کے ساتھ رہنے کے لیے اسے چھت فراہم کر دی گئی تھی۔ ان کا تو پہلے پورا نہ پڑتا تھا، تعلیمی اخراجات کہاں سے اٹھائیں۔ اور کیوں۔۔۔؟'' آخر اس کا ان سے رشتہ ہی کیا تھا۔

''تو پھر۔۔۔؟ کیا کروں۔۔۔؟'' وہ سر تھام کر بیٹھ گئی، خبر ہی نہ ہوئی کب پیریڈ ختم ہوا۔ کب کلاس روم خالی ہوا۔ اور کب لیلیٰ اور احمد کیانی اس کے سر پر آ پہنچے۔

''اٹھ جائیے محترمہ! اٹھ جائیے۔ وہاں ایک پوری بٹالین آپ کا انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر نا سمجھی کے عالم میں ان دونوں کو دیکھا۔

''آپ کو تو پکا پکایا ملے گا، آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ ذرا ہم سے پوچھئے، کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں؟'' لیلیٰ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔ احمد کیانی ٹھنڈی آہیں بھر کے خود کو آزردہ افسردہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''یہ جو ہمارے ڈرامیٹک سوسائٹی کے صدر ہیں نا۔ اول نمبر کے کنجوس۔ پیسہ ان کی جیب سے بڑی مشکل سے نکلتا ہے۔ ابھی بھی بڑی دقتوں سے انہیں یہ ٹریٹ دینے پر آمادہ کیا ہے۔'' وہ اسے ساتھ لے کر لان کے ایک سرسبز گوشے میں چلی آئی تھی۔ جہاں ڈرامے میں حصہ لینے والے تمام اسٹوڈنٹس موجود تھے اور خوب ہلڑ بازی کر رہے تھے۔

''ارے واہ۔۔۔ واہ لڑکی! تم نے تو کل کمال ہی کر دیا۔۔۔'' اسے دیکھتے ہی کسی ایک نے نعرہ لگایا تھا۔

''اب پتا چلا یہ اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟''
''کیوں؟''

''تا کہ اس کی آواز کو نظر نہ لگے۔۔۔'' ان لوگوں کی تعریف کا اپنا ایک انداز تھا۔ سو وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے ایک کونے میں جا بیٹھی۔

''آئس کریم پگھل رہی ہے۔ خدارا اسے جلد از جلد کھا لیا جائے۔'' علی نور کے اعلان پر وہ سب آئس کریم پر ٹوٹ پڑے۔

وہ پگھلتی ہوئی آئس کریم کو چمچ سے مزید پگھلاتے ہوئے ان سب کے خوش باش چہروں کو دیکھنے لگی۔

''تم سا خوش قسمت اس دنیا میں کوئی نہیں۔ تم لوگ اپنے گھروں سے آتے ہو؟ واپسی پر تمہارے ماں باپ، بہن بھائی تمہاری راہ تکتے ہوں گے۔'' کیسی حسرت تڑپ رہی تھی اس کی آنکھوں میں۔۔ کوئی دیکھ لیتا تو کم از کم ایک بار اپنی ساری خوشیاں اس کے نام کر دینے کی دعا ضرور کر دیتا۔

''تم لوگ یہ عیاشیاں کر سکتے ہو کہ تمہیں عیش کرانے والے سلامت۔۔۔ یہاں تو خرچا پورا نہیں پڑتا۔۔۔'' وہ انہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح کیک اور پیزا پر ٹوٹتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''یہ لباس جو روز بروز اپنا رنگ کھوتا جا رہا ہے۔۔۔ یہ کب تک میرا ساتھ دے گا۔ اور کرائے کے لیے مزید روپے آنے تک مجھے کتنی چھٹیاں کرنی پڑیں گی۔'' وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ کر خود کو سوچنے لگتی۔ اسے اپنا آپ بہت سے کھلے ہوئے پھولوں کے درمیان مرجھائے ہوئے پھول کا سا لگ رہا تھا۔

''اللہ تم سب کی خوشیوں کو دوبالا کرے۔ تمہیں بری نظروں سے بچائے۔'' وہ رخ بدل کر پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں میں آیا پانی اپنے اندر اتارنے لگی۔

''ماورا سے کہو، ہمیں وہ نظم دوبارہ سنائے۔ کل تو ڈھنگ سے سن ہی نہ پائے تھے۔''
''ہاں۔۔۔ ہاں ضرور۔۔۔'' وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بمشکل مسکرا پائی۔
''آج نہیں۔۔۔ پھر کسی دن سناؤں گی۔ اور پلیز اگر آپ لوگ ناراض نہ ہوں تو مجھے ایک بہت

ضروری کام سے جانا ہے۔'' وہ ان سے اجازت لے کر اٹھ آئی تھی۔

آئیے ہاتھ اٹھائیں، ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں

وہ سب لوگ اپنی اپنی آوازوں میں گا رہے تھے۔

''اے۔۔۔اے رکو۔۔۔'' وہ ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ احمد کیانی نے اسے جا لیا تھا۔

''یہ کل شام کی رپورٹ کے کچھ چیدہ چیدہ پوائنٹس ہیں۔ تمہیں اس رپورٹ کو بہت تفصیل سے لکھنا ہوگا۔''

''مجھے۔۔۔؟'' اس نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں بھئی۔۔۔ اسی شرط پہ تو میں ایک ہفتے کی چھٹی پر جا رہا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں بھی سارے کام بحسن وخوبی انجام پاتے جائیں گے۔ وہ ہارون اسرار صاحب پڑھائی کے ساتھ ساتھ بزنس سنبھالنے کے کھڑاگ نہ پال رہے ہوتے تو شاید مجھے آپ کے نازک کندھوں پر یہ ذمہ داری نہ ڈالنی پڑتی۔۔۔'' اس نے بڑے اطمینان سے وہ چند کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ ساتھ ہی ایک وزیٹنگ کارڈ۔

''باسم بھٹی سے بہت اچھے تعلقات ہیں میرے۔ یہ رپورٹ اسی کو پہنچانی ہے۔''

وہ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما کر واپس ہوا، مگر دو قدم چل کر پھر سے رک گیا۔

''مجھے یقین ہے، اس نظم کی طرح تم یہ رپورٹ بھی بہت خوبصورتی سے پیش کرو گی۔ وہ بہت آرام سے کہہ کر چلتا بنا۔

اس کا دل چاہا۔۔۔ ان کاغذات کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر کے اڑا دے۔

''ماورا اللہ جانے کل یہاں آتی بھی ہے یا نہیں۔ تم اپنی ذمہ داریاں بھی سونپ دو اسے۔ یہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہیں۔ رپورٹیں کیا خاک پیش ہوں گی۔''

وہ دانت کچکچاتی وہاں سے چل دی۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ احمد کیانی کے دیے گئے نکات کو اس نے خالص اپنے انداز میں لکھا تھا، اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کھلی کھڑکی میں آ بیٹھی۔۔۔ اب اسے اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا تھا۔

''ٹیوشنز، نوکری، یا۔۔۔'' اس نے پلٹ کر محوِ خواب تہمینہ کو دیکھا۔

''یونیورسٹی چھوڑ دی تو شاید، اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رہے۔'' اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اپنا سر کھڑکی کے کھلے پٹ سے ٹکا دیا تھا۔

''اور شاید اسی دن کے لیے کاکا جان کہا کرتے تھے۔ ''ڈگری بڑے کام کی چیز ہے۔ علم ہو نہ ہو۔ ڈگری ضرور ہونی چاہیے۔'' کاکا جان کا خیال آتے ہی وہ بری طرح چونکی۔

''اور ایک کام وہ بھی تو تھا جس کے ذریعے کاکا جان سارا گھر چلایا کرتے تھے۔ میری بھاری بھاری فیس بھی تو انہوں نے ہی ادا کی تھیں، تو پھر۔۔۔؟''

وہ قدرے پرجوش ہو کر بستر تک آئی۔ کاغذات کا پلندا ابھی بھی وہاں پڑا تھا۔۔۔ اس نے جھٹ سے قلم ہاتھ میں لے لیا۔

''لکھنے کو تو بہت کچھ ہوتا ہے۔۔۔ ادب، سیاست، خواتین کے مسائل، طلباء کے مسائل، حالاتِ حاضرہ۔۔۔؟ کیا لکھوں۔۔۔؟'' وہ تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی پھر جانے کیا سوچ کر عنوان لکھ ڈالا۔

''میرے گم شدہ۔۔۔''

دو مہربان ہاتھوں نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر خبر ہی نہ ہوئی اور وہ صفحے کے صفحے بھرتی چلی گئی اور جس وقت اس نے اختتامی لکیر کھینچی۔ گھڑی کی سوئی چار پر تھرک رہی تھی۔ اس نے سب کاغذات سمیٹ کر تکیے پر سر رکھا تو لمحوں میں غافل ہو گئی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تو پہلی نظر تہمینہ پر پڑی تھی جو گیلے بالوں میں کنگھی چلانے کے ساتھ ساتھ اسے جگانے کے لیے آوازیں لگا رہی تھی۔

''یونیورسٹی جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟''

''نہیں۔۔۔ آج کہیں اور جاؤں گی۔۔۔'' کروٹ بدلتے ہوئے اس نے سوئی سوئی سی آواز میں جواب دیا۔

''کہاں۔۔۔؟''

''پہلے اپنے گھر، پھر ایک اخبار کے دفتر۔۔۔؟'' تہمینہ نے اس کے جواب پر خاصی حیرت سے دیکھا۔

''گھر کیا کرنے جاؤ گی؟''

''کاکا جان ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کوئی ادھورا، پورا ناول یا کالم ایسا ہو جو میرے کام آ سکے۔ ان کی سب ہی چیزیں سمیٹ لاؤں گی۔۔۔'' وہ بال سمیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''بلکہ دل چاہے تو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔۔۔ اور دیکھنا، میرا گھر کتنا خوبصورت ہے۔؟ آڑو تو خوب پک چکے ہوں۔۔۔ ہم سارا پھل توڑ لائیں گے مینا! واپسی پر ایک اخبار کے دفتر اور وہاں سے یہاں۔۔۔''

''چلیں گے، ضرور چلیں گے۔۔۔ لیکن پہلے تم غسل خانے سے ہو آؤ۔۔۔ ورنہ بعد میں پانی نہ ملنے پر مجھ سے شکایت مت کرنا۔'' تہمینہ نے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

لکڑی کا خستہ حال دروازہ جس پر دستک دینے کے لیے اس کی ساری توانائی اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سمٹ آتی تھی، آج کھلا ہوا تھا۔۔۔ وہ ایک پل کے لیے دہلیز پہ ٹھٹک گئی اور پھر دروازے کو چوپٹ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئی۔

''ارے، اللہ کی زمین جان کر یہ کن لوگوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں یہاں؟'' اس نے بے اختیار ہی ساتھ چلتی تہمینہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ آٹھ دس لڑکے تھے جو آزادانہ پورے گھر میں گھوم رہے تھے۔ ان کے قہقہے، ان کی باتیں۔ فضا میں جیسے رچ بس گئی تھیں۔

برآمدے سے باہر آتے دو لڑکوں نے انہیں وہاں کھڑا دیکھا تو اسی طرف چلے آئے۔
''جی فرمائیے۔۔۔'' ان کی سوالیہ نظروں نے ماورا کا دل مٹھی میں بھینچ لیا۔
تہمینہ اس سے آگے بڑھ آئی تھی۔
''کون ہو تم لوگ۔۔۔؟'' ''کب سے یہاں رہ رہے ہو؟''
تہمینہ پوچھ گچھ کرنے لگی تھی۔ وہ دوسری طرف چلی آئی۔
گھاس مسلی ہوئی اور درخت پھلوں سے خالی تھے۔ حوض کنارے شیونگ کا سامان پڑا تھا اور گدلے پانی پر جھاگ تیر رہی تھی۔۔۔ شاخوں میں رکھے چڑیوں کے پانی کے کٹورے غائب، اور ننھی چڑیاں شور مچا مچا کر جیسے اس سے شکایت کر رہی تھیں۔
''ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ لڑکے ہیں۔ اور سبھی کرایہ دیتے ہیں۔ مفت تو کوئی نہیں رہتا۔۔۔'' ایک لڑکا بتانے لگا۔
وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ آئی۔ ابا کے کمرے میں جھانکتے ہوئے اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔
وہاں ابا کی چارپائی ہوتی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلی نظر ان پر پڑتی تھی۔ اب وہاں چارپائی کی جگہ زمین پر بستر بچھے تھے۔۔۔ اور ایک لڑکا تندہی سے کپڑوں پر استری کر رہا تھا۔
''یہ کاکا جان کا کمرا۔۔۔ یہ میرا۔۔۔ یہ باورچی خانہ۔۔۔'' باورچی خانے کے سوا دونوں کمرے بند تھے، اور ان پر لگے تالوں میں اس کے پاس موجود چابیوں میں سے کوئی چابی نہ لگی تھی۔ تب ہی تہمینہ تیزی سے اس کی طرف آئی اور تقریباً کھینچتے ہوئے باہر نکلی۔
''اس سے پہلے کہ سلیم آجائے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''
دروازے سے باہر نکلتے ہی وہ ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مگر تہمینہ رکی نہیں۔ گھر سے دور سڑک کے قریب پہنچ کر وہ ذرا دیر کے لیے ٹھہری۔ اس کے روانی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔
''سلیم نے بہت برا کیا ہے۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے فائدے کے لیے۔۔۔''
''آبادی سے دور۔۔۔ فصلوں، کھیتوں کے درمیان تنہا گھر، دو چار گھر آس پاس بس رہے ہوتے تو سلیم کی اتنی جرأت نہ ہوتی۔ اسے تو ہر مہینے اچھی خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔'' تہمینہ اس کے دکھ میں برابر کی شریک تھی۔
''اب کہاں چلنا ہے؟''
''گھر چلتے ہیں۔''
''گھر۔۔۔'' تہمینہ نے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔
''اس حالت میں، میں تمہیں کبھی بھی گھر نہیں لے جاؤں گی۔ زمانی بیگم ذرا پوچھیں گی اور تم جھر جھر ان کے سامنے آنسو بہانے لگو گی۔'' تہمینہ وہیں اس کے ساتھ سڑک کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔
''میری ایک بات دھیان سے سن لو ماورا! اس معاملے کی زمانی بیگم کو بھنک نہ پڑنے دینا۔ وہ لاکھ اچھی عورت سہی مگر ہے تو سلیم کی ماں۔۔۔ کرائے کے گھر میں رہتی ہے۔ سلیم نے تو در پردہ تمہیں دھوکا دیا ہے۔ وہ تمہارے سامنے بیٹھ کر کاغذات پہ تم سے دستخط لے گی۔ اور تم اس کے لہجے کی مٹھاس میں کوئی

کھوٹ نہ تلاش کر پاؤ گی۔''
''تہمینہ!'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔
وہ غمزدہ سی ہو کر ہنس دی۔
''تم نے ابھی صرف دنیا دیکھی ہے ماورا! میں نے پرکھی ہے۔ چلو اخبار کے دفتر چلتے ہیں۔'' ماورا گم صم سے انداز میں اس کے ساتھ چل دی تھی۔
''تہمینہ! وہ میرا گھر ہے نا۔۔۔؟ مجھ سے چھن تو نہ جائے گا۔'' وہ چلتے چلتے یونہی پوچھ رہی تھی۔
''کاکا جان بھی تو لوٹ کر نہیں آئے مینا! یہ اتنے سارے دکھ اللہ نے صرف ہماری قسمت میں ہی کیوں لکھ دیے ہیں؟'' کولتار کی سیاہ سڑک پر ان کے تھکے تھکے قدموں کے نشان لحہ بہ لحہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔
باہر کے آگ برساتے ماحول کی نسبت اندر کی فضا بے حد پُرسکون اور ٹھنڈی تھی۔ نرم صوفے میں دھنستے ہوئے ماورا نے کارڈ نکال کر پیون کے حوالے کر دیا تھا۔
''باسم بھٹی کے ہاں میں دو بار جا چکی ہوں۔ ایک بار اس کے والد کا جشنِ صحت منایا گیا تب اور دوسری بار غالباً اس اخبار کو کوئی ایوارڈ ملنے پر۔۔۔ اس کا پورا گھرانہ بہت ملنسار ہے۔'' تہمینہ اس کے چہرے پہ پھیلے سوچ اور تفکر کو اپنی باتوں سے کم کرنا چاہ رہی تھی۔
''تہمینہ! اگر کاکا جان ۔۔۔ کبھی واپس نہ آئے۔ تو کیا میں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گی؟'' اپنی سوچ میں ڈوبتے ابھرتے اس نے معلوم نہیں تہمینہ کی بات سنی بھی تھی یا نہیں۔
تہمینہ کو ایک دم چپ نے آلیا تو وہ ہتھیلیاں کھول کر یونہی اپنی لکیروں کو دیکھتی رہی۔ تب ہی باسم بھٹی نے انہیں اندر بلوا لیا تھا۔
روشن، سرد ماحول میں اے سی کی سرسراہٹوں کے ساتھ مردانہ گفتگو اور ہنسی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ شیشے کی وسیع میز پر بہت سی تصاویر بکھری ہوئی تھیں۔ باسم بھٹی ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا اس کی کرسی کی پشت پر ایک ہاتھ ٹکائے دوسرے ہاتھ میں ایک تصویر تھام کر کچھ کہتا ہوا ہارون اسرار ماورا کو اندر آتے دیکھ کر بری طرح چونکا تھا تو ایک پل کے لیے اس کے جسم میں بھی خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ہارون اسرار نے ایک ایک کر کے وہ تصاویر اکٹھی کیں اور میز کی پہلی دراز میں رکھ کر خود بہت اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی پر بیٹھ گیا۔
باسم بھٹی، تہمینہ سے حال چال دریافت کرنے لگا۔ ماورا نے فائل میں سے رپورٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔
''بہت اچھا ہوا جو آپ جلدی آ گئیں۔ میں نے احمد کیانی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ کل کے اخبار میں رنگین تصاویر کے ساتھ پہلے صفحے پہ یہ رپورٹ لگ جائے گی۔'' باسم نے کہتے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔
''کیا پئیں گی آپ لوگ۔۔۔؟'' وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''شکریہ۔۔۔ ہم لوگ ذرا جلدی میں ہیں۔'' ماورا نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذات پر ڈالی اور پھر انہیں فائل میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے اٹھتے دیکھ کر تہمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم اپنے کالم بھی تو ساتھ لائی تھیں؟"

"ابھی مجھے جلدی ہے تہمینہ! پھر کبھی سہی۔۔۔" اس نے بے بسی سے تہمینہ کو دیکھا۔

"کیسا کالم؟" باسم بھٹی نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تو تہمینہ نے فائل اس کے ہاتھوں سے لے کر باسم کے سامنے رکھ دی۔

ماورا اپنی سرد ہوتی پوروں کے ساتھ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ خود پر مرکوز دو آنکھیں اسے بُری طرح ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

"میرے گم شدہ!" باسم نے با آواز بلند پڑھا اور پھر قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ خود پر ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ آنکھیں جھکائے نہ کھڑی ہوتی تو آنسو بہہ کر اس کے سارے بھید کھول چکے ہوتے۔

"اب انہیں دراز کی نچلی تہہ میں گلنے سڑنے کے لیے مت رکھ لیجیے گا باسم صاحب! آپ انہیں پڑھیے اور بتایے یہ چھپنے لائق ہیں یا نہیں۔"

"میں جا رہی ہوں تہمینہ! وہ دروازے کی طرف پلٹی جب بہت اطمینان سے بیٹھا ہوا ہارون ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بیٹھ جاؤ ماورا! میں جا رہا ہوں۔"

"میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بمشکل کہہ پائی۔

"یہ حسرت تو شاید ہارون اسرار دل میں لیے ہی مر جائے گا کہ آپ کچھ کہیں اور وہ سنے۔" اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مدھم لہجے میں کہا مگر تہمینہ اپنی جگہ بری طرح چونک گئی۔

"ہارون اسرار۔۔۔" وہ زیر لب بڑبڑائی اور پھر فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ۔۔۔" اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہارون اسرار کو روکا۔

"آپ ہارون اسرار ہیں؟"

"جی۔۔۔" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا آپ چند منٹ کے لیے مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے۔" تہمینہ کی بات سن کر ماورا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جی بھر کر اس ایک دن کے لیے پچھتائی جب کسی کمزور لمحے کی زد میں خود پر قابو نہ رکھتے ہوئے اس نے کہہ ڈالا تھا۔

"تہمینہ! ایک لڑکا ہے ہارون اسرار۔۔۔ اور وہ دعوا کرتا ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔" اس وقت تہمینہ نے محبت کی تباہ کاریوں پر پورا لیکچر دیا تھا اسے۔

"اور اب یہ کیا بات کرنے جا رہی ہے اس سے۔" وہ تیز تیز قدم چلتی آفس سے باہر نکل کر ان دونوں تک پہنچی۔

"تہمینہ! جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"مجھے ذرا۔۔۔"

"تہمینہ۔۔۔ تم۔۔۔ میں نے کہا نا تم چلو یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔۔۔"

وہ اسے تقریباً کھینچ کر لے جانا چاہ رہی تھی مگر تہمینہ بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

"پاگل ہوئی ہو ماورا! مجھے اس سے بات تو کرنے دو۔" تہمینہ بری طرح چڑی۔

"تم میرے معاملات میں حد سے زیادہ دخل اندازی کر رہی ہو۔۔۔" بے بسی کے شدید احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ کر رہی ہوں تو۔۔۔" تہمینہ کٹھور ہو سکتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ چند لمحے اسے غصے سے گھورتے رہنے کے بعد اس نے ایک دم تہمینہ کو دھکا دیا اور خود بری طرح روتی ہوئی بھاگ کر سیڑھیاں اتر گئی۔

"میں تم سے زندگی بھر بات نہیں کروں گی تہمینہ۔"

☆☆☆

"محبت کا کوئی وجود نہیں ہوتا ہارون اسرار! اس کے لیے ثبوت دینا پڑتا ہے۔ تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے تو جاؤ اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنی محبت کو ثبوت دو، تمہاری خالی خولی محبت اس کے کسی کام کی نہیں۔۔۔" وہ بہت اطمینان سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہنے لگی۔

"اس کا گھر چھینا جا رہا ہے اس سے۔۔۔ زمانے کی سنگدلی نے ایک سیّد زادی کو ہم جیسوں کی صحبت میں لا پھینکا ہے۔ وہ کہاں تک مقابلہ کر پائے گی حالات کا، ایسا نہ ہو کہ کوئی دن آئے اور تمہیں ماورا اور تہمینہ میں کوئی فرق نظر نہ آئے۔ یہ کم مائیگی وقت کے سیاہ ہاتھوں نے میرے نصیب میں تو لکھ دی ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ اس معصوم لڑکی کی شامیں بھی یونہی داغدار ہوں۔۔۔ جو غم اور دکھ میرے حصے میں آیا ہے۔ میں نہیں چاہتی وہ بھی ان ہی کیفیات سے گزرے۔" اس کی نیت کی سچائی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

ہارون اسرار کو اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں گہرا دکھ محسوس ہوا تھا۔

"لڑکیوں کو محبت کی، عاشق کی ضرورت نہیں ہوتی ہارون۔۔۔! انہیں ایک محافظ درکار ہوتا ہے۔ ایک ایسا سایہ جو انہیں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھ سکے۔ وہ نادان ہے، انا کے خول میں جکڑی ہے۔۔۔ وہ کم مایہ نہیں مگر کم مائیگی کے خوف میں جکڑی ہوئی ہے اور یہ ہی خوف اسے تم تک آنے نہیں دیتا۔"

ہارون اسرار نے جیسے بہت کچھ سوچتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"اس نے مجھے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ دیتی اپنے حالات سے متعلق تو۔۔۔"

"وہ مر کے بھی تمہیں آگاہ نہ کرتی ہارون اسرار۔۔۔! لیکن اب تو جو بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔۔۔ دیکھتی ہوں تمہاری محبت میں کتنا دم خم ہے۔۔۔؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھی تو اس کے چیلنجنگ انداز پر ہارون بے اختیار مسکرا دیا۔

"اگر ایسی بات ہے تو جاؤ۔۔۔ اور کل تک کے لیے میرا انتظار کرو۔۔۔ مجھے ایک وقت میں بہت سے محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ پھر بھی تمہیں یقین سے کہتا ہوں کہ دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ اس سے کہنا کچھ انتظار کرنا پڑے تو مایوس مت ہو۔"

اس کے انداز میں کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی۔ تہمینہ سر ہلاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔

تہمینہ چپ چاپ بیٹھی بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''رو لو۔۔۔ جی بھر کے رو لو۔۔۔ کہ آج تم پھانسی کے تختے پہ کھڑی ہو، اور فیصلہ کسی اور کو کرنا ہے۔۔۔ یا تو بچا لے گا تمہیں۔۔۔ یا تختہ کھینچ لے گا۔'' کرسی جھلاتے ہوئے وہ ایکدم ہی اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

''تم نے برا کیا ہے تہمینہ۔۔۔! تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا؟'' وہ روتے روتے چلا اٹھی۔

''کیا برا کیا میں نے پگلی۔۔۔!''

''مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا، کیا کیا کہانیاں سنائی ہوں گی تم نے اسے۔ میری مجبوری کی۔ بے بسی کی، لاچاری کی۔''

''میں نے اسے صرف حقیقت بتائی تھی، یہ مصیبتیں، یہ آفتیں ہماری اپنی نازل کردہ نہیں ہوتیں۔ حالات اور مسائل کا شکار کوئی بھی ہو سکتا۔۔۔ اور پاتال میں گرنے سے بہتر ہے تم اپنی نظروں سے گر جاؤ۔'' اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

''وہ مجھے اپنا بھی لے گا تہمینہ! تو بتاؤ میری کیا حیثیت ہو گی اس کے نزدیک۔ کیا مقام، کیا مرتبہ دے پائے گا وہ مجھے۔۔۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔

''نری پاگل ہو تم۔۔۔؟'' وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

''یہاں تمہاری کیا حیثیت ہے؟ کیا مقام ہے؟ ڈری سہمی رہتی ہو۔ کسی نے کھانے کے لیے دیا تو کھا لیا۔ جہاں لٹا دیا پڑ گئی۔ سنو! جو شخص معاشرے کے رسم ورواج سے، اپنوں سے لڑ کے تمہیں اپنانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اس کا ظرف یقیناً اتنا بڑا ہو گا کہ تمہارے لیے درست مقام اور حیثیت کا تعین کر سکے۔''

''باجی تہمینہ، ماورا۔۔۔!'' نائلہ کی پاٹ دار آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ 'باہر لمبی سی گاڑی میں ایک لڑکا آوے ہے۔ اپنا نام ہارون اسرار بولے ہے۔۔۔ اب بولو، آگے بھیجوں کہ یہیں سے لوٹا دوں۔۔۔''

''تمہارے منہ میں خاک، خبردار جو لوٹانے کی بات کی۔'' تہمینہ اٹھ کر باہر بھاگی۔

ماورا سرخ آنکھوں نم پلکوں سمیت کمرے کی دہلیز پہ آ کھڑی ہوئی۔

''ہارون سچ مچ آ گیا۔۔۔'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

''یہ وہی ہارون اسرار ہے جس نے ایک گائیکہ کی بیٹی اور دوسری گائیکہ کی بہن ہونے پر مجھے دس باتیں سنا ڈالی تھیں۔ اور آج، آج وہ اسی گائیکہ کے در پہ آ کھڑا ہوا ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔'' وہ لڑکھڑا کر دروازے سے جا لگی۔

''معاف کرنا تہمینہ! سہرا باندھ کر نہیں آ سکا۔۔۔ اب بتاؤ جلدی سے نکاح کے دو بول پڑھوا لوں، یا باجوں نقاروں کے اہتمام کے ساتھ اسے لے جانے کے لیے آؤں؟''

''فی الحال تمہارا یہاں آنا ہی کافی ہے ہارون! اب تم یہیں سے لوٹ جاؤ۔ یہ جگہ یہ مقام تمہارے شایانِ شان نہیں۔ ہم تمہیں سہرا باندھ کر وہیں بلائیں گے۔ جہاں تم سر اٹھا کر آ سکو۔۔۔'' تہمینہ جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تمہاری محبت کو سلام ہے ہارون اسراد! تم نے ماورا کو تہمینہ بننے سے بچا لیا۔''

☆☆☆

''ماورا! ما اورا۔۔۔!'' یہ آواز سلیم کی تھی۔

سامان سمیٹتے ہوئے اس کے ہاتھ رک سے گئے۔۔۔ کھلے دروازے پر زوردار دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو۔۔۔؟'' اسے اپنے کپڑے بیگ میں رکھتے دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔

''اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہی ہوں'' اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔

''ہاں۔۔۔ تم پہلے بھی وہاں آئی تھیں۔ مجھے آج ہی پتا چلا۔۔۔ لیکن وہاں میرا مطلب ہے ابھی تو۔۔۔؟'' سلیم اچھا خاصا پریشان ہو رہا تھا۔

''وہ میرا نہیں، تمہارا مسئلہ ہے سلیم! میں اس مکان کی مالک ہوں۔ اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ میرے علم میں لائے بغیر میری جائیداد کو کسی بھی طرح استعمال کرے۔''

وہ بہت عام سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ سلیم کتنے ہی پل لب بھینچے کھڑا رہا۔

''اور یہ ہارون اسرار کا کیا معاملہ ہے؟ تم اس پہ اندھا دھند اعتماد کر رہی ہو۔ جب کہ تم اسے جانتی بھی نہیں۔ کچھ خبر ہے وہ کتنا بڑا کرپٹ انسان ہے۔ ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرے گا وہ تمہیں اور دوبارہ اسی ڈسٹ بن میں لا کر پھینکے گا۔''

وہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ تاسف سے اسے دیکھتی رہی پھر جیسے تھک ہار کر چارپائی پر جا بیٹھی۔

''تم کیسے، ہوا کرتے تھے سلیم۔۔۔؟ سادہ۔۔۔ بے لوث۔۔۔ بے ریا۔۔۔ ذمہ دار۔۔۔ یا پھر شاید میں ہی تمہیں ایسا سمجھا کرتی تھی۔ تمہاری پہلی پہلی تصویر کے سارے رنگ کتنے شفاف تھے جو رفتہ رفتہ اتنے دھندلائے ہیں کہ تمہاری شکل کہیں گم ہی ہو گئی۔۔۔'' وہ چادر سے نادیدہ گرد جھاڑ رہی تھی۔

''اور ہارون اسرار کا کیا کہتے ہو سلیم! میں اسے نہیں جانتی مگر تم سے تو واقف تھی نا۔۔۔؟ تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔۔۔؟ پہلی بار تو تم نے ہی مجھے اس ڈسٹ بن میں لا پھینکا تھا۔'' وہ چبھتے لہجے میں کہتے ہوئے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ نیچے بازار میں بلا کا رش تھا اور شور یہاں تک پہنچ رہا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔'' سلیم کی آنکھیں اس کا ساتھ نہ دے رہی تھیں۔

''سو تم نے مجھے اس ماحول میں لا چھوڑا۔ اسی ماحول میں، جس سے نفرت کی بنا پر تم نے کبھی اپنے خونی رشتوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اپنی ماں کو ممتا کے حق سے محروم کر دیا تھا۔'' وہ کھڑکی بند کر کے اس کی طرف پلٹی۔

''تم اتنے خود غرض ہو سلیم کہ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتے ہو۔ ہر رشتہ توڑ سکتے

ہو۔ ہر احساس بھلا سکتے ہو۔ مجھے یہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے تھے سلیم اور تم وہاں میرے ہی گھر میں، میری اجازت کے بغیر لڑکوں کی ایک فوج بٹھائے ان سے کرایہ وصول کرتے رہے۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرے جانے والے تم پر کتنا اعتماد کرتے تھے۔"

"میں تمہیں بتا دیتا ماورا۔۔۔ !ابھی تو کچھ ہی دن۔۔۔" وہ اپنا دفاع کرنے میں ناکام رہا۔

"چپ رہو سلیم! میں جانتی ہوں تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے۔ میں شام تک گھر واپس آنا چاہتی ہوں اور میرا گھر مجھے خالی ملنا چاہیے۔"

وہ دوبارہ سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ سلیم کچھ دیر وہاں کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر ہارے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ بے دم سی ہو کر چارپائی پر گر گئی۔

"ایک تم ہی تو تھے سلیم! جو میرے ماضی کی خوبصورت یادوں کے امین تھے۔ تم نے کاکا جان کو سنا تھا۔ تم نے ابا کو دیکھا تھا۔ تمہیں ان دونوں کی شفقت ملی تھی۔ ابھی تو تمہارے ساتھ مجھے ان کی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ ان کی یادوں کو مل بانٹ کر یاد کرنا تھا۔ لیکن تم نے۔۔۔ سلیم! تم نے میری ہر خواہش کو پورا ہونے سے پہلے ہی روند ڈالا تم بہت برے ہو سلیم! بہت برے۔" اس کی آنکھوں کے گوشے بری طرح بھیگنے لگے۔

☆☆☆

وہ اس کے سامنے محوِ خواب تھا۔ ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں اس کی اجلی رنگت کالو دیتا سنہرا پن، کشادہ پیشانی پر بکھرے سیاہ بال، بھرے بھرے گداز عنابی ہونٹ اور ہونٹوں کے برابر دائیں گال پر ٹھہرا سیاہ تل۔

وہ حیران حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ دیوتاؤں کا سا حسن مجھے اس شخص میں پہلے کبھی نظر کیوں نہ آیا تھا۔"

بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے نرمی سے اس تل کو چھوا جو اس کے مسکرانے سے پہلے مسکرا دیا کرتا تھا۔

"کس نیکی کا بدلہ ہو تم ہارون اسرار! کس کی دعاؤں کے عوض ملے ہو تم کہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہوں بھی تو ادا نہیں کر سکتی۔"

وہ اٹھ کر دبے قدموں باہر آ گئی۔ رات بھر کی آندھی اور بارش نے ڈھنگ سے سونے ہی نہ دیا تھا۔ سو وہ اسے ڈسٹرب کیے بغیر نکل آئی۔ باہر کی ہوا میں بارش کی ٹھنڈک کا اثر تھا، بہت خوشگوار مساموں میں اتر کر وجود کو تر و تازہ کر دینے والی ٹھنڈک۔

زینب جاگ اٹھی تھی اور اب شڑاپ شڑاپ برآمدہ دھو رہی تھی۔ وہ برآمدے سے نکل کر لان میں آ گئی۔ جس میں اب پہلے کی سی بے ترتیبی نہ رہی تھی۔ تراشیدہ گھاس بارش کے پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ درختوں سے قطرہ قطرہ پانی ابھی بھی ٹپک رہا تھا، بیری کے درخت پر طوطوں کی ٹائیں ٹائیں نے شور مچا رکھا تھا۔ وہ یونہی چلتی ہوئی حوض کنارے آ گئی۔ صاف ستھرے پانی میں تیرتی سینکڑوں کلیوں نے پانی کو معطر کر رکھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر اس میں کلیوں سمیت پانی بھرا ہی تھا جب ایک دم کسی نے آ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔ اس نے بغیر دیکھے پلٹ کر وہ پانی اس کی طرف اچھالا تو ہارون

اسرار کا جاندار قہقہہ فضا کی خوشگواریت میں مزید اضافہ کر گیا۔

"یہ تو تمہارے بالوں میں ہی اچھی لگے گی۔" اس نے گریبان میں اٹکی ایک کلی اس کے بالوں میں سجانی چاہی۔

"یہ کلی تو ہماری رقیب ٹھہری صاحب! ہم اسے کیونکر سجائیں گے بالوں میں۔"

اس نے وہ کلی دوبارہ سے حوض کی طرف اچھالی تو وہ قدرے حیران ہوتے ہوئے ہنس دیا تھا۔

"بہت باتیں بنانے لگی ہو تم؟"

"آپ کی صحبت کا اعجاز ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اور کیا سیکھا ہے ہماری صحبت میں۔۔۔" اس نے درخت کی شاخ کو جھٹکا دے کر پانی کے بہت سے قطرے اس پر گرائے۔

"میں نے جانا ہے کہ
محبت موسم نہیں
اپنی مدت پوری کرے
اور رخصت ہو جائے
محبت ساون نہیں، ٹوٹ کر برسے
محبت آگ نہیں، سلگے بھڑکے
اور بجھ جائے
محبت آفتاب نہیں، ابھرے چمکے اور ڈھل جائے
محبت تو چاند کی مانند ہے
جو بڑھتا ہے، گھٹتا ہے
نکلتا ہے، چھپتا ہے
مگر کبھی فنا نہیں ہوتا

وہ سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک پل کو جانے کیا ہوا کہ اس نے فوراً اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔

"پگلی!" اس کی پلکوں پہ نمی سی محسوس کرتے ہوئے ہارون نے اسے بھرپور محبت سے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"میں نے تم سے تمہارے لیے نہیں اپنے لیے محبت کی تھی ماورا! بلکہ محبت کی نہیں ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ تم میری ذات کا حصہ تھیں اور مجھے مل کر بالآخر تمہیں مجھے مکمل کرنا ہی تھا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح اس کی جذباتیت کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی تھی۔

"چلو۔۔۔ ناشتا لگ گیا ہو گا۔۔۔"

"آپ چلیں، فریش ہو جائیں۔ میں تب تک آ رہی ہوں۔"

"او کے۔۔۔" وہ سر ہلاتا کمرے کی طرف بڑھا۔

"مجھے معلوم ہے ہارون اسرار! تم اپنی محبت کو کبھی مجھ پر بوجھ نہیں بننے دو گے۔ باوجود اس کے کہ

میری محبت تم پر بہت سا بوجھ لاد چکی ہے۔'' وہ وہیں بیٹھ کر حوض کے پانی میں انگلیاں چلانے لگی تھی۔

''والدین کی ناراضی سہنا آسان کام نہیں، مگر دل کی حالت جو بھی ہو میرے لیے مسکراہٹ تمہارے لبوں سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ فاصلے بھی ایک دن تمام ہو جائیں گے ہارون! تمہارے سچے اور کھرے جذبات پر مجھ سے بڑھ کر یقین اور کسے ہوگا؟''

''صاحب بلا رہے ہیں۔۔۔'' زینب نے قریب آ کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ وہ چونک کر پلٹی۔ لڑکا دودھ لے کر آ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہوگئی۔

''ابا کے آنے کی تو کوئی امید نہیں کاکا! مگر ہر آہٹ پر آپ کے آنے کا گمان ہوتا ہے۔ کبھی آ ئیے تو آپ کو دکھاؤں کہ۔

درخت اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں
کہیں کسی شاخِ سبز کی اوڑھنی پہ
ہلکی سنہری گوٹ لگ رہی ہے
کہیں کسی زرد رنگ پتی کا حاشیہ سرخ ہو رہا ہے
کہیں قبائے شجر گلابی سی ہوگئی ہے
کہیں ہرے پیڑ زرد نارنج چادریں اوڑھنے لگے ہیں
کہیں فقط قرمزی روشنی درختوں پہ اپنا ہالہ کیے ہوئے ہے
کہیں پہ جیسے زمردیں شاخسار پر لعل کھل اٹھے ہیں

''کبھی آئیے کاکا! اور دیکھیے۔ ہمارا چمن کیسے جھلملا رہا ہے۔۔۔'' تیز ہوا میں اُڑتی زلفوں کو سنبھالتے۔۔۔ بادلوں بھرے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے وہ کمرے میں آئی تو زینب ناشتے کے برتن لگاتے ہوئے بڑی شد و مد سے ہارون کو بتا رہی تھی۔

''نزدیک ہی ایک مزار پر ایک بزرگ آیا بیٹھا ہے۔۔۔ سنا ہے۔۔۔ اس کی دعا میں بڑا اثر ہے۔ لمبی سی ڈاڑھی ہے۔ بڑی بڑی جٹائیں۔ پورا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس جاؤ، پکارو، بلاؤ تو نگاہ نہیں کرتا۔ سر جھکائے ورد میں مصروف رہتا ہے۔ پر جو لوگ آس پاس کے رہنے والے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ سائیں بڑا ہی رحمدل ہے۔ جس روز کسی چڑیا کا گھونسلہ بکھرے یا بوٹ گھونسلے سے گر جائے تو اس کے رونے کرلانے کی آوازیں رات بھر آتی رہتی ہیں۔



ساون برسے خوشیوں کے سنگ

سیاہ گھور بادل آناً فاناً آسمان پر چھاتے چلے گئے تھے اور گھڑی بھر میں ایسا کھل کر برسے تھے کہ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے نوروز پوری طرح بھیگ چکا تھا، اب پر تقریباً خالی ٹیکسی اسٹینڈ اور اِکا دُکا ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرف سے مکمل انکار نے اسے مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھر یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا اور سفر کی تھکاوٹ ایسی بھرپور تھی کہ فوری طور پر گھر پہنچنے اور بستر پر گر جانے کی شدید خواہش کے زیر اثر وہ کہیں رک کر بارش تھم جانے کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا، سو منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔

کیچڑ، پھسلن، اس پر دھائیں دھائیں برستی بارش جس کا نمکین، بدذائقہ پانی زبردستی منہ میں گھسا چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جلن الگ ہونے لگی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے پیدل مارچ میں اس نے گیلے اور مزید وزنی ہوتے سفری بیگ کو پچیس مرتبہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔ کبھی اسے سر پہ رکھا تھا اور کبھی بازوؤں میں بھرا تھا۔ خدا خدا کر کے گھر کا دروازہ نظر آیا تھا۔ سو فوراً ہی نوروز اندر گھس گیا تھا۔ نیم تاریک ڈیوڑھی میں چھپا چھپ پانی اڑاتے وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ بارش اگر دو گھنٹے برستی تھی تو یہ سال خوردہ ڈیوڑھی دو دن تک برستی رہتی تھی۔ وسیع و عریض صحن میں سلیمان اور ارسلان بھائی کے بچوں نے خوب اودھم مچایا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر ''چاچو، چاچو۔'' کے ایسے فلک شگاف نعرے لگائے کہ اس کی آمد کی اطلاع گھر کے کونے کونے تک پہنچ گئی تھی اور پھر ایسی تھرتھلی مچی تھی کہ کچن میں پکوڑوں کے لیے بیسن گھولتی سدرہ نے مارے حیرت اور خوشی کے سارا بیسن زمین پر الٹ دیا تھا۔ چھوٹے چچا کی شہلا لپکی تو معیز

اس کے نیچے اور انیقہ اوپر تھی۔ تائی اماں الگ دہائیاں دے رہی تھیں۔

''ارے! پہلے مجھے تو اس سے ملنے دو۔''

اور معلوم نہیں نوروز کا حوصلہ جواب دے گیا تھا یا سامنے کے ہجوم اور پیچھے سے ہونے والی متوقع یلغار نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا، لپک جھپک لمبے لمبے ڈگ بھرتا برآمدے کی طرف بڑھا تو صحن میں ہی پاؤں پھسلا بلکہ پھسلتا چلا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ خوب لمبا ہو کر صحن میں پڑا ہوتا، اظفر نے بروقت اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

''ارے ارے یار! آنے کی اطلاع تو دی ہوتی۔ ہم خود تجھے لینے اسٹیشن پہنچ جاتے۔''

اظفر کے عقب سے جھانکتے بے قرار چہروں پہ نگاہ پڑتے ہی اس نے اظفر کو ایک طرف دھکیلا اور آگے بڑھ گیا۔ اپنے بھیگے حلیے کے باعث وہ خاصی دور سے تعظیماً تائی اماں کے سامنے جھکا تھا مگر تائی اماں نے پروا نہ کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ گھر کے ہر فرد کا تقریباً یہی حال تھا۔

خوشی سے معمور چہرے، ہنستے کھلکھلاتے، بے فکری، شوخی، ادھر ادھر کی چھیڑ چھاڑ۔

''کیا واقعی یہ سب لوگ میری آمد پر اتنے ہی خوش ہیں جتنے نظر آ رہے ہیں۔'' وہ سمجھ نہیں پایا، بس یونہی بے زار سا بیٹھا ایک ایک کا چہرہ تکتا رہا تب ہی رشنا گرم گرم پکوڑوں کی پلیٹ لے کر بھاگی چلی آئی تھی اس کے پیچھے چائے کا مگ تھامے سویرا تھی، اس کی اکلوتی بہن۔

''نوروز بھائی! یہ صرف آپ کے لیے ہیں۔'' رشنا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی اور اگلے چند لمحوں میں صرف پلیٹ ہی اس کے ہاتھ میں آئی تھی کہ ندیدوں اور چٹوروں کی پوری فوج اس وقت اس کے گرد جمع تھی۔

''شرم تو نہیں آتی تم لوگوں کو، نوروز بھائی اتنی دور سے آئے ہیں۔''

سویرا نے خاص طور پر اظفر، معیز اور مہران کو شرم دلانی چاہی تھی مگر وہ سب کے سب بے غیرت بنے مسکراتے رہے اور ڈھیٹ بنے پکوڑے اڑاتے رہے۔ اظفر نے البتہ تھوڑی غیرت دکھاتے ہوئے ادھ کھایا پکوڑا اس کی طرف بڑھایا تھا، مگر عین اسی وقت رشنا دوسری پلیٹ ہاتھ میں لیے آ گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک عدد کفگیر بھی تھام رکھا تھا جو کہ ظاہر ہے حفظ ماتقدم کے طور پر لے کر آئی تھی۔

تب ہی نوروز کو احساس ہوا، سویرا اس کے کاندھے پر جھکی نہ جانے کیا منمنا رہی تھی۔ اس نے توجہ دینے کی کوشش کی، مگر بھانت بھانت کی آوازوں میں سوائے من من کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

اظفر کے چھت پھاڑ قسم کے قہقہے، معیز اور رزوار کی دھینگا مشتی، تائی اماں کی ڈانٹ پھٹکار، کچن سے رشنا اور سدرہ کی چیخ و پکار، اس پر اس کے اپنے بالوں سے ٹپ ٹپ گرتا ہوا پانی، بارش میں بھیگے کپڑے اور چپچپاہٹ کا احساس۔

''افوہ کیا مصیبت ہے؟ میں کچھ سن نہیں پا رہا۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ دو منٹ صبر کرلو۔''

جھنجھلاہٹ کے شدید احساس کے زیر اثر اس نے تپ کر کہا تھا، سویرا چند لمحے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس کا دبوچا ہوا بازو ایک جھٹکے سے چھوڑا اور دھپ دھپ کرتی کمرے میں

غائب ہو گئی۔

''افوہ۔'' کوفت کا احساس بڑھتا چلا گیا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں۔۔۔'' سب کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

''بہت الجھن ہو رہی ہے، میں ذرا چینج کرلوں۔'' وہ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ کمرا جوں کا توں تھا، ایک دم صاف ستھرا۔

اس نے وارڈ روب سے دھلے دھلائے کپڑے نکالتے ہوئے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ وہ پورے ڈیڑھ ماہ بعد گھر واپس آیا تھا اور اس کمرے کی لشک لشک کرتی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی گھر کے لوگ اس کے خیال سے غافل نہیں رہتے۔ وہ خود کو ان محبتوں کا مقروض تصور کرتے ہوئے غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ نہاتے ہی سفر کا میل کچیل اور آدھی تکان اتر گئی تھی۔ تولیے سے گیلے بال رگڑتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا جب عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ چند ثانیے بعد آئینے میں اظفر کا عکس ابھرا تھا۔

''نہا لیے، ابا جان نیچے بلا رہے ہیں تمہیں۔ ہاں اگر تم آرام کرنا چاہو تو میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔''

''نہیں۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔''

اس نے کنگھے سے بال بناتے ہوئے کہا تو اظفر اثبات میں سر ہلاتا واپس پلٹ گیا تھا۔ کنگھا میز پر رکھنے کے بعد اس نے سلیپر نکال کر پہنے اور آستین کے بٹن بند کرتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ بارش اگرچہ ابھی بھی ہو رہی تھی مگر اس میں پہلے کی سی شدت نہ تھی۔ چند لمحے اس بے موسم کی بارش کو تکتے رہنے کے بعد وہ پلٹا تھا۔ کمرے کا پرسکون ماحول اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو تھپکیاں دے رہا تھا اور اسے ڈر تھا کہ اگر کچھ دیر وہ مزید یہاں ٹھہرا تو ہو سکتا ہے، سب کچھ بھول بھال کر بیڈ پہ گر جائے جبکہ تایا ابا نیچے بڑی شدت سے اس کا انتظار کر رہے تھے، سو وہ سر جھٹک کر نیچے دروازہ کھولتا ہوا زینے کی طرف آ گیا تھا۔ نیچے اب قدرے سکون تھا۔ تایا ابا حسب معمول ٹی وی کھولے بیٹھے تھے۔ تائی اماں بے زار سا چہرہ لیے تایا ابا پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں۔ رشنا اور انیقہ کوئی میگزین کھولے اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ تایا ابا ان کی سرگوشیوں اور ہنسی کی دبی دبی آوازوں سے ڈسٹرب ہو کر بغیر کچھ کہے انہیں گھور رہے تھے۔

''آؤ، آؤ نوروز میاں! کہاں رہ گئے تھے بھئی؟'' اس پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے بشاش انداز میں کہتے ہوئے بازو پھیلائے تو وہ ان کے اٹھنے سے پیشتر ہی جھک کر ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

''جیتے رہو، آؤ ادھر بیٹھو۔'' انہوں نے ٹی وی بند کرتے ہوئے ریموٹ میز پر رکھا اور پھر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''اصولاً تو اس وقت تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔ مگر بھائی صاحب کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ سوچا، ان کی خیریت معلوم کرلوں۔'' تایا ابا نے کہا تو وہ رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ''کوئی بات نہیں۔'' کہتا ہوا انہیں تفصیل سے بتانے لگا تھا۔

☆☆☆

ڈیڑھ ماہ قبل اسے اپنے عزیز دوست وہاب کی شادی میں شرکت کے لیے وہاڑی جانا تھا۔ تایا ابا کو معلوم ہوا تو وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل سے اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھے تھے۔

”نوروز! جا رہے ہو تو ذرا ہمارے بھائی میاں کی خبر بھی لیتے آنا، ہمشیرہ محترمہ حیات تھیں تو آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب تو پندرہ برس بیت چلے انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ادھر بھائی میاں کی زندگی مشکل میں پڑی، ادھر ہم دنیا کے دھندوں میں ایسا پھنسے کہ وہ جو مہینوں بعد ایک دوسرے کی خبر لیتے تھے، اس سے بھی گئے، ہم سن رہے ہو نا نوروز! ضرور جانا ان کی طرف۔“

وہ اٹھ کر دوبارہ اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھے۔ کاغذ نکال کر دو چار سطریں گھسیٹیں اور پھر کاغذ تہ کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایڈریس خود انہیں بھی ٹھیک طرح سے یاد نہیں تھا، ٹوٹا پھوٹا راستہ سمجھا دیا۔

نوروز نے جھنجلاتے ہوئے دل ہی دل میں ٹھان لی تھی کہ اطمینان سے ولیمہ کھا کر واپسی کی راہ لے گا اور کہہ دے گا، گھر نہیں مل سکا۔

مہندی، بارات اور ولیمہ۔ وہاڑی میں اس کا صرف تین دن رکنے کا پروگرام تھا مگر حواس پہلے دن ہی ٹھکانے لگ گئے تھے جب وہ اچھی خاصی گرمی میں بذریعہ ٹرین وہاڑی پہنچا اور پہلی فرصت میں ہی وہاب پر پل پڑا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں۔ اس موسم میں شادی کروانے کی۔ منگیتر کہیں بھاگی جا رہی تھی یا تو خود اس دار فانی سے کوچ کرنے والا تھا۔“ نوروز غصے کا اظہار کرتا رہا اور وہاب شادی کی خوشی میں مزے سے دانت نکالتا رہا۔

”زمانہ بدل گیا مگر ایک میرا یار نوروز جہانگیر خود کو نہ بدل سکا۔ ویسا ہی چڑچڑا، ویسا ہی بد دماغ اور ذرا سا بے وقوف۔ بات بات پر جلنا کڑھنا، تیری پرانی عادت ہے۔ اسی لیے تو کھایا پیا لگتا نہیں۔“ وہاب نے ایک زوردار دھپ اس کے لگاتے ہوئے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔

لمبا قد، دبلی پتلی جسامت، سانولی رنگت اور چہرے پہ ہمہ وقت نظر آتی بے زارکن کیفیت جو شاذ و نادر ہی خوشگواریت میں بدلتی تھی اور یہ خوشگواریت اس کے چہرے پہ کتنی اجنبی سی لگتی تھی۔ یوں جیسے کسی خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ درخت پر کوئی بے موسم کا پھل کھل اٹھا ہو۔

وہ اس قدر بے ہودہ القابات پر ناراض سامنہ پھلائے بیٹھا تھا جب مہندی کی رسم کا بلاوا آیا۔ وہاب سب کچھ بھول بھال کر خوشی سے اچھلتا سب سے پہلے لپکا تھا۔ اس کے بقیہ دوست پیچھے سے آوازیں لگا لگا کر اسے غیرت دلانے کی ناکام کوشش کرتے رہے مگر وہ ان کو منہ چڑاتا خود ہی جا کر سجی سجائی کرسی پہ جا بیٹھا تھا۔

یہ اور بات کہ مہندی کی رسم کرتے ہوئے اس کے سسرال والوں نے اس کی وہ درگت بنائی تھی کہ وہ دردناک چیخ و پکار کے ساتھ بیسیوں بار اٹھ کر وہاں سے بھاگا تھا۔ اور بیسیوں بار ہی اسے پکڑ کر واپس لا بٹھایا گیا تھا۔ اس موقع پر بڑی بوڑھیوں کے سوگوار اور لمبی لمبی سروں والے گیت سن کر

نوجوان لڑکیاں مہندی کی رسم کا بائیکاٹ کرنے کا پروگرام بنا رہی تھیں کہ بزرگ خواتین کی وجہ سے ان کے تمام تیار کردہ گانوں کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ گاتے گاتے ان کے سانس پھول گئے، رگیں تن گئیں۔ تب صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ان بڑی بوڑھیوں کو پکڑ کر ان کی نشستوں پر بٹھایا گیا اور نوجوان لڑکیوں کو اپنے فن کے اظہار کا موقع مل گیا دنیا جہان کے گانوں کے ساتھ ساتھ وہاب کا حلیہ بھی ایسی بے دردی سے بگاڑا گیا تھا کہ یاران وہاب نے اسی وقت کان پکڑ کر شادی کروانے سے توبہ کر لی تھی اور غالباً اسی توبہ نے لڑکیوں کو مزید اکسا دیا تھا۔

”بھائی صاحبان نے شادی سے توبہ کر لی ہے۔ تو پھر کیوں نہ آج ہی دل کے سب ارمان پورے کر لیے جائیں۔ چلو بہنو! دل کی سب حسرتیں پوری کر لو۔“

کسی ایک من چلی نے بہنوں کو للکارا تھا اور پھر بدتہذیب بہنوں نے بھائیوں کو تیل میں ڈبونا اور مہندی میں دفن کرنا شروع کر دیا تھا اور بے حد شرافت کا مظاہرہ کرتا۔ ایک کونے میں دبکا نوروز ان سب کی خراب حالت پر ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ تب ہی ایک محترمہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اپنی ہنسی کو بریک لگاتا وہاں سے کھسکنے ہی والا تھا جب پوری فوج ظفر موج اس کے سر پہ آن کھڑی ہوئی تھی۔

”دیکھیں جی، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ وہ گڑبڑا گیا تھا۔

”اجی تو ہم نے کب کہا کہ وہاب کی شادی میں آپ کا کوئی قصور ہے۔“

”مم میرا مطلب ہے، میں بہت دور سے آیا ہوں اور آپ کو بتا دوں کہ میں اس قسم کے مذاق بالکل پسند نہیں کرتا۔“ اس نے دانستہ تیوریاں ڈال کر خود کو بہت سنجیدہ و رنجیدہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی مگر مخالفین پر اس کا بالکل الٹ اثر ہوا تھا۔

”اس قسم کے مذاق پسند نہیں تو پھر کس قسم کے مذاق پسند ہیں آپ کو اور بائی داوے، ہمیں بھی تو معلوم ہو آپ کتنی دور سے آئے ہیں۔“ سبز لہنگے والی نے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا تو جواب سرخ سوٹ والی نے دیا تھا۔

”میرا خیال ہے، کوہ قاف سے آئے ہیں۔“

”کوہ قاف میں یا تو جن ہوتے ہیں یا پریاں۔“ ان کا تعلق کس مخلوق سے ہے۔“ زرد پشواز والی خود کو معصوم ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

”پری زاد تو یہ ہونے سے رہے، دوسری مخلوق کے جانشین ہی لگ رہے ہیں۔“ کسی نے اندازہ لگایا تھا اور اس کے ساتھ ہی نسوانی قہقہے محفل کو کشت زعفران بنا گئے تھے۔

”دیکھیے، اب آپ بدتمیزی کر رہی ہیں۔“ اس نے غصہ دکھانا چاہا۔

”کیا؟ بدتمیزی، بدتمیزی تو ہم اب دکھائیں گے آپ کو۔“ کوئی غصے سے چیخ کر بولی تھی۔

رنگ برنگے زرتار پہناووں سے جہاں اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں وہاں ظالم تیکھے نقوش کی قاتل اداؤں اور تیغ صفت قہقہوں نے ہوش و حواس بھی معطل کر دیے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کا کوئی معقول طریقہ سوچتا، کتنے ہی نازک ہاتھ ایک ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے اور لمحوں میں اس کا وہ حلیہ بنا گئے تھے کہ شرمندگی سے اپنا چہرہ چھپاتا وہ اس محفل سے ہی نہیں گھر سے بھی

باہر نکل گیا تھا۔

''آخر ضرورت ہی کیا تھا یہاں آنے کی، چلو آ ہی گئے تو کیا ضرورت تھی رسم مہندی میں شرکت کرنے کی۔ معلوم تھا وہاں اس کمینے وہاب کا سارا خاندان جمع ہوگا اور اس کا خاندان ظاہر ہے ویسا ہی ہوسکتا ہے جیسا کہ ہونا چاہیے، کسی اچھی توقع کی امید؟ توبہ کیجیے انسانیت تو نام کو نہیں۔''

وہ با آواز بلند ان کو کوستا، بڑبڑاتا یونہی کشادہ گلیوں میں مارچ کرتا رہا اور پھر دل کی بھڑاس خوب اچھی طرح نکال کر الیکٹرک پول کی زرد مردہ روشنی میں کسی مکان کے پختہ تھڑے پہ بیٹھ کر اپنے چہرے اور گردن سے ابٹن چھڑانے لگا، بالوں میں ہاتھ پھیرا تو شدید چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔

''بدبختوں نے تیل بھی جی بھر کے انڈیلا ہے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ وہاب کے گھر کی تیسری منزل پہ جلتی روشنیاں یہاں سے بخوبی دکھائی دے رہی تھیں۔ بلکہ اسے تو وہ چیخم دھاڑ، شور شرابا بھی بخوبی سنائی دے رہا تھا جو اس وقت وہاں بپا تھا یا شاید کان ہی بج رہے تھے۔ اس نے زور زور سے دونوں کانوں کو کھجا کر گویا ان کی کارکردگی بحال کی اور اپنے ارد گرد پھیلے رات کے سناٹے کو محسوس کرنے لگا تھا۔

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا۔ ہوا میں قدرے ٹھنڈک سی آ گئی تھی اور کسی گھر میں لگے ناز بو کی مہک پورے ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی۔ پول کی نیم جان سی روشنی کے گرد منڈلاتے کئی پروانے ابتر حالت میں اس کے آس پاس گر رہے تھے۔ اس نے یونہی اطراف میں دیکھتے ہوئے قمیص کا دامن اٹھا کر ایک بار پھر اپنے چہرے کو رگڑا۔ تب ہی سڑک کے پار ایک گھر کے سامنے لگے پیپل کے تین درخت ایک قطار میں کھڑے تھے۔ وہ چونکا تھا بہت بری طرح، بلکہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

پیپل کے تین درخت ایک ہی قطار میں، اس کے عین سامنے سیمنٹ کے تھڑے والا سرخ دروازوں والا گھر ''ثمینہ پھوپھو اور اسماعیل پھوپھا کا گھر۔'' وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا تھا اور ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ وہ سیمنٹ کے بنے ہوئے تھڑے پہ بیٹھا تھا جو جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور اس کے سامنے دو دروازے تھے۔ سرخ رنگ کے دروازے، دائیں طرف کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ بائیں طرف کا ڈرائنگ روم میں اور ان کے درمیان بڑی سی جالی کی کھڑکی تھی جس کے ذریعے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باہر کا منظر بخوبی دیکھا جا سکتا تھا اور یہیں سے پھوپھو سبزی، فروٹ والے کو آواز دے کر روکا کرتی تھیں اور یہ سب باتیں اسے کسی نے نہیں بتائی تھیں۔ بس شعور کی سطح پر ایک کے بعد ایک نقش ابھرتا چلا گیا۔

وہ اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب تایا ابا کے ساتھ پہلی اور شاید آخری مرتبہ ثمینہ پھوپھو کے ہاں آیا تھا۔ وہ غالباً اس وقت بیمار تھیں۔ اس لیے بہت زرد اور پژمردہ دکھائی دے رہی تھیں۔ نوروز کو دیکھتے ہی انہوں نے بے تابی سے اسے گود میں لے لیا تھا اور جب آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ایک تواتر سے ان کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے تو وہ ہراساں سا ہو کر ان کی گود سے اتر کر تایا جان کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ جب سے امی فوت ہوئی تھیں تب سے وہ بہت حساس اور زود رنج سا ہو گیا تھا۔ خود اسے بہت کم رونا آتا تھا مگر جب بہت سے دوسرے لوگ اسے پیار کرتے

ہوئے وہ خوامخواہ ہی آنسو بہانے لگتے تھے تو اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ سینے پر بے تحاشا بوجھ پڑ جاتا تو پھر وہ کئی کئی دن تک بالکل گم صم ہو کر رہ جایا کرتا تھا اور اس وقت پھوپھو کو روتے دیکھ کر اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سوگوار ماحول سے بہت دور چلا جائے۔

''یوں رو رو کر خود کو ہلکان مت کرو ثمینہ! اب قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔'' تایا ابا نے انہیں تسلی دینی چاہی تھی۔

''کیسے نہ روؤں بھیا؟ بھابھی بیگم کو تو خدا نے ہم سے چھین لیا تھا۔ مگر بھائی صاحب پرائی عورت سے دل لگاتے ہوئے انہیں نوروز اور سویرا کے متعلق تو سوچنا چاہیے تھا۔ اب یہ بے چارے کہاں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔'' ان کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

''خدا نہ کرے ثمینہ! جو یہ در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ میں ہوں ناں بھابھی بیگم کو ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، تو ان دونوں کو ان کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگا لوں گا۔ تم دیکھ لینا ثمینہ! نوروز میرے لیے سلیمان، ارسلان اور اظفر سے بڑھ کر ہوگا۔ سویرا کو کبھی سدرہ سے کمتر جانوں تو جو چاہے سزا سنا دینا۔''

تایا ابا نجانے کن باتوں میں الجھ گئے تھے۔ وہ اکتایا اکتایا سا اٹھ کر باہر چلا آیا، دھلا دھلا صحن یہاں سے وہاں تک بالکل خالی تھا۔ وہ داہنی دیوار کے ساتھ بنی کیاری کے پاس آ بیٹھا۔ جہاں نہایت باریک سبز پتوں والی بیل کاسنی اور گلابی رنگ کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے پھولوں سے چھیڑ خانی کرتا رہا پھر کونے میں لگے لیموں کے پیڑ کا جائزہ لینے لگا۔ تب ہی کسی بچے کے رونے کی آواز کانوں میں پڑی تو بری طرح چونک گیا۔

''یہ کون ہوسکتا ہے؟'' وہ دبے دبے پاؤں اٹھاتا دوسرے کمرے کی طرف آ گیا اور وہاں سفید فراک میں ملبوس بچی کو بری طرح روتے دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا تھا۔ وہ تقریباً سویرا جتنی ہی تھی اور اسی کی طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ تب ہی نوروز کے پیچھے ہلکا سا کھٹکا ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا پھوپھو ستا ستا چہرہ لیے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

''نوروز! ادھر کیوں کھڑے ہو بیٹا! یہاں آ کر بیٹھو ناں۔''

پھوپھو نے ایک الماری کھول کر اس میں سے بسکٹ اور بہت سی ٹافیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھیں اور خود اس بچی کو بہلانے لگی تھیں نوروز تایا ابا کے ساتھ صرف دو دن وہاں رکا تھا اور دو دنوں میں اسماعیل پھوپھا نے اسے بہت سیر کروائی تھی۔ گھر آتا تو پھوپھو خاطر مدارات پر کمر بستہ ہو جاتیں۔ تایا ابا ٹوکتے رہتے۔

''تم بیمار ہو ثمینہ! ہم صرف تمہیں دیکھنے، تم سے باتیں کرنے آئے ہیں خوامخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔'' اور جواباً ثمینہ پھوپھو ہولے ہولے مسکرا رہی تھیں۔

''آپ کون سا روز روز آتے ہیں بھیا! اور اب آئے ہیں تو جی چاہتا ہے، اگلی پچھلی ساری کسریں نکال دوں۔''

''بس کام کی مصروفیت۔۔۔ مگر تم مطمئن رہو۔ آئندہ آتا جاتا رہوں گا۔''

تایا ابا نے دل سے کہا تھا مگر آئندہ آنے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بس ایک بار جانا پڑا تھا

انہیں، جب ثمینہ پھوپھو کے انتقال کی خبر آئی تھی۔ چھوٹی چچی گھر میں بچوں کے پاس رہیں، باقی سب بڑے وہاں پہنچ گئے تھے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد اس نے تایا ابا کو بہت مضمحل اور تائی اماں کو بے قراری سے روتے دیکھا تھا۔

"ارے الو کی دم! تو یہاں کھڑا ہے، لاحول ولا قوۃ اور ادھر میں پورے شہر میں تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔"

کمر پر لگنے والی کراری سی دھپ نے ڈھیلے ڈھالے کھڑے نوروز کو کئی قدم آگے لڑھکا دیا تھا۔ بے اختیار ہی سنبھلتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا وہاب خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"کون سا خزانہ دفن ہے ان بند دروازوں کے پیچھے جو آدھی رات کو یہاں کھڑے چلّہ کاٹ رہے ہو۔"

"بکواس نہیں کر دیار!" وہ جھینپ سا گیا۔

"ٹھیک ہے نہیں کرتا مگر یہ تو بتاؤ، یہ کیا حرکت کی ہے تم نے قسم خدا کی، شرمندہ کروا دیا سب کے سامنے۔ بھئی اس قسم کی تقریبات میں تو ایسے ہزار موقع آتے ہیں، تم کیا ہر دفعہ یونہی گھر سے بھاگ نکلو گے اور جانتے ہو پیچھے ہم لوگ کس قدر پریشان تھے۔ سارا گھر چھان مارا اور پھر دیوانوں کی طرح ان سڑکوں، گلیوں میں بھاگتا پھرا کہ کہیں میرا یار اجنبی شہر میں کھو گیا تو میری تو شادی بیچ میں ہی رہ جائے گی۔"

وہاب ناراضی سے بولتا رہا اور نوروز غائب دماغی سے سنتا رہا۔ ذہن درحقیقت ان بند کواڑوں کے پیچھے بکھری یادوں کو سمیٹ رہا تھا۔

"اب چلتے ہو یا چلنے کا وقت ابھی باقی ہے۔" نوروز نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، ناراضی سے پھولا ہوا منہ بالکل غبارے کی طرح، تیل میں بھیگے بال ماتھے سے چپکے ہوئے تھے، ملگجا لباس جگہ جگہ مہندی سے رنگا ہوا۔۔۔ پیروں میں دورنگی چپل۔۔۔ وہ واقعی بہت پریشانی میں گھر سے نکلا تھا، نوروز نے ایک طویل سانس لے کر پلٹ کر دیکھا۔ سرخ دروازے پر نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی اس نے آگے بڑھ کر آنکھیں سکیڑیں۔

"اسماعیل حسن B iv 698" زیر لب پڑھ کر دل ہی دل میں دہراتا وہاب کی طرف پلٹا۔

"یہ میرے پھوپھا جان کا گھر ہے۔" وہ وہاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔

"ہیں کیا واقعی؟" وہاب ٹھٹکا تھا۔

"ہاں۔"

"کمال ہے، مجھے تو علم ہی نہیں تھا ورنہ اسماعیل صاحب سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں۔ بہت ہی بھلے انسان ہیں۔" وہاب اس سے ان کے متعلق باتیں کرنے لگا تھا اور یونہی چلتے چلتے وہ وہاب کے گھر تک پہنچ گئے تھے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے رک کر وہاب سے معذرت کرنی چاہی تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"غصہ تو وہ کرے جسے تمہاری عادت کا علم نہ ہو اور میں تو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بات بعد میں

ہوتی ہے موصوف خفا پہلے ہو جاتے ہیں۔"

وہاب نے اسے اندر دھکیلا تو وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ مگر وہ تو وہاب تھا، اس کی رگ رگ سے واقف، یوں ظاہر کر گیا تھا جیسے مسئلہ ہی کوئی نہ ہو، باقی سب نے البتہ اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا۔

"بھئی، وہاب کے دوستوں سے چائے پانی کا پوچھ لو مگر ذرا خیال سے مزاج بہت نازک ہیں۔"

"خبردار! سب لوگ تمیز کے دائرے میں رہیں ورنہ لوگ گھر سے بھاگ نکلیں گے۔"

"وہاب بھائی! ہم ذرا شرارت کے موڈ میں ہیں۔ دیکھ لیجیے مزاج یار برہم تو نہیں۔۔۔؟"

ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں اس پر طنز کیا تھا۔ وہاب کی گھوریوں نے اکثریت کو خاموش تو کروا دیا تھا مگر وہ کچھ مزید چپ ہو گیا تھا۔ بچپن کے اندوہناک حادثات نے اس کی شخصیت میں نجانے کیسے خلا پیدا کر دیے تھے کہ جو بھرنے میں ہی نہ آتے تھے۔

پہلے ماں کی تکلیف دہ بیماری کے بعد موت پھر باپ کی دوسری شادی اور پھر اس کی موت، رشتہ داریاں، ہمدردیاں، ترحم بھری نظریں، مصنوعی دلاسے، جھوٹی تسلیاں وہ سب سے چھپ کر اندر ہی اندر سمٹتا چلا گیا۔

اور اب کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا وہ بھی عام لوگوں میں گھل مل کر بیٹھے، چھوٹی چھوٹی بے تکی باتوں پر بے ہنگم قہقہے لگائے۔ چیخے دھاڑے بھی خوش ہو، تو اچھل اچھل کر اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرے، کبھی ناراض ہو تو واضح طور پر دکھائی دے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، خوشی ہو یا غم غصہ، پریشانی تھکان ہو یا کام کرنے کی دھن۔

وہ ہر کیفیت میں بس ایک سا ہی دکھائی دیتا تھا۔

الجھا الجھا، کھویا کھویا، گم صم۔

جذبات اس کے اندر سر پٹختے رہتے کسی ڈوبتے مسافر کی طرح جو باوجود کوشش کے سطح آب پر نہ ابھر سکتا ہو۔

دل کے موسم بدلتے رہتے مگر چہرے کے بھلے سے نقوش میں بس ایک ہی کیفیت سمائی رہتی تھی، وہی اکتاہٹ بھری بے زاری جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اس دنیا سے، اس کے لوگوں سے، اس کے شب و روز اور صبح و شام کے دھندوں سے بچ کر کہیں دور بھاگ جانا چاہتا ہو مگر اس کے باوجود وہ ہر کام کرتا ہوا نظر آتا۔ ہر وہ کام جو اس گھر میں کوئی دوسرا فرد نہیں کرتا تھا، وہ نوروز کو کرنا پڑتا تھا اور وہ کیا کرتا تھا۔

بغیر کسی جھجک کے، بغیر ہچکچاہٹ کے، کسی روبوٹ کی طرح۔

اور کبھی کبھی سویرا بہت حیرت سے اس سے پوچھا کرتی تھی۔

"نوروز بھائی! آپ تھکتے نہیں؟" اور وہ ایک خاموش سی نگاہ اس پر ڈال کر بغیر کوئی جواب دیے پھر سے کسی کام میں مشغول ہو جاتا تھا۔

اور خود اسے کئی بار اپنا آپ ایک ایسے گلیشئر کی مانند لگا کرتا تھا جس پر سورج کی شعاعیں اپنی

تمامتر تمازت کے ساتھ حملہ آور ہوئی ہوں۔ اندر سے سب پانی بن کر بہہ نکلا ہو، مگر بظاہر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو۔

یا پھر وہ زمین کا ایک ایسا بنجر ٹکڑا بن چکا تھا جس پر تمام موسم بہت شدتوں کے ساتھ وارد ہوئے ہوں مگر اس کی سطح پر کوئی پھول اگا ہو نہ کسی کونپل نے سر اٹھایا ہو۔ بس نچلی کسی تہ میں کوئی سبزہ سا پھوٹ نکلا ہو زندگی ہر روپ میں اس کی روح پر برسی تھی مگر اس کے منجمد ٹھہرے ہوئے اعصاب پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔

وہ خوش ہوتا تھا مگر مسکراہٹ اس کے لبوں پر نہ پھیلتی تھی، اس کا دل دکھ سے بھر جاتا مگر آنکھ آنسوؤں سے ناآشنا رہتی، کبھی بہت غصہ آتا تو ماتھے پہ چند ایک تیوریوں کا اضافہ ہو جاتا اور بس، وہ اپنے تاثرات کے اظہار اور اپنی کیفیتوں کے بیان کے سلسلے میں خود کو قطعی طور پر بے بس محسوس کرتا تھا۔

وہ سب کی سنتا تھا مگر اپنی کہنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔

اور وہاب کی شادی میں اس پر طنز کرنے والے اس کی گہری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے خود بخود چپ کر گئے تھے۔

☆☆☆

بارات کی واپسی کا وقت سات بجے کا تھا۔ مگر وہ لوگ نو، ساڑھے نو بجے گھر پہنچے تھے۔ دلہن کی آمد پر سب لوگوں میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ نجانے کون کون سی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ وہاب اپنے کزنز میں پھنسا بیٹھا تھا۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا پورے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی سب لوگ اتنے فریش نظر آ رہے تھے جتنے صبح روانگی سے قبل تھے۔ ان ہنستے کھلکھلاتے لوگوں کے درمیان اسے اپنا وجود بہت بے معنی سا لگ رہا تھا۔ سو وہ اٹھ کر باہر لان میں چلا آیا، یہاں مرد حضرات کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کا فی الحال سونے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ جبکہ اس کا تھکن، نیند اور بھوک کے مارے، برا حال ہو رہا تھا۔

کل رات بھی شور اور ہنگامے کے باعث وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ سو وہ وہاب کے کسی کزن سے کہتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ اس کا رخ سیدھا اسماعیل پھوپھا کے گھر کی طرف تھا۔ وہ آج کی رات پر سکون اور بھرپور نیند لینا چاہتا تھا تاکہ اگلی صبح ولیمے میں شرکت کے بعد واپسی کا سفر اختیار کر سکے۔

اسماعیل پھوپھا کے گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پہ وقت دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ سرخ دروازوں کے دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ اس چھوٹے سے آنگن کے مکین بہت جلد سو جانے کے عادی تھے۔ چند لمحے تذبذب کے بعد اس نے ڈور بیل پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تیسری بیل پر دروازے کے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے جیب میں رکھے کاغذ کو تھپتھپا کر اس کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر منتظر نگاہیں دروازے پر جما دیں۔

دروازہ کھلنے کے بعد جو شخص سامنے آیا تھا، اس پر گزرتے وقت نے اگرچہ بہت سی نشانیاں

چھوڑ دی تھیں، مگر اس کے باوجود وہ بخوبی انہیں پہچان گیا تھا۔

"کون ہو میاں؟" انہوں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے خمار آلود لہجے میں استفسار کیا تھا۔ اس نے تعارف کروانے کے بجائے تایا ابا کا دیا ہوا خط ان کی طرف بڑھا دیا تھا وہ خط لے کر چند لمحوں کے لیے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئے تھے اور جب واپس پلٹے تو ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"نوروز میاں! حد کرتے ہو تم بھی۔ دن کی روشنی میں کیوں نہ آئے؟ اب تو میں تمہیں ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں پا رہا۔" انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اندر کھینچا اور تاریکی سے نکال کر ایک دم روشنی میں لا کھڑا کیا تھا۔

"ماشاءاللہ، بہت بڑے ہو گئے ہو مگر میں تمہارے بچپن کی شبیہ ابھی بھی تم میں دیکھ رہا ہوں۔" انہوں نے بغور اسے دیکھا تو وہ جھینپ سا گیا تھا۔ پھوپھا جان اسے لیے کمرے میں چلے آئے تھے۔ صحن کے عین وسط میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک چارپائی خالی تھی دوسری پر چادر میں لپٹا وجود محو خواب تھا۔ وہ نظریں جھکائے قریب سے گزر گیا۔ پھوپھا جان اسے کمرے میں بٹھا کر خود باہر نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔

"نوروز بیٹا! کھانا تو کھاؤ گے نا۔۔۔؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ کھا کر آیا ہوں۔" وہ جی ہاں کہتے کہتے نجانے کیوں جھجک سا گیا تھا حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ آج دوپہر میں اس نے چائے کا کپ اور ایک آدھ پیٹز لے کر ہی کام چلایا تھا اور ڈنر کی نوبت ابھی تک آئی ہی نہیں تھی۔

"اچھا، اچھا نایاب بیٹی! چائے بنا لو۔ چائے تو پیو گے نا۔۔۔؟" انہوں نے پہلی بار آواز لگائی پھر خوش دلی سے اس سے مخاطب ہوئے۔

وہ بس ہلکا سا مسکرا کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ دیر یونہی باتوں کا دور چلا پھوپھا جان اس سے ایک ایک کے متعلق پوچھتے رہے۔

"پھوپھا جان! آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔" اس نے اچانک کہا تو وہ ذرا سا چونکے تھے اور پھر مسکرا دیے تھے۔

"تم بھی تو جوان ہو گئے ہو میاں۔" انہوں نے جیسے گزرے ہوئے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ "وقت کی چاپ سنائی نہیں دیتی بیٹا! دبے پاؤں گزرتا ہے۔ ہم کو احساس ہی نہیں ہو پاتا اور جب ہوتا ہے تو ہی معلوم پڑتا ہے کہ ہم تو اپنے پیچھے کئی زمانے چھوڑ آئے اور میں تو اسی دن بوڑھا ہو گیا تھا جس دن تمہاری پھوپھو مجھے تنہا چھوڑ گئی تھی۔" ان کے ناتواں سے لہجے میں ہلکی سی اداسی در آئی تھی۔

"ان کے بغیر زندگی جینا کچھ اتنا آسان نہیں تھا بیٹا۔"

ان کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے خود اس کا دل بھی بھر آیا تھا۔ نجانے کتنے لمحے چپ کی قید میں پھڑپھڑاتے ہوئے گزر گئے۔ پھوپھا جان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ چونکے تو اس وقت جب کہیں قریب ہی برتنوں کی کھنک سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ اس کی جھجک کو محسوس کر کے وہ غیر ارادی طور پر نظریں اپنے ہاتھوں پہ جما گیا تھا۔

"آ جاؤ نایاب!" پھوپھا جان نے پکارا تو وہ اندر چلی آئی۔

"یہ تمہارے جہانگیر ماموں کا بیٹا ہے۔" انہوں نے غالباً تعارف کروانا چاہا تھا۔
"جی ہاں، آپ مجھے بتا چکے ہیں ابا۔" اس کے قدرے لاپروا سے انداز پر پھوپھا جان ذرا مسکرا دیے تھے۔
"یہ نایاب ہے۔ کافی چھوٹی تھی جب تم نے اسے دیکھا، کیوں نوروز؟"
"جی، جی بالکل۔" اس نے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی طرف بڑھا چائے کا کپ تھام لیا۔
"نایاب! نوروز کے لیے صحن میں ہی بستر لگا دو۔"
"جی۔" وہ ستے ستے سے لہجے میں کہتی باہر نکل گئی۔ اسے شاید نیند سے اٹھنا اچھا نہیں لگا تھا، اسی لیے پورے صحن میں سٹر پٹر پھر رہی تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔
"میرا خیال ہے، مجھے صبح آنا چاہیے تھا۔"
"نہیں۔۔۔ کیوں؟ ارے بھئی، تمہارا اپنا گھر ہے، اچھا یہ دہی بڑے لو، شام کو بنائے تھے۔"
انہوں نے پرخلوص انداز میں اصرار کیا اور یوں آدھی رات تک وہ دہی بڑے بسکٹ اور چائے کے ساتھ پیٹ پوجا کرنے کے بعد باتوں میں مصروف رہا۔ آخر پھوپھا جان کو ہی خیال آیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے ان کے برابر چارپائی پہ لیٹتے ہوئے اسے بے تحاشا تھکن کا احساس ہوا تھا اور اسی تھکن کے زیر اثر بہت جلد وہ گہری نیند میں تھا۔
اور پھر رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس قدر مدہوش تھا کہ چند لمحے یہ سب اسے محض ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر پھر یک دم ہی حواس بے دار ہوئے۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اس کے اوپر جھکا سایا اس سے کئی قدم دور ہٹ گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔ سامنے کھڑی لڑکی اس سے نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ چند ثانیے کے لیے اس کا ذہن سمجھ ہی نہ پایا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ سامنے کھڑی لڑکی کون ہے؟
مگر پھر ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے خیال آیا، وہ رات پھوپھا جان کے گھر آیا تھا۔
"جلدی کیجیے نا، آپ اٹھ کیوں نہیں رہے؟ دیکھیے، ابا جان کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ متوحش سی کھڑی تھی۔
"کیا ہوا؟ کہاں ہیں پھوپھا جان؟" وہ بجلی کی سی تیزی سے چارپائی سے نیچے اترا آیا تھا اور پھر یونہی ننگے پاؤں ڈگ بھرتا اس کے ساتھ کمرے تک چلا آیا تھا۔ جہاں پھوپھا جان سینے پہ ہاتھ رکھے درد کی شدت سے بے حال ہوئے پڑے تھے۔
"ارے پھوپھا جان! کیا ہوا؟" اس نے فوراً انہیں کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر وہ نڈھال ہوتے ہوئے بار بار گود میں رکھے تکیے پہ جھکے جا رہے تھے۔
"پہلے تو معمولی سا درد ہو رہا تھا جب ابا نے مجھے جگایا۔ میں نے پانی پلایا، چائے بنا کر دی مگر۔۔۔" نایاب جیسے رونے کو تھی، چائے کا کپ جوں کا توں بھرا ہوا میز پہ پڑا تھا۔ وہ دونوں نجانے کب سے جاگ رہے تھے اور اسے خبر ہی نہ ہو سکی، وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔
"کیا پہلے بھی ایسا ہوا کبھی۔۔۔؟"

"نہیں۔ پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ ہے نا ابا جان؟" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے فوراً پھوپھا جان سے تصدیق کروانے لگی۔
"آس پاس کوئی ڈاکٹر؟" پھوپھا جان کی بگڑتی حالت کے پیش نظر وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ ظاہری حالت صاف صاف ہارٹ اٹیک کی طرف اشارا کر رہی تھی۔
"نہیں۔ بس ایک کلینک ہے مگر وہ تو رات نو بجے کے بعد بند ہوتا ہے۔ آپ ایسا کریں، ہمسائے سے احسان انکل کو بلا دیں، پلیز جلدی کریں۔" وہ پھوپھا جان کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی۔
نوروز فوراً باہر کو لپکا۔ کوئی پانچویں گھنٹی پر احسان صاحب خاصے خوفناک تیوروں کے ساتھ باہر آئے مگر صورت حال سنتے ہی اس کے ساتھ بھاگے چلے آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی نایاب کی چیخ و پکار نے اس کے پاؤں کی مٹی چھڑا دی تھی۔ عجلت میں کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ نجانے کن کن چیزوں سے ٹکراتا آیا تھا۔ پھوپھا جان چارپائی پہ آڑے ترچھے انداز میں پڑے تھے، اور نایاب نے رو رو کر اپنی حالت خراب کر لی تھی۔ وہ دم بخود سے انداز میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔ یوں لگا ماضی کا کوئی بے رحم لمحہ نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔
"ارے یہ صرف بے ہوش ہیں، نایاب بیٹی! سنبھالو خود کو۔۔۔" احسان صاحب پھوپھا جان کی نبض پر ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔ نایاب بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔
"انہیں ہاسپٹل لے جانا ہوگا، میں گاڑی نکالتا ہوں۔" احسان صاحب اس کے قریب سے گزرتے چلے گئے تب اس کی ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ نایاب باپ کا ہاتھ دیوانہ وار چومتے ہوئے ابھی بھی روئے چلی جا رہی تھی۔ اس نے پھوپھا جان کو سیدھا کر کے لٹایا اور جب تک احسان صاحب نے گاڑی نکالی۔ وہ نایاب کی مدد سے انہیں باہر لے آیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر انہیں لٹا کر وہ باہر نکلا تو نایاب ساتھ جانے کو تیار کھڑی تھی۔
"اس وقت آپ کا جانا مناسب نہیں۔ یوں بھی گھر کھلا پڑا ہے۔ ہمسائے سے کسی خاتون کو بلا لیجیے۔ ہم ابھی واپس آ جائیں گے۔"
"مگر۔" نایاب تڑپ کر اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ احسان صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر آگے ہی آگے بڑھاتے چلے گئے۔ وہ گم صم سی اندھیرے میں کھڑی رہی اور جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی، تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔
وہ ڈاکٹر سے مل کر واپس آیا تو احسان صاحب گردن کندھے پر گرائے اونگھ رہے تھے۔ اس کے پکارنے پر ہڑبڑا کر سیدھے ہو بیٹھے۔
"کیا کہا ڈاکٹر نے۔۔۔؟"
"وہی ہارٹ اٹیک، خاصا شدید تھا مگر اللہ کا شکر، جان بچ گئی۔" وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ پھوپھا جان کو آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ وہ بس انہیں دور سے ہی دیکھ سکا تھا۔
احسان صاحب اس سے مکمل تعارف حاصل کرنے لگے تھے۔ وہ خاصے بھلے انسان تھے۔ آتے ہوئے عقل مندی کی کہ اپنے ساتھ کچھ رقم لیتے آئے۔ مختلف ٹیسٹوں سے لے کر ادویات اور فیس جمع کرانے کے لیے ابھی تک وہی رقم کام آ رہی تھی۔ پھر وہ لوگ نہ جانے کتنی دیر تک یونہی بیٹھے

رہے۔ رات کی سیاہی صبح کے اجالے میں بدلتی چلی گئی۔ رات کی تھکے تھکے چہروں والی نرسیں اور وارڈ بوائے نظر نہیں آرہے تھے۔ ان کی جگہ فریش چہروں نے لے لی تھی۔ ہاسپٹل کی صفائی ستھرائی ہونے لگی۔ فنائل کی ناگوار مہک پورے ماحول پر حاوی ہوگئی تھی۔ نقاہت زدہ، بیمار لوگ امید وبیم کی کیفیت میں ہر آنے والے ڈاکٹر کا ہاتھ تھام لیتے تھے اور ستے ستے چہروں والے ان کے لواحقین پرہیزی کھانوں کا بندوبست کررہے تھے۔

چائے ناشتے کا دور چلا نکلا تو احسان صاحب بصد اصرار اسے اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے ہوٹل پہ آگئے تھے۔ مگر ہاسپٹل کے ماحول نے طبیعت پر ایسا برا اثر ڈالا تھا کہ وہ بمشکل چائے کا کپ ہی پی سکا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو احسان صاحب نے واپسی کا ارادہ کرلیا جانے سے پہلے اسے ڈھیر ساری تسلیوں کے ساتھ ایک چٹ پر اپنا فون نمبر لکھ کر دے گئے تھے۔

''جب بھی ضرورت پڑے فوراً فون کردینا۔ میں گھر پہ ہوں نہ ہوں میرا بیٹا وہیں ہوگا فوراً چلا آئے گا۔ میں جا کر نایاب بیٹی کو تسلی دیتا ہوں بہت فکر مند ہوگی۔'' احسان صاحب چلے گئے اور وہ ہاسپٹل کی سرد دیواروں سے ٹیک لگائے اس تمام صورت حال پر غور کرتا رہا۔

شام کو احسان صاحب دوبارہ چلے آئے۔ وہ آفس سے سیدھے ادھر ہی آگئے تھے۔

''نایاب صبح ہاسپٹل آنے کی ضد کررہی تھی۔ میں نے شام کا کہہ کر ٹال دیا تھا۔ فی الحال وہ ان سے مل بھی نہیں سکتی۔ خوامخواہ باپ کو اس حال میں دیکھ کر خود کو ہلکان کرتی رہتی ٹھیک کیا نا میں نے؟''

انہوں نے رائے لینی چاہی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رات وہیں ہاسپٹل میں ہی گزری اور جیسی گزری تھی بس وہی جانتا تھا۔ کراہتے سسکتے مریضوں کو دیکھ کر اس کا دل ہولتا رہا۔ ادویات کی ناگوار بو سے جی الٹنے لگا۔ صبح ہوئی تو بے آرامی اور نیند کی کمی کی وجہ سے اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ نرس سے سر درد کی دو گولیاں لے کر وہ ہاسپٹل سے یوں بھاگا تھا جیسے کسی قیدی کو بمشکل رہائی ملی ہو۔ ہوٹل سے آدھی ڈبل روٹی کھانے کے بعد اس نے وہ گولیاں چائے کے ساتھ نگلیں اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر خود کو ذہنی طور پر پرسکون کرتا ہوا ہاسپٹل واپس آیا تو وہاب اپنے ایک کزن کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ حسب توقع وہ اسے دیکھتے ہی گلہ کرنے لگا تھا۔

''یار! تم سے اس قدر بیگانگی کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم ایک فون ہی کردیتے، انسان کو ہزار قسم کی ضرورتیں پڑتی ہیں ایسے موقعوں پر، میں نہ سہی میرا کوئی دوست ہی ادھر تمہارے پاس رک جاتا۔ بہرحال اب بتاؤ، انکل کی طبیعت کیسی ہے؟''

''خطرے سے باہر ہیں، جلد ہی وارڈ میں شفٹ کردیں گے۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''ٹھیک ہے، ابھی ہیں ہم لوگ ادھر، تم گھر جاؤ اور ذرا اپنا حلیہ ٹھیک ٹھاک کرلو۔ کچھ دیر آرام۔''

''نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کہو ولیمے کی تقریب کیسی رہی؟'' نوروز نے دانستہ اس کا دھیان اپنی طرف سے ہٹایا۔

''بہت اچھی۔ گھر ابھی بھی مہمانوں سے بھرا پڑا ہے۔ آج سسرال میں دعوت ہے۔''

''اوہ پھر تو بڑی شدت سے تمہارا انتظار ہورہا ہوگا۔ ایسا ہے کہ ابھی تو احسان صاحب آجائیں گے۔ اس لیے تم لوگ آرام سے گھر جاؤ۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلوالوں گا۔''

''شیور۔'' وہاب کو غالباً خود بھی جانے کی جلدی تھی۔

''ہاں، ہاں۔'' نوروز نے اطمینان دلایا تو وہ جلد ہی روانہ ہوگیا۔ وہ غیر شعوری طور پر احسان صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئے اس دوران وہ کئی بار ڈاکٹر سے مل کر پھوپھا جان کی خیریت کی اطلاع لیتا رہا ایک بار انہیں دیکھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کی رنگت کافی زرد ہوگئی تھی اور نقاہت بے ہوشی کے عالم میں بھی چہرے سے عیاں تھی۔ شام کو احسان صاحب آئے۔ صبح نہ آنے پر معذرت کی اور پھر اسے زبردستی گھر بھجوا دیا۔

''میں آج رات ادھر رکتا ہوں۔ تم اطمینان سے صبح چلے آنا۔''

انہوں نے اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ٹیکسی کے ذریعے گھر پہنچا تو نایاب اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی تھی۔

''کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے اپنے آپ کو۔ کل سے میری جان عذاب میں ہے اور آپ میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ مجھے میرے باپ کے پاس لے جائیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں، اتنا حق تو رکھتی ہوں نا کہ جا کر ان کی تیمارداری کرسکوں، دیکھ سکوں کہ وہ کس حال میں ہیں، ایک ایک گھڑی جس طرح میں نے کل سے گزاری ہے، وہ صرف میں ہی جانتی ہوں اور آپ لوگ اتنے بے حس ہیں کہ دوسروں کے احساسات وجذبات کی کوئی پروا ہی نہیں۔ ان کی حالت ٹھیک ہے یا بگڑ رہی ہے۔ میں ہر حال میں ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ میرا دل کٹنے لگتا ہے یہ سوچ کر کہ وہ آنکھیں کھولتے ہوں گے تو میں ان کے سامنے موجود نہیں ہوں گی۔ وہ کچھ کہیں گے اور میں سن نہیں پاؤں گی، وہ اتنی دیر تک کبھی مجھ سے دور نہیں رہے، کبھی بھی نہیں۔''

وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ نوروز بیچ صحن میں کھڑا چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

''اگر ساتھ لے جاتا تو محترمہ وہاں بھی یہ کچھ کرتیں۔'' اس کی اس قدر جذباتیت پر وہ چڑ سا گیا تھا۔ دل ہی دل میں سوچا مگر جب بولا تو لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

''آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں، وہ ٹھیک ہیں۔ صبح میں آپ کو لے چلوں گا۔'' الفاظ کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے کنجوس تھا۔ اب بھی ساری تسلی اس کے لہجے میں تھی۔

''صبح۔۔۔؟'' اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔ ''آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے، آپ کا خیال ہے میں صبح تک انتظار کرلوں گی، کبھی نہیں اگر آپ نے نہیں جانا تو میں خود چلی جاؤں گی۔ حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔ ایک وہ احسان انکل ہیں۔''

وہ احسان انکل کو کہنے لگی تھی۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر تار پہ لٹکتا تولیہ کھینچ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر باہر نکلا تو وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔ وہ اسے نظرانداز کرتا ہوا کچن میں چلا آیا نایاب نے اس کے قدموں کی آواز سنی نہیں یا پھر سن کر بھی انجان بنی بیٹھی رہی تھی۔ وہ مختلف پتیلیوں کے ڈھکن اٹھا کر دیکھتا رہا۔ سب کی سب خالی، دھلی دھلائی۔

''کیا چاہیے؟'' وہ عقب میں آکر روٹھے روٹھے سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ جان چکا تھا۔ اس نے کھانا تیار نہیں کیا۔ اس لیے خوامخواہ اسے تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا، یونہی جا کر کمرے میں لیٹ گیا۔ بازار سے کھانا لانے کی اس نے خود میں ہمت نہیں پائی تھی۔ کئی دنوں کی بے آرامی کے بعد پرسکون سے ماحول میں لیٹا تو آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں۔

نیند کے معاملے میں یوں بھی بہت کچا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد نایاب کمرے میں آئی تو وہ گہری نیند میں تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی پھر جگائے بغیر باہر نکل گئی۔ چند منٹ یونہی پورے صحن میں ٹہلتی رہی مگر دل کو قرار کہاں۔۔۔؟

آسمان کے کنارے سیاہ پڑنے لگے۔ آنگن میں ہلکی ہلکی تاریکی اتر آئی۔ تب وہ مجبوراً ایک بار پھر اس کے سر پہ آ کھڑی ہوئی۔ کئی آوازیں دینے کے بعد بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ کافی جھجکتے ہوئے اس کا بازو ہلانے لگی۔ تب اس نے کسمساتے ہوئے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر غائب دماغی سے دیکھتا چلا گیا۔

"وہ۔۔۔ اٹھ جائیے۔۔۔ رات ہو رہی ہے۔"

وہ جز بز سی ہو کر بولی۔

تب وہ ہلکا سا چونکا اور سست سے انداز میں اٹھ بیٹھا۔ نایاب ٹرے میں کھانا لگا کر لے آئی، تب بھی کسل مندی سے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ ٹرے میز پر رکھی تو وہ سر اٹھا کر وال کلاک پر وقت دیکھنے لگا۔ سات بجنے میں بس کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ گویا وہ دو گھنٹے سوتا رہا تھا۔ اس مختصر مگر بھرپور نیند نے اس کے اعصاب کو کافی پرسکون کر دیا تھا۔

انگلیوں سے بال سنوارتا وہ باہر چلا آیا۔ نایاب چپ چاپ کچن میں بیٹھی تھی۔ کسی گہری سوچ میں غلطاں۔

"آپ کھانا کھالیں پھر چلتے ہیں ہاسپٹل۔" نوروز نے گھڑی بھر کے لیے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر نل کے پاس آ کر آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اس کے کھانا کھانے تک نایاب یونہی کچن سے صحن تک چکراتی رہی۔ وہ کھانا کھا کر اٹھا تو نایاب نے لپک کر اپنی چادر اٹھائی مگر وہ دو منٹ رکنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

واپس آیا تو اس کا سفری بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ جس میں سے شلوار قمیص نکال کر وہ باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ خدا خدا کر کے اس نے نایاب کو چلنے کا اشارہ کیا تو وہ طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاسپٹل میں احسان صاحب انہیں دیکھ کر کافی حیران ہوئے تھے۔ ان کا ارادہ رات ادھر ہی رکنے کا تھا مگر اس نے شکریہ کے ساتھ انہیں گھر لوٹا دیا ان کی اتنی مدد ہی اسے بہت محسوس ہوئی تھی۔

نایاب احسان صاحب کے اصرار کے باوجود واپس جانے پر تیار نہیں ہوئی تھی اور وہ رات اس نے جاگ کر اور روتے ہوئے گزاری تھی حتیٰ کہ نوروز اس کی ان مسلسل سسکیوں سے چڑتا اس سے کچھ فاصلے پر ٹہلتا رہا تھا اگلی صبح پھوپھا جان کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ نایاب نے انہیں دیکھ کر جو

بچوں کی طرح رونا شروع کیا تو پھر ڈاکٹر اور نرسوں کی ڈانٹ سننے کے بعد ہی چپ ہوئی تھی۔

☆☆☆

پھوپھا جان پہلے سے کافی بہتر تھے۔ مگر ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ واپسی کا ارادہ کرتا سو تمام صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے تایا ابا کو فون کھڑکا دیا تھا۔ انہوں نے اسے وہیں رکنے کی تاکید کی اور پھر پہلی فرصت میں خود بھی وہاں چلے آئے۔

پھوپھا جان کو ان کی آمد سے ایک روز قبل ہی گھر شفٹ کیا تھا۔ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئے نوروز انہیں سہارا دے کر صحن میں چہل قدمی کروا رہا تھا۔ تایا ابا بہت بے قراری سے ان سے ملے تھے۔ نجانے کیوں پھوپھا جان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"بھائی میاں کہتے تھے۔ سمجھتے نہیں تھے ورنہ بہن کے رخصت ہو جانے کے بعد یوں ہم سے منہ نہ موڑتے۔" انہوں نے شکوہ کیا تھا۔

"کئی بار دل چاہا ملنے کو، دیکھنے کو مگر فرصت نصیب کہاں؟" وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ نایاب چائے بنانے چلی گئی۔ نوروز دوائیاں لانے کے لیے باہر نکل گیا۔

"دیہاتی لوگ تھے، شہر میں نئے نئے آ کر بسے تھے۔ مکر و فریب کی دنیا میں جینے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ اس ہنر کو سیکھتے سیکھتے خود کو بھی بھلائے بیٹھے تھے۔ قدم جمانے کو زمین مل گئی تھی، مقام نہیں ملتا تھا۔ آج اپنا آپ کھو کر نام کمایا ہے۔ ایسے میں بہت کچھ چھن گیا۔ دوست احباب۔ رشتے دار، ان کے ساتھ بیتے ہوئے وقت کی یادیں تک چھن گئیں ہاں اب وقت ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے تو زیاں کا احساس ہونے لگا ہے۔ جبھی تو بھاگا چلا آیا ہوں اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگنے۔" تایا ابا کے ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ تھی۔

"شرمندہ مت کرو، یہ بتاؤ بچے کیا کرتے ہیں؟ اب تو ماشاءاللہ تمہارا بوجھ بانٹ رہے ہوں گے۔" پھوپھا جان نے پوچھا تھا۔

"ہاں اللہ انہیں زندگی دے۔ سب ہی بہت نیک اور سعادت مند ہیں۔ سب سے بڑے سلیمان کی تو تعلیم سے فارغ ہوتے ہی شادی کر دی تھی دو بچوں کے بعد بہو اس دنیا سے چل بسی۔ وہ ایسا بھاگا یہاں سے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا امریکہ میں ہوتا ہے۔ بچے دونوں یہیں ہیں، فون پر باپ سے بات کرتے ہیں تو واپسی پر زور دیتے ہیں اور مجھے لگتا ہے، وہ ان کی پکار پر ایک نہ ایک دن لوٹ ہی آئے گا۔ اس سے چھوٹا ارسلان ہے تمہاری بھابھی اپنی بھانجی نیلوفر کو بیاہ کر لائی ہیں اس کے لیے، ایک بیٹا ہے ان دونوں کا پھر سدرہ ہے اس کی منگنی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اس سے چھوٹا اظفر اور نوروز پھر سویرا۔"

تایا ابا دھیرے دھیرے سب کے بارے میں بتاتے رہے۔ نوروز کے نام پر پھوپھا جان کی آنکھیں چمک سی گئی تھیں۔

"نوروز بہت اچھا انسان ہے۔ اگر اس روز یہ نہ ہوتا تو۔" پھوپھا جان جھرجھری سی لے کر رہ

گئے تھے۔

''ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہی لگا تھا کہ میں اب کبھی سانس نہیں لے پاؤں گا مگر نایاب وہ جیسے میری بے ہوشی میں بھی مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز مجھے دھیرے دھیرے زندگی کی طرف کھینچ لائی تھی اور پھر نوروز کی شب و روز کی خدمت۔۔۔ ان ہی چند دنوں نے مجھے احساس دلایا ہے بختیار کہ لوگ بیٹوں کے لیے دعائیں کیوں مانگتے ہیں، ہاسپٹل میں گزارے بہت کٹھن لمحات میں بھی میرا دل و دماغ اپنی بیٹی کی طرف اٹکا رہا تھا، اس کا کوئی بھائی ہوتا تو کیا تب بھی میں اتنا ہی بے قرار ہوتا؟ ہرگز نہیں۔ اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں بڑے آرام سے مر جاتا۔ یہ سوچ کر کہ میری بیٹی کے سر پہ کوئی مضبوط ہاتھ موجود ہے مگر اب۔۔۔ اب تو یہ نایاب مجھے سکون سے مرنے بھی نہیں دے گی۔'' وہ بہت ٹوٹے پھوٹے سے لہجے میں بول رہے تھے۔

''خدا نہ کرے بھائی میاں! آپ کی عمر لمبی ہو، ایسی باتیں آپ جیسے زندہ دل انسان کو قطعاً زیب نہیں دیتیں۔'' تایا ابا نے انہیں تسلی دینی چاہی۔

''تم بہت خوش قسمت ہو بختیار! تم لڑکھڑا کر گرنے بھی لگو تو چار کڑیل جوان تمہیں تھامنے کے لیے آگے بڑھ آئیں گے۔ خدا جانے اس نے مجھے اس نعمت سے محروم کیوں رکھا؟''

''اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے بھائی میاں! آپ شکوہ کر کے گناہ گار مت ہوں اور یوں بھی عورت کے تحفظ کے لیے باپ، بھائی کے علاوہ بھی کئی رشتے ہوتے ہیں۔'' تایا ابا کی بات پر پھوپھا جان نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

''جی ہاں شادی، آپ نایاب کی شادی کر دیجیے۔ شوہر سے بڑھ کر کوئی مضبوط پناہ گاہ اس کے لیے نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں مگر۔'' پھوپھا جان کچھ کہنے جا رہے تھے، مگر دروازے سے داخل ہوتی نایاب کو دیکھ کر چپ ہو رہے۔

نایاب چائے رکھ کر باہر نکل گئی تھی۔ تایا ابا نے کوئی بات کہنے کے لیے بھائی میاں کی طرف دیکھا مگر وہ کہیں اور متوجہ تھے۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں تایا ابا کی نگاہوں نے صحن تک سفر کیا تھا۔ ان کے عین سامنے نوروز اور نایاب کھڑے تھے۔ نوروز دوائیاں اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کچھ سمجھا رہا تھا جسے پوری توجہ سے سنتے ہوئے نایاب بار بار اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ اپنی بات ختم کر کے نوروز دو قدم آگے بڑھا تھا جب نایاب نے اسے پکارا اور کسی چیز کے متعلق پوچھنے لگی۔ اس نے قدرے جھک کر اس کی بات سنی اور پھر مختصراً کچھ کہہ کر کمرے کی طرف آنے لگا۔

تایا ابا نے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ پھوپھا جان کی آنکھوں میں عجیب سی حسرت دکھائی دے رہی تھی۔ تایا ابا نے جیسے بہت کچھ سمجھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے نوروز نے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ خاموش اور سوچ میں ڈوبے دیکھا تو وہ بھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح تایا ابا نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ جانے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے پھوپھا جان کے کمرے میں گھسے رہے۔ نجانے کیا کیا باتیں ہوئیں، نوروز نے بس اتنا دیکھا کہ پھوپھا جان کے چہرے پہ مسرتوں کا آبشار سا پھوٹا ہوا ہے۔ اس سے پہلے اتنا خوش اور مطمئن انہوں نے کسی لمحے نہیں دیکھا تھا وہ بار بار تایا ابا کا ہاتھ تھام کر ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے مارے خوشی کے ابھی رو دیں گے۔ کافی دیر بعد تایا ابا کمرے سے باہر نکلے، نایاب کو خوب پیار کیا۔ جاتے ہوئے زبردستی کچھ پیسے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔

''اب تم میری بیٹی بن گئی ہو۔'' لہجہ حد درجہ معنی خیز تھا۔ نوروز نے توجہ نہیں دی۔ نایاب چونک پڑی تھی۔ وہ انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے نکلا تو کچھ دور تک وہ یونہی پیدل ہی چلتے رہے۔ اس نے دیکھا تایا ابا اس سے کچھ کہنے کے لیے بے چین دکھائی دے رہے ہیں مگر کہہ نہیں پا رہے وہ ان کی بے چینی کو محسوس کرتا رہا مگر کھوجنا مناسب نہیں سمجھا، یہاں تک کہ وہ لوگ اسٹیشن پہنچ گئے، تب تایا ابا نے رک کر گھڑی بھر کے لیے بغور اسے دیکھا۔

وہ پہلے سے کچھ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ ملگجا سا سرمئی سوٹ اور شیو نجانے کتنے دنوں سے نہیں بنوائی تھی۔ انہیں بے اختیار ہی اس پر پیار آ گیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ یہاں اسے آرام کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ملتا۔

''اگر اظفر میں ذرا سا بھی احساس ذمہ داری ہوتا تو میں کل ہی اسے یہاں بھجوا دیتا مگر تم تو جانتے ہو، وہ کتنا لاپروا ہے۔ بھائی میاں کو ٹھیک کرنے کے بجائے خدانخواستہ دوبارہ بیمار کر دے گا۔ انہیں ایک بہت ذمہ دار انسان کی ضرورت ہے جو کہ میرے خیال میں تم سے بڑھ کر کوئی نہیں۔'' تایا ابا کے ستائشی انداز نے اسے خوامخواہ اِدھر اُدھر جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تب ہی انہوں نے بھاری رقم کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔

''یہ کچھ روپے رکھ لو، بھائی میاں کی خوراک کا خاص خیال رکھنا۔ پنشن کے سوا آمدنی کا اور ذریعہ ہی کیا ہے۔ بھائی میاں کو اس لیے نہیں دیے کہ وہ خوامخواہ خود کو چھوٹا محسوس کرنے لگتے۔''

اس نے دل ہی دل میں ہزار شکر کرتے ہوئے وہ لفافہ ان کے ہاتھ سے لے لیا تھا کہ گھر کی حالت اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جمع پونجی سے ہاسپٹل کے اخراجات ہی پورے ہوئے تھے۔ کچھ رقم احسان صاحب لگا چکے تھے۔ اس کی جیب میں موجود رقم تو بس اِدھر اُدھر کے کرایوں میں ہی صرف ہو گئی تھی۔ تایا ابا نے احساس نہ کیا ہوتا تو نجانے مزید کتنی مشکل ہوتی۔ اس نے تشکرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے لفافہ جیب میں رکھ لیا تھا اور پھر انہیں ٹرین میں سوار کرا کے وہ گھر پلٹا تو گوشت سبزی اور پھلوں سے لدا ہوا تھا۔

''پھوپھا جان کو دوا پلا دی؟'' اس نے سارے شاپرز میز پہ رکھتے ہوئے برتن دھوتی نایاب سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس کے جواب پر وہ سر ہلاتا باہر نکل آیا۔ پھوپھا جان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ غالباً سو رہے تھے۔ نوروز پلٹ کر صحن میں بچھی چارپائی پر آ لیٹا۔ ایک بازو موڑ کر سر کے نیچے

رکھتے ہوئے وہ آسمان پر نجانے کیا کھوج رہا تھا۔ کچن میں سبزی بناتی نایاب کھڑکی کی جالیوں سے متواتر اسے دیکھتی رہی تھی۔

عام سا لباس پہننے والا، عام سے خدوخال رکھنے والا یہ عام سا شخص مگر درحقیقت اس کے لیے کتنا خاص۔۔۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اور پھر ڈیڑھ ماہ بعد جب اس نے واپسی کا قصد کیا تو پھوپھا جان نے بخوشی اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ مکمل طور پر روبہ صحت دکھائی دیتے تھے سوائے مزید یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں نظر آرہا تھا اور اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اس نے پھوپھا جان کی اتنی خدمت کی تھی کہ اب وہ اسے دعائیں دیتے نہ تھکتے تھے۔

مقررہ وقت پر ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ ہر صبح ہلکی پھلکی واک کروانا، اپنے ہاتھوں سے کھلانا۔ غرض اس نے وہ سب کچھ کرلیا تھا ان کے لیے جو ان کا سگا بیٹا کرسکتا تھا اور بالآخر وہ ان کی بے تحاشا دعائیں سمیٹے واپس اپنے شہر آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

''ارے اب جان چھوڑیے اس کی۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی پہلے بچے کو کچھ کھا پی کر آرام تو کرلینے دیں۔'' تائی اماں اس کے بارے میں یونہی فکر مند ہوجایا کرتی تھیں اب تیسرے چوتھے چکر میں بھی تایا ابا کو اس سے باتوں میں محو پایا تو کہے بغیر نہ رہ سکیں تایا ابا نے ان کی بات سن کر چونکتے ہوئے وقت دیکھا تو تاسف سے سرہلا کر رہ گئے۔

''اوہو بھئی، میں نے تو خیال ہی نہیں کیا جاؤ نوروز بیٹا! تم جا کر آرام کرو۔''

''اب کیا آرام کرے گا۔ کھانا بس تیار ہے لڑکیاں میز پہ لگا رہی ہیں۔ کھا کر ہی سوجائے گا۔''

تائی اماں نے اسے اٹھنے سے منع کردیا تھا۔ تب ہی رشنا نے آکر کھانا لگنے کی اطلاع دی تو سب اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل پہ آگئے جہاں حسب معمول اچھا خاصا شور اور ہنگامہ ہورہا تھا۔ اظفر یا معیز کی موجودگی میں خاموشی یا سکون کا تصور ہی محال تھا۔

وہ اپنی مخصوص سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ چاولوں پر ایک، دو کباب رکھتے ہوئے اس کی ذہنی رو بھٹک کر پھوپھا جان کے گھر تک جا پہنچی تھی وہاں ایسی کوئی عیاشی ممکن نہیں تھی۔ کھانا کسی بھی وقت کا ہو، سلاد، چٹنی یا رائتہ جیسے لوازمات سے عاری ہوتا تھا۔ کبھی بہت ہوا تو میٹھے کے نام پر حلوہ یا سویاں پک جاتی تھیں۔ ورنہ عموماً دال روٹی، سبزی روٹی ہی چلتی تھی۔ دودھ صرف چائے کے لیے آتا تھا۔ ان باپ بیٹی نے محدود آمدنی کے پیش نظر ضروریات بھی بہت محدود کرلی تھیں۔ جبکہ یہاں ڈائننگ ٹیبل پر عام دنوں میں بھی دنیا کی ہر نعمت موجود ہوتی تھی۔ سدرہ اور انیقہ کو کھانا پکانے کا بہت شوق تھا سوآئے دن انہیں نت نئے کھانے کھانے کو ملتے رہتے تھے۔ پھر جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ ہر ایک کی الگ پسند ناپسند جس سے نمٹنے کے لیے سدرہ نے سب کی متفقہ رائے سے ایک ہفتہ وار مینیو کا چارٹ بنا رکھا تھا۔ ایک وقت میں دو تین افراد کی پسند کی ڈشز بنتیں تو ڈائننگ ٹیبل بھر جاتی تھی۔ یہ اہتمام البتہ صرف

رات کے کھانے پر ہی کیا جاتا تھا۔ دوپہر کے وقت اکثریت اپنے آفس، یونیورسٹی یا کالجز سے ہی لنچ لے لیا کرتی تھی، جو باقی رہ جاتے تھے، ان کے لیے فریزر میں محفوظ بچا کھچا کام آجاتا تھا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا جب اظفر نے اس کے کہنی ماری، وہ اس حرکت کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا، سو چمچہ ہاتھ سے چھوٹ کر زوردار آواز کے ساتھ پلیٹ میں جا گرا تھا۔ سب کی نظریں بیک وقت اس کی طرف اٹھ گئیں تو وہ خجل سا ہو کر اظفر کو گھورنے لگا جواب نہایت لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے میں منہمک تھا۔ اس نے سر جھٹک کر دوبارہ چمچہ اٹھا لیا۔

''یار! یہ اپنی سویرا اتنی پیٹو لگتی تو نہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس نے پانچواں کباب اٹھا کر پلیٹ میں رکھا ہے۔'' اظفر نے غالباً چھٹے کباب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا، سویرا ایک کباب پلیٹ میں رکھے اسے یونہی کانٹے سے گول گول گھما رہی تھی۔ چہرے پر ناراضی کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا کہ سویرا شام کو اس سے کس بات پر ناراض ہوئی تھی۔

''نوروز! کھانا کھا چکے ہو تو جاؤ، جا کر آرام کرو۔''

اس گھر میں اس وقت تک ڈائننگ ٹیبل سے اٹھنے کا رواج نہ تھا جب تک آخری فرد بھی کھانے سے فارغ نہ ہولے تائی اماں نے اسے ساکت بیٹھے دیکھا تو اس کی بے آرامی کے خیال سے کہہ اٹھیں۔ وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے چند گھونٹ پانی پی کر سب سے معذرت کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ سویرا نے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو بجھ کر رہ گئی۔

وہ کتنی دیر سے منتظر تھی کہ نوروز اس سے کوئی بات کرے اور وہ فوراً اپنی ناراضی بھلا کر اس کو بتائے کہ اس ڈیڑھ ماہ میں اس نے اسے کتنا مس کیا تھا۔ لیکن نوروز کبھی بھی اس کی امیدوں پر پورا نہیں اترا تھا۔ آج اس کی اس حرکت نے سویرا کو رات گئے تک افسردہ کیے رکھا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ اٹھا تو بیسیوں کام تھے جو اس کی غیر حاضری کی وجہ سے رکے ہوئے تھے۔ بجلی کا بل دو ماہ سے جمع نہیں ہوا تھا۔ ٹیلی فون ایک ہفتے سے ڈیڈ ہوا پڑا تھا اور کسی نے اسے ٹھیک کروانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سلیمان بھائی کے ٹیپو اور عنیزہ کی فیس ابھی تک جمع نہیں کروائی گئی تھی۔ نیلو بھابھی اسے ناشتا دینے کے ساتھ ساتھ کاموں کی فہرست بھی بتاتی چلی گئیں تو ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دوپہر تک شدید خواری کے بعد وہ ان تینوں کاموں کو نمٹا چکا تو گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہا، وہ سیدھا خالہ نصرت کی طرف چلا آیا وہ اس کی امی کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اپنی محبت اور بے پایاں خلوص کے عظیم الشان مظاہروں سے وہ نوروز کو اپنی طرف اس حد تک مائل کرچکی تھیں کہ وہ اپنے گھر کے سوا کہیں اور جانا پسند کرتا تھا تو وہ واحد خالہ نصرت کا گھر ہی تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ موٹر سائیکل لے کر سیدھا اندر چلا آیا۔ کچن میں مصروف صائمہ نے کھٹکے

کی آواز پر کچن سے نکل کر جھانکا اور پھر خوشگوار حیرت چہرے پر سجائے باہر نکل آئی۔

''نوروز! تم کب آئے؟''

''ابھی ابھی، تمہارے سامنے ہی آیا ہوں۔'' وہ اس کے ہشاش بشاش لہجے کو بطور خاص محسوس کرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''تم سچھے نہیں۔ میں نے سنا تھا، تم وہاڑی گئے ہوئے تھے وہاں سے کب واپس آئے؟'' وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے تک آئی اور پنکھے کا بٹن دباتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کل شام۔ لائٹ مت جلانا۔'' اس نے صائمہ کو دوسرے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا تو فوراً ٹوک دیا۔ وہ باہر تیز دھوپ سے آیا تھا اور کمرے کی نیم تاریکی جلتی آنکھوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی، صائمہ اس سے پھوپھا جان کی طبیعت کے متعلق پوچھنے لگی۔ وہ مختصراً بتاتا رہا۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ صائمہ غالباً وہ واحد لڑکی تھی جو اپنی کوشش سے اسے بولتے رہنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی ورنہ اس نے تو بس خود کو صرف سننے تک ہی محدود کر چھوڑا تھا اور خالہ نصرت اس کی اس عادت سے بے حد نالاں رہتی تھیں۔

''اے لڑکے! کیا گونگے کا گڑ کھائے رہتے ہو، جس کا دل چاہتا ہے تمہیں سنانے بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کھری کھری کبھی جلی کٹی اور کبھی رام کہانی۔''

''کھانا کھاؤ گے نا؟'' صائمہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بنانے جا رہی ہو؟''

''نہیں بس دو چار پھلکے ڈالوں گی۔'' وہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی اور نوروز اس کے متعلق سوچتا رہ گیا۔ صائمہ کو اس نے ہمیشہ بہت مخلص پایا تھا۔ وہ بہت خوش مزاج لڑکی تھی ہر کسی کا دل جیتنے والی۔ لیکن شادی اس کو راس نہیں آئی تھی۔ محض چھ ماہ بعد نجانے کیا ہوا کہ وہ ایک بار پھر بیوہ ماں کی دہلیز پر آبیٹھی اور اب دو سال ہونے کو آئے تھے وہ بظاہر یونہی ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی تھی یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مگر خالہ نصرت کے بعد صرف نوروز تھا جو اس کی آنکھوں کے رنگ پہچانتا تھا۔

پہلے وہ ہنستی تھی تو اس کی آنکھیں اس کی بھرپور مسکراہٹ کا ساتھ دیتی تھیں اور اب وہ مسکراتی تھی تو اس کی آنکھیں جھلملا سی جاتی تھیں۔

اداسی اور مایوسی کے مدھم رنگ اس لمحے بہت گہرے ہو جایا کرتے تھے اور یہ بات نوروز کو ہمیشہ بہت دکھی کر دیا کرتی تھی، اس کا دل چاہتا تھا وہ صائمہ کو ٹوک دے۔

''تم مسکرایا مت کرو، یہ مسکراہٹ تمہارے غم سے زیادہ اذیت ناک ہے۔''

مگر وہ کچھ نہ کہہ پاتا بس سوچتا رہ جاتا، ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ پھر سے ان ہونٹوں پر پہلے والی جان دار سی مسکراہٹ سجا دے، ان جھلملاتی آنکھوں میں زندگی کی روشنی بھر دے اور وہ پہلے والی صائمہ بن جائے جو کھلکھلا کر ہنستی تھی تو زندگی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا تھا۔

''اے سو گئے ہو کیا؟'' صائمہ نے اسے پکارا تو وہ آنکھوں سے بازو ہٹاتا اٹھ بیٹھا۔

''صائمہ! تمہارے شوہر نے تم سے دوبارہ ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی؟''

اس قدر اچانک سوال پر صائمہ چند لمحے کے لیے چپ رہ گئی تھی۔ نوروز کو بھی اپنی جلد بازی پر

شرمندگی ہونے لگی۔ صائمہ نے جواب نہیں دیا تو وہ اصرار کیے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک طویل خاموشی ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ صائمہ دیوار کے سہارے کھڑی ہاتھ کی لکیروں کو کھوج رہی تھی وہ چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

''ابھی کچھ روز پہلے وہ آیا تھا۔'' صائمہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''کون۔۔۔؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا مگر پھر خود ہی سمجھ گیا۔

''کیا واقعی؟'' اس نے پلٹ کر۔ بے یقینی سے صائمہ کا چہرہ دیکھا، وہ اضطراری حالت میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر بس ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''کیا کہہ کر گیا ہے؟'' اس کے بے تابانہ استفسار پر صائمہ کی ایک دوسرے میں پیوست انگلیوں میں لرزش سی اتر آئی تھی۔

''وہ کچھ کہنے نہیں آیا تھا۔''

''پھر؟''

''کچھ کاغذات دینے آیا تھا۔'' صائمہ کی آواز رندھ گئی تھی، نوروز کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔

''کیسے کاغذات؟'' اسے کچھ کچھ انداز ہو چلا تھا۔

''ط۔۔۔ طلاق کے۔۔۔ طلاق کے کاغذات۔ اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا نوروز! ہمیشہ کے لیے۔ ایک ایسے جرم کی سزا ملی مجھے جو میرا تھا ہی نہیں، کوئی قصور نہیں تھا میرا، کوئی بھی نہیں۔''

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی اور نوروز ہونق بنا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس ردِعمل کا اظہار کرے۔

اس نام نہاد بندھن کے ختم ہو جانے پر اسے مبارکباد دے یا اس کی آس، امید کا آخری در بند ہو جانے پر اظہارِ افسوس کرے۔ وہ یونہی الجھا الجھا سا بیٹھا لفظ جوڑتا رہا۔ حرف گنتا رہا۔ جملے ترتیب دیتا رہا مگر چپ کا بے زبان خنجر اس کے ہونٹوں پر آتے جملوں کو کاٹتا چلا گیا۔ لفظوں کی دھجیاں اڑا دیں اور خاموشی کے لہجے میں تسلی، دلاسے، حوصلے کا نوحہ گانے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں ہر ٹک کے بعد ایک عذاب لمحہ کائنات کی گود میں گراتی چلی گئیں۔

نجانے کتنا وقت بیت گیا۔ صائمہ روتے روتے نڈھال ہو گئی۔ اس کی ہچکیاں سسکیوں کا روپ دھار گئیں اور سسکیاں صبر کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ پھر وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی نوروز نے ایک طویل سانس لے کر اسے باہر جاتے دیکھا پھر نجانے کب سے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھا اور ٹرے کھسکا کر باہر نکل آیا۔ صائمہ اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی وہ موٹر سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل گیا اور اس شام وہ بے مقصد ہی موٹر سائیکل پر بیٹھا شہر کی ویران سڑکیں ناپتا رہا تھا۔

☆☆☆

دنیا کا تماشا دیکھ لیا
غمگین سی ہے بے تاب سی ہے
امید یہاں اک وہم سی ہے
تسکین یہاں اک خواب سی
ہے
دنیا میں خوشی کا نام نہیں
دنیا میں خوشی نایاب سی ہے

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' تائی اماں کے کہے گئے ایک ہی جملے نے اس کے اپنے فیصلے کی دھجیاں اڑا دی تھیں، وہ کتنی ہی دیر بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ کتنی مشکل سے اس نے زندگی میں شاید پہلی مرتبہ صرف اپنی ذات کے لیے ایک فیصلہ کیا تھا مگر اسے بھی صرف ایک ہی جملے سے رد کر دیا گیا تھا۔

''تمہارے تایا ابا تمہارے لیے نایاب کو مانگ چکے ہیں۔''

''مجھ سے پوچھے بغیر۔۔۔؟''

''کیا پوچھنا چاہیے تھا۔۔۔؟'' تائی اماں کی آنکھوں میں سوال ابھرا تھا اور وہ سر جھکا کر رہ گیا تھا۔

''تم نے پہلے کبھی صائمہ کے متعلق ذکر ہی نہیں کیا نوروز! ورنہ ہم اس کے بارے میں ضرور سوچتے۔'' تائی اماں کا نرم لہجہ آج اسے بہت بے رحم لگا تھا۔

''اب بھی تو سوچا جا سکتا ہے تائی اماں! یہ فیصلہ ابھی اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں اس میں ترمیم کرنا ممکن نہ رہا ہو۔''

اس کی دھیمی سی آواز پر انہوں نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ انہیں بہت بدلا ہوا دکھائی دیا تھا۔ ہمیشہ ہر بات پر چپ چاپ سر جھکا دینے والے نوروز کی اتنی سی حجت نے بھی ان کے دل کو دہلا دیا تھا۔ اسی لیے وہ رات کو قدرے پریشانی کے عالم میں تایا ابا سے بات کیے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

''بات کہاں تک جا پہنچی ہے، میں نہیں جانتی لیکن بہتر ہوتا کہ اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے سے پہلے آپ اس کی رائے معلوم کر لیتے۔ وہ بہت بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔'' تائی اماں کے کہنے پر تایا ابا نے عینک کے موٹے عدسوں کے پیچھے سے بغور انہیں دیکھا۔

''کچھ کہا اس نے؟''

''آپ کو بتایا نا، میں نے، وہ صائمہ کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔'' تائی اماں نے قدرے چڑ کر کہا۔

''یہ تو اس وقت چاہتا ہوگا نا، جب تک اسے نایاب کے متعلق علم نہیں ہوگا۔ اب کیا چاہتا ہے؟'' ''وہ اب بھی یہ ہی چاہتا ہے۔'' تائی اماں نے نظریں چرا کر جواب دیا تو تایا ابا سیدھے ہو بیٹھے تھے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' جواباً تائی اماں خاموش رہی تھیں۔

''نہیں، نہیں، بہت فرق ہے ان دونوں میں اور پھر میں بھائی میاں کو زبان دے چکا ہوں، تم سمجھا دینا اسے بلکہ صبح میں خود اس سے بات کروں گا۔''

وہ کافی پریشان ہو گئے تھے اور اسی پریشانی کے سبب وہ صبح سویرے ہی اس کے کمرے میں جا پہنچے تھے۔ وہ اس وقت فوٹو اسٹوڈیو جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تایا ابا سے نظریں ملیں تو فوراً نظریں چرا گیا۔

''برخوردار! بیٹھو ذرا، تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' تایا ابا کے اس قدر سنجیدہ لہجے پر وہ دل ہی دل میں قدرے گھبرا سا گیا تھا۔

''تم جانتے ہو، صائمہ کو طلاق کیوں ہوئی ہے؟'' وہ اس کے عین سامنے بیٹھے پوچھ رہے تھے۔ نوروز نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''ہوں، کیوں شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟ محبت کرتے ہو یا محض ہمدردی؟'' اسے تایا ابا سے اس صاف گوئی کی امید قطعاً نہ تھی۔ یونہی چپ سادھے بیٹھا رہا۔

''صائمہ تم سے سات آٹھ سال بڑی ہے۔ میرا خیال ہے، وہ اپنے بارے میں تم سے زیادہ بہتر سوچ سکتی ہے۔'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئے تھے۔

''کیا اس فیصلے میں صائمہ کی مرضی بھی شامل ہے؟''

اس کا سر ایک مرتبہ پھر نفی میں ہل گیا تھا۔

''وہ ایک سمجھ دار لڑکی ہے۔ لیکن تمہارے لیے قطعی نامناسب۔ بہتر ہوگا، تم ذہنی طور پر اپنے آپ کو نایاب کے لیے تیار کر لو۔''

وہ کہہ کر چند لمحے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے رہے اور جب وہ کچھ نہیں بولا تو وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ وہ ان کے جانے کے بعد بھی اسی زاویے میں بیٹھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ شاید وہ رو رہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے آنسو صاف کرنے چاہے مگر انگلیوں کی پوریں جوں کی توں خشک واپس آ گئیں۔

اس نے بڑی حسرت سے اپنے سامنے لگے آئینے میں اپنی بنجر آنکھوں کو کھوجا۔ مگر سب کے سب آنسو دل پر ہی گرتے رہے۔ پیاسی آنکھ کو سیراب ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

وہ نیلوفر بھابھی کو میکے چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔ جب وقت دیکھا۔ کالج کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ رشنا اور سویرا کو ہمیشہ یہ ہی شکایت رہتی تھی کہ شیری بھائی اپنے آفس کے لنچ ٹائم میں انہیں لینے کے لیے آتے تھے۔ لہٰذا انہیں آدھا گھنٹہ انتظار کی کوفت اٹھانی پڑتی تھی۔ کالج چونکہ یہاں سے بے حد نزدیک تھا، سو اس نے موٹر سائیکل کا رخ موڑ دیا۔ جس وقت وہ گیٹ کے سامنے پہنچا۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ لڑکیاں دھڑا دھڑ باہر نکل رہی تھیں۔

وہ شدید رش میں سے ہوتا گیٹ کے عین سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ شدید گرمی اور پسینے کی وجہ سے

وہاں ٹھہرنا کافی دشوار لگ رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا اگر چند منٹ تک رشنا یا سویرا میں سے کسی نے اسے نہ دیکھا تو وہ مزید نہیں رکے گا۔ ماتھے پہ بہتی پسینے کی دھاریں اپنی آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے بڑی مایوسی سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ تب ہی سویرا گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اور غالباً گرمی کی وجہ سے دوپٹہ پیشانی سے آگے سرکا رکھا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے موٹر سائیکل ذرا سی آگے بڑھائی تاکہ سویرا اسے دیکھ سکے مگر اگلے ہی لمحے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس سے کافی فاصلے پر کھڑی سفید کرولا میں جا بیٹھی تھی۔ وہ ہکا بکا سا اس گاڑی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس گاڑی میں بیٹھا لڑکا قطعی اجنبی تھا۔

''کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا؟'' بات ناقابلِ یقین سی تھی۔ سو سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ مگر اس خیال پر بھی یقین کرنا کچھ ایسا آسان تھوڑی تھا۔ وہ سویرا تھی اس کی سگی بہن اسے پہچاننے میں وہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ عجب شش و پنج کی کیفیت میں اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر لی تھی۔ روانہ ہونے سے ایک لمحہ قبل تک وہ گیٹ کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ دونوں۔'' اس کے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا تھا۔ یہ بات تو اس نے سوچی ہی نہیں تھی کہ اگر وہ سویرا تھی تو لامحالہ رشنا کو بھی اس کے ساتھ ہی نکلنا تھا کیونکہ وہ دونوں اکٹھی ہی واپس گھر آتی تھیں۔

''اور ظاہر ہے، وہ دونوں اس وقت ہی کالج سے باہر نکلتی ہوں گی جب شیری بھائی کے آنے کا وقت ہوتا ہوگا۔''

وہ خود پر لعنت بھیجتا گھر آ گیا تھا۔ واش بیسن پر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے سدرہ سے کھانا لانے کو کہا اور پھر ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھا اور ابھی وہ چند لقمے ہی لے پایا تھا جب پچھلے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھول کر رشنا اندر چلی آئی۔

''نوروز بھائی! کیا کھا رہے ہیں آپ؟ مجھے تو خود بڑی بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھی سدرہ کو آوازیں لگا رہی تھی۔

''تم آج کالج نہیں گئیں؟'' نوالہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا۔

''نہیں۔ آج زیادہ تر کلاسز نہیں ہونی تھیں۔ سو میں نے چھٹی کر لی۔'' ذرا سی روٹی توڑ کر وہ اپنے میاں مٹھو کو کھلانے لگی تھی جو ہمہ وقت اس کے کاندھے پر سوار رہتا تھا۔

''اور سویرا؟''

''وہ تو گئی ہوئی ہے۔''

''کتنے بجے واپس آ جاتے ہو تم لوگ۔۔۔؟'' اس کا دل انجانے خدشوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

''عموماً دو بجے لیکن آج سویرا کا پریکٹیکل تھا۔ وہ غالباً تین بجے واپس آئے گی۔''

نوروز کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر پلیٹ میں آ گرا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر رشنا کی شکل دیکھے گیا۔

کچھ دیر پہلے کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم سا گیا تھا۔ کھانا چھوڑ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ رشنا

نے ایک نظر اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر کھانا اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کھانے میں مشغول ہو گئی۔

وہ یونہی غائب دماغی سے تپتی سڑکوں پر چلتا ہوا خالہ نصرت کے گھر کی طرف آ نکلا لیکن دروازے پر کئی لمحے کھڑے رہنے کے باوجود وہ اندر جانے کا حوصلہ نہیں کر سکا تھا۔ تب ہی ایک دم سے کواڑ کھل گئے تھے۔ صائمہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ وہ سٹپٹا سا گیا۔

''باہر ہی سے لوٹ جانے کا ارادہ ہے۔۔۔؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا، میں باہر کھڑا ہوں۔۔۔؟'' وہ حیران تھا۔

''مجھے صرف یہ احساس ہوا تھا کہ باہر کوئی کھڑا ہے، تم ہو گے، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اندر آ جاؤ۔''

وہ صاف گوئی سے کہتی ہوئی دروازہ کھلا چھوڑ کر واپس پلٹ گئی۔ خالہ نصرت آج گھر پر ہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''کہاں رہے اتنے دن؟''

''بس، کچھ مصروفیت رہی۔'' اس نے یونہی ٹالنا چاہا۔

''اے ہاں، وہ تو میں جانتی ہوں، یہ بختیار ہاؤس کے لوگوں نے کبھی تمہیں انسان تھوڑی سمجھا ہے۔ کبھی اس کام کے لیے بھاگے جا رہے ہو تو کبھی اس کام کے لیے۔ کاٹھ کا الو سمجھ رکھا ہے انہوں نے تمہیں۔ خود ان کے اپنے بیٹے تو بڑے مزے میں ہیں۔ کوئی دفتروں میں بیٹھے ہیں تو کوئی پڑھنے کے بہانے عیش کرتے پھر رہے ہیں۔'' خالہ نصرت کی وہی ازلی باتیں جو وہ بچپن سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ جو کبھی حرف بحرف سچ معلوم ہوتیں اور کبھی سراسر جھوٹ۔ لیکن اس وقت وہ ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے پایا تھا۔ ذہن کی سوئی کسی اور ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔ صائمہ جز بزسی ہو کر ماں کی باتیں سنتی رہی۔

''تمہاری ماں زندہ ہوتی تو میں دیکھتی کہ کون تمہاری اس سادگی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنے کلیجے میں چھپا کر رکھتی تھی تمہیں۔ ایسے سرخ و سفید ہوا کرتے تھے تم، کیا بتاؤں اور اب تو رنگت جھلس گئی ہے تمہاری ان لوگوں کی چاکری کر کر کے، خدا ہی سمجھے ان لوگوں کو، بچوں کی یتیمی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔''

''خدا کا واسطہ ہے امی! بس کریں۔ ایسا بھی ظلم کا کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹا ہوا اس پر۔'' صائمہ نے ماں کو خاموش نہ ہوتے دیکھا تو جھنجھلا کر ٹوک گئی۔

''لو بھئی، میں نے کچھ غلط کہا کیا؟ کیوں نوروز؟'' انہوں نے چپ بیٹھے نوروز کا بازو ہلایا۔ تو وہ چونک کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔

''مجھ سے کچھ کہا آپ نے۔۔۔؟'' اس کے بالکل انجان لہجے پر وہ بری طرح چڑ گئیں۔

''نہیں، ان دیواروں سے بک بک کر رہی تھی گھنٹہ بھر سے۔'' وہ بددل سی ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

''خیریت تو ہے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔'' صائمہ نے استفسار کیا تو وہ چند لمحے غائب

دماغی سے اسے دیکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔
''چلتا ہوں۔'' اس نے کہا تو صائمہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بس چپ چاپ اسے دروازے سے باہر نکلتا دیکھتی رہی۔
وہ گھر لوٹا تو یہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ تائی اماں اور چھوٹی چچی سمیت سب ہی لوگ لاؤنج میں موجود تھے۔ بڑی سی پرات بیچ میں رکھے وہ لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر گیت گانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی نظریں ساری محفل پر سے پھسلتی ہوئی سویرا پر جا کر ٹک گئی تھیں جو معیز سے نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہی تھی۔
تب ہی اظفر کی نگاہ اس پر پڑی تو اس نے فوراً گانا بدل دیا۔

میرے بھیا کی جائے گی
بارات
میں ڈھول بجاؤں گا

وہ بری طرح تالیاں پیٹ رہا تھا۔
''افوہ اظفر کے بچے! اس وقت تو تم خود پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح بج رہے ہو۔ اس لیے بہتر ہے، اپنا منہ بند رکھو۔'' سدرہ نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔
''میں اپنا منہ بند رکھوں تا کہ تم اپنی لطیف جیسی آواز سے ہمارے کانوں میں خراشیں ڈال سکو ہرگز نہیں۔'' اظفر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کی اس درجہ بدتمیزی پر سدرہ نے پرات اپنی طرف کھینچ لی تھی۔
''یہ لوگ اس قابل ہیں ہی نہیں کہ انہیں اپنے ساتھ محفل میں شریک کیا جائے۔ بھگاؤ ان کمبختوں کو۔''
شہلا نے نعرہ لگایا تھا اور اس کے ساتھ ہی دونوں طرف سے کشن پھینکے جانے کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے اس دنگا فساد کو دیکھتا رہا۔ پھر سویرا کو آواز دے کر چائے لانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سویرا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچن میں بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ چائے لے کر اس کے کمرے میں موجود تھی۔
''تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''
''بہت اچھی۔'' سویرا بھائی کے التفات کی ہمیشہ ہی منتظر رہتی تھی اب بھی بڑی خوش دلی سے جواب دیا تھا۔
''آج میں تمہیں لینے کے لیے کالج گیا تھا۔'' اس نے سویرا کے چہرے کو جانچتی نگاہوں سے دیکھا۔
''مجھے لینے کالج کس وقت؟'' وہ بھرپور حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ نوروز کو ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کی رنگت بدلتی محسوس ہوئی تھی۔
''یہی کوئی ڈیڑھ بجے۔''
''اوہو۔ آپ نے مجھے بتایا ہوتا تو میں پریکٹیکل مس کر کے اسی وقت آپ کے ساتھ آ جاتی۔''

اسے جیسے بہت افسوس ہوا تھا اس کے ساتھ نہ آنے پر۔
''کیوں؟''
''اس لیے کہ پریکٹیکل تو ہفتے میں تین بار ہوتا ہے۔ کل بھی کر سکتی تھی مگر آپ تو کل مجھے لینے نہیں آ سکتے نا؟''
''اور اگر میں کل تمہیں لینے آ جاؤں تو؟'' وہ ابھی تک اسے صرف کھوج رہا تھا۔
''کیا واقعی آپ میرے لیے اتنا کر سکتے ہیں؟'' وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی تو نوروز خود سے شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے یوں خاموش ہوتا دیکھ کر سویرا سر جھٹکتی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔
''نوروز بھائی! آپ کو پتا ہے تائی اماں آپ کی شادی کی تاریخ پکی کرنے والی ہیں۔'' وہ بڑی خوشی سے اطلاع دے رہی تھی۔ نوروز کے لیے چائے کا گھونٹ بھرنا دشوار ہو گیا۔
''آپ نے تو دیکھا ہوا ہے نا بھابی کو؟ کیسی ہیں وہ؟ غصے کی تیز نہ ہوئیں تو میری ان سے سب سے زیادہ دوستی ہو گی۔ میری سگی والی بھابی ہوں گی نا! ویسے تو نیلو بھابی بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ نے بتایا نہیں بھائی! وہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں؟'' سویرا کے لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔
''سویرا! میرے سر میں بہت درد ہے۔ تم جاؤ اب۔''
اس کے بے حد اکتائے ہوئے انداز پر سویرا کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ یونہی کرتا تھا، اپنے آپ میں الجھ کر سامنے والے کے احساسات و جذبات کی اس کو پروا ہی نہ رہتی تھی۔ سویرا تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج میں جانے سے پہلے اس نے اپنی آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑا مگر نجانے کیوں آنسو بہتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

تیز چلچلاتی دھوپ میں اظفر اور مہران بائیک پر یونیورسٹی سے واپس آئے تو دونوں ہی تپے ہوئے تھے۔ آنکھیں بمشکل اتنی کھول رکھی تھیں کہ راستہ نظر آ جائے۔ اس پر گھر میں ایسا ہولناک سناٹا طاری تھا کہ وہ حیران و پریشان رہ گئے تھے۔
''یہ فوجیں کہیں مٹر گشت کرنے تو نہیں گئیں۔'' اظفر نے خیال ظاہر کیا۔
''نہیں بھئی، گرمیوں میں مٹر گوشت کہاں پکتا ہے؟'' مہران کو غالباً زیادہ ہی گرمی لگی تھی۔ اظفر نے مشکوک انداز سے اسے دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا گرمیوں میں گھر کی سب سے ٹھنڈی جگہ لاؤنج ہوا کرتی تھی کیونکہ چاروں طرف کمرے تھے نیز اے سی بھی ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ سو وہ دونوں سیدھے وہیں چلے آئے۔
''شیری بھیا کے مزے ہیں، بھئی گاڑی میں آتے ہیں۔ گاڑی میں جاتے ہیں۔'' اظفر نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر گرا۔ اگلے ہی لمحے تیز چیخوں سے لاؤنج گونج اٹھا تھا۔
''کون بدتمیز ہے یہ؟'' یہ چھوٹی چچی کی آواز تھی۔ اظفر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگا،

جدھر سے آواز آ رہی تھی، معلوم ہوا اس صوفے پر چھوٹی چچی اونگھ رہی تھیں جس پر اظفر نے بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔

باہر دھوپ سے آنے کی وجہ سے ابھی تک آنکھیں کمرے کی تاریکی سے مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ لائیٹ بھی بند تھی۔ دوسرے صوفے کا جائزہ لینے لگا، مبادا وہاں بھی کوئی اونگھ رہا ہو۔

''اب اسٹیچو بن کر کیوں کھڑے ہو؟ وہ سامنے والا صوفہ خالی ہے، وہاں بیٹھ جاؤ۔'' اندھیرے میں ان کے عقب سے سدرہ کی آواز ابھری تو وہ اچھل پڑے۔

''اور ہاں ذرا خیال سے، قالین پر انیقہ محوِ استراحت ہے۔ اسے مت کچل دینا۔''

''لاحول ولاقوۃ! آخر سب لوگ یہیں کیوں دفن، میرا مطلب یہیں کیوں استراحت فرما رہے ہیں اور اتنی ہدایات دینے سے تو بہتر ہوتا اگر تم اٹھ کر لائیٹ جلا دیتیں۔'' مہران چڑ کر بولا تھا۔

''اوہ سوری۔ میں بھی آپ کو علم ہوگا کہ آپ کی دائیں طرف موجود دیوار پر سوئچ بورڈ لگا ہوا ہے۔'' اس نے شانِ بے نیازی سے جتایا۔

''افوہ چل یار! اپنے کمرے میں ہی چلتے ہیں۔''

''کمرے میں چلتے نہیں کمرے میں جلتے ہیں۔ اس وقت سورج کی شعاعیں سیدھی آپ کے کمرے کا طواف کرتی ہیں۔'' مہران نے گویا اسے اطلاع دی۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' سدرہ نے ہانک لگائی تھی۔

''نہیں، اب اتنی گرمی میں بھلا کون کھانا کھائے۔''

''ہائیں! یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' سدرہ نے حیرت کا اظہار کیا مگر اظفر جواب دیے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ انہیں گئے ہوئے بمشکل پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے جب عجیب بے ہنگم چیخ و پکار نے لاؤنج میں موجود سب افراد کو ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''یا اللہ خیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' تائی اماں حواس باختہ سی ہو کر لاؤنج میں چاروں طرف گھوم گئی تھیں۔ کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ قیامت کا سا شور اور ہنگامہ کدھر ہو رہا ہے۔ آخر شہلا کی نشاندہی پر سب کی دوڑ پچھلے لان کی طرف لگ گئی تھی۔ جیسے ہی برآمدے کا دروازہ کھول کر وہ اندھا دھند باہر کی طرف نکلیں ویسے ہی چھپاک کی آواز سے کوئی چیز ان پر آ گری تھی۔ فلک شگاف چیخیں خود بخود ان کے حلق سے نکلتی چلی گئی تھیں۔ نکلتی رہی تھیں اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ اپنی خمار آلود آنکھیں جھپکاتی۔ منہ پھاڑے ایک دوسرے کو رنگین پانی میں شرابور ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

''گرمی بہت ہو رہی تھی، بزرگوں سے سنا ہے، دوسروں پر رنگ دار پانی پھینکنے کے بعد جتنی گالیاں پڑیں گی، اتنی ہی زیادہ بارش برسے گی۔ اب براہِ مہربانی آپ لوگ کورس میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔''

اظفر بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ سب چند لمحے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتی رہیں اور پھر جیسے ہی ان کے ہاتھ اپنی اپنی چپلوں کی طرف بڑھے۔ اظفر نے آگے آگے دوڑ لگا دی تھی۔

شام کو وہ دونوں باقی سب بچوں کو ساتھ لیے پچھلی دیوار پر چڑھے بیٹھے تھے اور اپنی اپنی چوٹوں

کو سہلاتے ہوئے کسی بد دماغ آدمی کی آمد کے منتظر تھے تا کہ اس پر پانی پھینک کر گالیاں سننے کا فرض پورا کیا جا سکے۔ گھر والوں نے تو گالی تو ایک بھی نہیں دی تھی بس چپلوں سے تواضع کی تھی اور ظاہر ہے چپلوں کی تواضع سے تو بارش ہونے سے رہی تھی۔ وہ تو اڑتے اڑتے خبر بزرگوں تک جا پہنچی جس کے بعد شیری بھائی نے منت سماجت اور ارسل بھائی نے ڈانٹ ڈپٹ کا سہارا لے کر بالآخر انہیں نیچے اتار ہی لیا تھا ورنہ ہو سکتا تھا بجائے گالیوں کے ان کی تجہیز و تکفین کا ہی انتظام کرنا پڑ جاتا۔

☆☆☆

تایا ابا، تائی اماں، چھوٹی چچی اور سدرہ کے ساتھ جا کر شادی کی تاریخ طے کر آئے تھے کہ پھوپھا جان اپنی گری ہوئی صحت کے سبب بار بار اصرار کر رہے تھے۔ شادی میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا مگر لڑکیوں نے ڈھولک ابھی سے منگوا لی تھی۔ ساری دوپہر برباد کرنے کے بعد رات کو پھر ڈھولک کی شامت آجاتی تھی۔ ایسے میں نوروز اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے کی ہی کوشش کرتا تھا۔ اس روز بھی وہ اپنے فوٹو اسٹوڈیو میں بیٹھا تھا جو اس نے شوقیہ ہی کھولا تھا اور اب اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھا جب اظفر وہاں چلا آیا۔

''گھر جا رہا تھا، سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لوں۔ اکٹھے چلتے ہیں۔'' اظفر نے کہا تو وہ اپنے ساتھ کام کرنے والے لڑکے کو ہدایت دیتا ہوا اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔

گلابی شام میں بازار کی رونق بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اظفر اپنی ہی گپیں ہانکتا رہا، کچھ اس نے سنیں کچھ اپنی سوچ میں کھو کر نظرانداز کر گیا۔ گھر پہنچے تو تائی اماں اور چھوٹی چچی زور و شور سے باتوں میں مگن تھیں۔ لڑکیاں ادھر ادھر مصروف تھیں۔

''خیریت بھئی، آج ڈھولکی کا پروگرام کینسل ہو گیا کیا؟'' اظفر نے اندر داخل ہوتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

''کھانا تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے مہمان آ گئے تو بچیاں ان کی تواضع میں مصروف ہو گئیں۔''

''ہائیں! کون سے مہمان آ گئے تھے؟'' وہ دونوں وہیں ان کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ اظفر کے اشتیاق پر تائی اماں اپنی باتیں چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئیں اور پھر بطور خاص نوروز کو بتانے لگیں۔

''کوئی اجنبی لوگ تھے۔ کم از کم ہمارے رشتہ داروں یا جاننے والوں میں سے نہ تھے۔ سویرا کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔ اے صفیہ! مجھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بالکل غیر لوگ، ہماری سویرا ان کی نظر میں آئی کیسے؟'' تائی اماں الجھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ نوروز کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے کار میں بیٹھے اس نوجوان کا چہرہ گھوم گیا تھا۔

''سویرا کی کسی دوست وغیرہ کے توسط سے تو نہیں آئے یہ لوگ؟'' وہ کچھ سوچ کر بولا تھا۔

''انہوں نے کسی کا نام تو نہیں لیا بس مبہم سی بات کر رہے تھے۔''

☆☆☆

"کمال ہے بھئی، یہ لوگ تو ہماری سویرا کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں؟" تائی اماں فکرمند سے لہجے میں کہتی ہوئی پچھلے برآمدے میں بچھے تخت پر آ بیٹھی تھیں، مسالے صاف کرتی ہوئی چھوٹی چچی نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں ہے تو خیریت۔۔۔۔ اے نیلو! بیٹا ذرا بھاگ کر میرے لیے ایک کپ چائے کا کہہ آؤ کسی سے۔"

انہوں نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا تو ٹیپو کو بڑے انہماک سے ہوم ورک کرواتی نیلوفر فوراً ہی اٹھ گئی تھی۔

"وہی لوگ دوبارہ آئے بیٹھے ہیں۔ وہ تو شکر ہوا، اظفر کے ابا موجود تھے اب خود ہی نبٹ لیں گے۔"

"تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے آپا؟ جس گھر میں بیری ہو، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ ہماری نہیں مرضی تو وہ کیا کر لیں گے۔ ٹال دیجیے انہیں کہہ دیں کہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں کیے جاتے۔" چھوٹی چچی نے خاصے تعجب سے انہیں دیکھا تھا۔ جس پر تائی اماں رازدارانہ انداز میں ان کے قریب کھسک آئیں۔

"دیکھو، صرف تم سے بات کر رہی ہوں۔ یہ عورت اور اس کی بیٹیاں اس رشتے پر کچھ زیادہ راضی نظر نہیں آتیں۔ عجیب کترایا کترایا سا انداز ہے ان کا، ایک آدھ بار اپنے بیٹے کا نام بھی لیا ہے کہ اس کی وجہ سے انہیں دوبارہ یہاں آنا پڑا ہے بس ایک یہ ہی بات کھٹک گئی ہے مجھے۔ اظفر کے ابا کو سمجھا آئی ہوں کہ ہمیں پرائے لوگوں سے رشتہ داریاں نہیں بنانی لہٰذا کوئی نہ کوئی بہانا کر کے چلتا کریں۔"

"یہ تو اچھا کیا آپ نے۔ خیر اب فکرمند نہ ہوں۔ بھائی صاحب کو بات کرنے کا طریقہ سلیقہ آتا ہے، خود ہی مناسب طریقے سے ٹال دیں گے انہیں۔ یہ لیجیے نیلو چائے لے آئی ہے۔ آپ سکون سے چائے پئیں۔" چھوٹی چچی نے نیلو کو آتے دیکھا تو بڑے سبھاؤ سے بات بدل گئیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ نیلو پر اعتبار نہیں کر سکتی تھیں لیکن بعض معاملات وہ صرف آپس تک ہی محدود رکھنے کی عادی تھیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی معاملہ تھا۔

☆☆☆

"ہم ماں بیٹی بھی کیسے نصیب لے کر آئی ہیں اس دنیا میں۔ ماں بیوہ اور بیٹی طلاق یافتہ۔ تم زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرنے جا رہی ہو۔ ان مبارک ساعتوں میں ہم اس لیے تمہاری طرف

"آپ نے کیا کہا اماں؟" اظفر نے یونہی پوچھا تھا، مگر تائی اماں اسے یوں گھورنے لگی تھیں جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ "ارے کہنا کیا ہے؟ ماشاء اللہ سے گھر بھرا پڑا ہے لڑکوں سے ایک سے ایک لائق فائق اور فرمانبردار بچہ موجود ہے خاندان میں، ہم بھلا کیوں اپنی بچی پرائے گھر میں بھیجیں۔"

ان کے استحقاق بھرے قطعی لہجے پر اظفر کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا تھا۔ جبکہ نوروز نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگلے ایک دو روز تک ڈھولک کا شور سننے میں نہیں آیا، تائی اماں نے ایک دو بار تذکرہ کیا کہ سویرا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ان کی بات سنتے ہی اس کا ذہن نئی کہانیاں بنانے لگتا تھا۔ اسی ٹینشن میں وہ سویرا کی طبیعت کا پوچھنے اس کے کمرے تک بھی نہیں جا سکا تھا۔

شادی میں پندرہ روز باقی تھے جب گاؤں سے بڑی چچی کی آمد بھی ہو گئی۔ ان کے آنے سے شادی کے ہنگاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، وہ خاصی زندہ دل خاتون تھیں۔ محفل کو کشت زعفران بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سلجھے ہوئے ذہین وفطین شیری بھیا اور نازک سی انیقہ کو دیکھ کر وہ بارہا حیرت کا اظہار کرتی رہیں۔

"ارے آپا! ذرا دیکھو تو یہ میرے بچے لگ ہی نہیں رہے، کیسی اچھی قسمت ہے میری، اپلے تھاپتے تھاپتے سسرال میں آئی تھی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا، میری اولاد اتنا پڑھ لکھ جائے گی اور یہ شیری کو دیکھو ذرا عینک لگا کر کیسا ماسٹر لگنے لگتا ہے۔" ان کی باتیں سن کر شیری بھیا جھینپتے اور باقی مسکراتے رہے۔

"مجھ سے ملنے بھی تو نہیں آتے یہ۔ دل کیسا ترستا رہتا ہے ان کو دیکھنے کے لیے۔ پچھلے سال آئے تھے یہ دونوں بہن بھائی اور اب میں آئی ہوں۔" وہ انیقہ کے بال سنوارتے ہوئے شکوہ کر رہی تھیں۔

"بس بہن! اولاد کی بہتری کے لیے والدین کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔"

تائی اماں کے کہنے پر بڑی چچی نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ پھر بڑی چچی کی ایما پر ہی سب لوگ مایوں کی رسم ادا کرنے پر راضی ہو گئے تھے ورنہ نوروز نے کہہ رکھا تھا کہ ابھی سے یہ کھڑاک پھیلانے کی ضرورت نہیں۔

"ارے لڑکوں کا کیا ہے، شرم کے مارے کہہ دیتے ہیں ایسی باتیں۔"

بڑی چچی اس کی بات چٹکیوں میں اڑا گئی تھیں۔ پھر اسی شام اظفر اور مہران نوروز کو کھینچ کھانچ کر اس کے کمرے سے باہر نکال لائے تھے چوکی پہ بٹھا کر مایوں کی رسم ادا کی گئی، ڈھولک کی تھاپ اور نسوانی قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ نوروز نے کنپٹیوں پر تیل کی بہتی دھاریں محسوس کیں تو اسے بے اختیار وہاب یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ رات جب اس نے سرخ دروازوں پر لکھے ہوئے B-4 کو ذہن نشین کیا تھا۔ مایوں کی رسم ادا کرنے کے بعد یہاں بھی طوفانِ بدتمیزی کا آغاز ہو گیا تھا۔ نہ نہ کرتے بھی وہ ایک دوسرے کی درگت بنانے پر تل گئے تھے اور جب خوب کھیل تماشے کے بعد وہ لوگ دولہا کی ہیئت کذائی دیکھنے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ دولہا صاحب وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔

نہیں آتے کہ کہیں ہم تیرہ بختوں کا سایہ تمہاری خوشیوں پر نہ پڑ جائے ہم نہیں چاہتے کہ ہم کسی محفل میں جائیں اور لوگ ہمیں منحوس سمجھتے ہوئے ایک کونے میں بٹھا دیں۔ یہ سب میرے لیے نیا ضرور ہے مگر عجیب نہیں۔ اپنے بچپن میں میں نے کئی بار اپنی ماں کو اس صورتِ حال کا سامنا کرتے ہوئے دیکھا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ میرا مقدر مجھ سے ایک چیز چھینے گا تو اس کے ساتھ ہزار باتوں سے خود مجھے دست بردار ہونا پڑے گا مجھے علم تھا کہ اللہ مجھے صرف ایک دکھ دے گا اور اس کے ساتھ ہزاروں غم میرے اپنوں کی دین ہوں گے۔ سو تم مجھ سے شکوہ مت کرو، میں اپنے گھر میں بیٹھ کر بھی تمہاری خوشیوں کو شیئر کر سکتی ہوں۔''

''خوشیاں۔'' وہ زیرِ لب دہراتا ہوا اپنے دل میں اس لفظ کو کھوجنے لگا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ دن بھر کی جلتی بلتی کائنات رات کے آغاز میں ٹھنڈی پڑ چکی تھی، ہوا کے جھونکوں میں قدرے تیزی تھی اور صحن کی داہنی دیوار کے ساتھ لگے شہتوت کے درخت اس ہوا کے زور پر ہولے ہولے جھومنے لگتے تھے۔ آسمان پر ادھورا چاند ہولے ہولے مغرب کی سمت سرک رہا تھا۔ صائمہ کا آدھا دھڑ جو اس ادھورے چاند کی نیم جان سی چاندنی کی زد میں تھا اور خود وہ مکمل طور پر اندھیرے میں بیٹھا تھا۔

''امی کو تمہاری شادی کی خبر سن کر کافی دھچکا لگا تھا۔ اگر تم پہلے سے انہیں اطلاع دے دیتے تو۔۔۔'' وہ بات نامکمل کر چھوڑ کر خوامخواہ ہی سر جھٹک کر مسکرا دی تھی۔

''وہ ایک بار پھر مجھے ایسے راستے پر چلتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں جس کے درمیان میں پہنچ کر مجھے واپسی کا سفر طے کرنا پڑتا اور واپسی کا سفر بعض اوقات بہت اذیت ناک ہوتا ہے نوروز۔'' اس کی آواز میں نمی سی گھل گئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تم اب جاؤ، امی اٹھ گئیں تو ان کی باتوں میں تمہیں دیر ہو جائے گی۔'' وہ اس کی طرف سے رخ موڑے کھڑی تھی، وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''اور ہاں کوشش کرنا کہ اب تم یہاں زیادہ نہ آؤ یہ تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا اور میرے حق میں بھی۔''

صائمہ کا لہجہ مضبوط تھا۔ اس کے دل سے خون کا ایک قطرہ درد بن کر نکلا اور پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ اس نے قدم اٹھا کر دہلیز کے پار رکھا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

میں بھول جاؤں تمہیں یہ ہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں کم بخت
بھلا سکا نہ یہ وہ سلسلہ جو تھا ہی نہیں
وہ اک خیال جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں

مجھے ہے یاد وہ سب جو کبھی ہوا ہی نہیں
اگر یہ حال ہے دل کا تو کوئی سمجھائے
تمہیں بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر حقیقت ہو، کوئی خواب نہیں

گھر نزدیک آ گیا تھا، ڈھولک کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ بہت آہستگی سے گیٹ کھول کر گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی مگر نیند آنکھوں سے ایسی غائب ہوئی تھی کہ بار بار کروٹیں بدلنے کے بعد وہ جیسے تھک کر اٹھ بیٹھا تھا۔ باقی سب لوگ تھوڑی دیر پہلے ہی ڈھولک پیٹ کر، گلے پھاڑ پھاڑ کر گانے کے بعد تھک ہار کر سونے کے لیے گئے تھے۔ جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا ان لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آج بھی انہوں نے شام ہی سے خوب ہنگامہ کر رکھا تھا۔ وہ اسٹوڈیو سے واپس آیا تو محفل اپنے عروج پر تھی۔ چھوٹی چچی اور تائی اماں دوپٹوں پر گوٹا لگا رہی تھیں۔ سدرہ سلائی مشین سنبھالے بیٹھی تھی اور ڈھولک بدقسمتی سے معیر اور مہران کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور تو اور ارسل بھائی بھی اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر نجانے کیسے یہاں آ بیٹھے تھے۔ سویرا کو پتا نہیں کیا ہوا تھا وہ گھٹنوں میں منہ دیے صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی۔

''ارے دولہا میاں! کبھی دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔''

بڑی چچی نے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر آواز لگائی تو وہ پلٹ کر وہیں آ بیٹھا۔ بڑی چچی اس سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد دوبارہ تائی اماں سے مختلف رسومات کو ڈسکس کرنے لگی تھیں۔ وہ یونہی بے دلی سے وہاں بیٹھا رہا۔

''ارے ہوا کچھ نہیں۔ کل سے ایک ہی ضد پکڑ رکھی ہے کہ شادی پر پانچ جوڑے بنواؤں گی۔ ارے سب نے چار چار جوڑے بنوائے ہیں۔ اس کو پانچواں بنا دیا تو باقی بھی ماؤں کے سر ہو جائیں گی۔''

تائی اماں کی جھنجھلائی ہوئی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ سویرا کے انداز نشست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ارسل بھائی جو جب سے اس کی ناراضگی کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر جا بیٹھے تھے اور اب اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیے بڑی محبت سے اس سے پوچھ رہے تھے۔ وہ بھیگی پلکیں لیے، قالین پر نظریں جمائے بالکل ایک ضدی بچی کی طرح لگ رہی تھی۔ چہرے پر ناراضی کے تمام اثرات موجود تھے۔

''تو ٹھیک ہے بھئی اگر ایک سوٹ کے بدلے ہماری گڑیا کے چہرے پہ مسکراہٹ آ سکتی ہے تو ہمیں یہ سودا مہنگا نہیں۔'' ارسل بھائی نے سر جھٹکا اور جیب سے والٹ نکال کر ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ لو اور بہت ہی زبردست سا سوٹ ہونا چاہیے، جسے پہن کر ہماری گڑیا بالکل شہزادی لگنے لگے۔'' ارسل بھائی اسے ہمیشہ کسی ننھی بچی کی طرح ہی ٹریٹ کیا کرتے تھے۔ سویرا پیسے تھامنے کے بجائے چہرہ موڑ کر بغور انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''ارے بھئی، لو نا۔'' شفقت، محبت ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجے سے بھی چھلک رہی تھی۔ سویرا نے ہاتھ بڑھا کر وہ پیسے لے لیے تھے۔ پھر نوروز کی طرف دیکھا اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ چند لمحے اسے دیکھتی ہی رہی تھی۔ بہت عجیب سا انداز تھا، اس کا شکوہ کرتا ہوا۔ کچھ جتاتا ہوا۔

''شاید سویرا کی خواہش تھی کہ ارسل بھائی کی جگہ میں۔'' اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے سوچا، عین اسی لمحے سویرا اٹھی تھی اور بھاگتی ہوئی لاؤنج سے باہر نکل گئی تھی نوروز کو ایک لمحے کے لیے افسوس ہوا۔

''چلو کوئی بات نہیں، کل اسے اپنے ساتھ بازار لے جاؤں گا۔ اپنی مرضی سے جو خریدنا چاہے گی، لے دوں گا۔''

اس نے دل ہی دل میں ارادہ باندھا، خود کو تسلی دی اور سونے کی نیت سے اوپر چلا آیا تھا۔ مگر اس شور میں نیند کا آنا محال تھا۔ وہ یونہی کانوں پہ تکیہ رکھے لیٹا رہا تھا۔ اور اب جب ہر طرف سکون پھیل گیا تھا تو نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج میں جھانکا۔ ہر چیز جوں کی توں پڑی تھی۔ عین وسط میں پھٹی ہوئی ڈھولکی، سدرہ کی سلائی مشین، صوفوں پر بکھرے رنگین کپڑے اور چائے کی خالی کپوں سے بھری ہوئی ٹرے۔

''پتا نہیں ہر روز ان لوگوں میں اتنی انرجی کہاں سے آجاتی ہے؟'' وہ سوچتے ہوئے پلٹا تھا تب ہی اس کی نگاہ پچھلے برآمدے میں کھلنے والے دروازے پر جا پڑی۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے وہ دوازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پریشان ہوتے ہوئے فوراً ہی زینہ اترنے لگا تھا۔ شادی والے گھر میں ایسی لاپروائی کوئی بہت بڑا نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا مختلف چیزیں پھلانگتا دروازے تک پہنچا جو واقعی کھلا ہوا تھا۔

''حد ہوتی ہے لاپروائی کی، اگر تایا ابا میری جگہ ہوتے تو اسی وقت اس لاپروائی پر سب کو لائن حاضر کر لیتے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

چاند پورا تھا اور اس کی اجلی چاندنی مین پورا لان جگمگا رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر ڈھیر سارے پھولوں کی ملی جلی مہک اپنے اندر اتاری اور سرسراتی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لیے لان میں ٹہلنے لگا، تب ہی پچھلی دیوار کے ساتھ لگے امرود کے چھوٹے سے درخت کے پیچھے ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی وہ یونہی چلتا چلتا ادھر آ گیا۔ امرود کے درخت کے پیچھے اسے کسی ہیولے کا شائبہ ہوا تھا۔

''کون ہے۔۔۔؟'' اس نے ٹھٹک کر رکتے ہوئے یونہی اپنی تسلی کرنی چاہی تھی مگر اس کے جواب میں کوئی تھا جو تیزی سے بھاگ کر بیری کے گھنے درخت کی طرف بھاگا تھا جس کی شاخیں بڑھ کر زمین کو چھو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

''اے خبردار! رک جاؤ۔'' وہ خود کو ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار کرتا ہو چلایا تھا اور ایک

ہی جست میں اس تک پہنچ کر اسے کھینچ کر بیری کے جھنڈ میں چھپنے سے روکا تھا، اس کے زوردار جھٹکے کے جواب میں نسوانی آہ ابھری تھی اور نوروز اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔

وہ کون ہو سکتی تھی، اس کا اسے اندازہ تھا مگر دل نے پوری شدت سے خواہش کی تھی کہ ایسا نہ ہو۔ اپنے منجمد وجود کو حرکت دیتا وہ اس تک آیا تھا۔ چادر میں لپٹا وجود زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے آگے بڑھنے سے قبل ہی وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نوروز کی کپکپاتی انگلیوں نے چہرے سے لپٹے نقاب کو ایک جھٹکے سے ہٹایا تھا۔

''کاش! اس ایک چہرے کو یہاں دیکھنے سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔'' اس کے دل نے دعا کی تھی سویرا لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ نیم تاریکی میں اس کا سفید پڑتا چہرہ اسے بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔

''کہاں جا رہی تھیں تم۔۔۔؟'' وہ سرد آواز میں غرایا تھا۔ سویرا کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے اس صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں، کہاں جا رہی تھیں تم۔۔۔؟'' اس کا کھردرا ہاتھ یک لخت ہی اس کی گردن پر جم گیا تھا۔ سویرا کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کی کلائیوں پہ گرنے لگے تھے۔ وہ خوف کے مارے خود میں چیخنے کی ہمت بھی پیدا نہ کر سکی تھی۔

''بولو جواب دو۔'' شدید غم و غصے سے اس کی گرفت خود بخود سخت ہوتی چلی گئی تھی۔

''نہیں، آپ کو جواب نہیں دوں گی، آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلائی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں۔۔۔؟'' حد درجہ متعجب مانوس آواز بہت قریب سے سنائی دی تھی۔ نوروز ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ کر مخاطب کی طرف پلٹا تھا۔

''تائی اماں۔۔۔ تائی اماں! آپ نے دیکھا، یہ کیا کرنے چلی تھی، دیکھ رہی ہیں آپ یہ، یہ۔'' الفاظ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

سیاہ چادر میں چھپا وجود، پاؤں کے پاس گرا ہوا چھوٹا سا بیگ، وہ بھلا کیا پوچھتیں، سب کچھ تو صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''سویرا۔۔۔!'' ان کے لہجے میں ایسی بے یقینی تھی کہ سویرا ندامت کے مارے زمین میں گڑ گئی تھی۔

''یہ کیا کرنے چلی تھی سویرا تجھے ہمارا خیال نہیں آیا۔'' وہ گہرے صدمے کے زیر اثر تھیں۔

''اگر کچھ ہو جاتا۔'' کا روح فرسا خیال ان کے دھڑکتے دل کو ساکت کر رہا تھا۔ سویرا ایک قدم آگے بڑھی تھی اور ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لڑکھڑا کر تائی اماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ تائی اماں کے بے جان ہوتے ہوئے بوڑھے بازو ان کے پہلو میں لٹک رہے تھے۔

''مت کرو یہ مکر و فریب۔'' نوروز نے وحشت کے عالم میں اسے بازو سے کھینچ کر تائی اماں سے علیحدہ کر دیا تھا۔

''تمہارا یہ فعل اتنا گھٹیا اتنا نیچ ہے کہ تم سے کوئی ہمدردی نہیں کی جا سکتی۔'' وہ مٹھیاں بھینچ کر

دھاڑا تھا۔ سویرا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ تائی اماں پہ نظریں جمائے کھڑی تھی۔

''میرا دل چاہ رہا ہے، میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہیں اس زمین میں دفن کر دوں۔''
غم کی شدت نوروز کو ہوش وحواس سے بے گانہ کیے جا رہی تھی۔

''نوروز! آہستہ بولو خدارا اپنی آواز اونچی مت کرو۔'' تائی اماں کی آواز ان کے حلق میں گھٹی جا رہی تھی۔

''تم ادھر آؤ۔ چلو میرے ساتھ۔'' تائی اماں کو اس صورتِ حال سے نبٹنا تھا۔ انہوں نے سویرا کو کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا مگر نوروز درمیان میں آ گیا۔

''نہیں تائی اماں! یہ اس طرح دوبارہ۔''

''نوروز! تم اس وقت خاموش رہو۔'' انہوں نے ڈپٹ کر کہا اور سویرا کو کھینچتی تقریباً بھاگتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھیں۔

''اس نے ہم سب کا اعتماد توڑا ہے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے پیچھے تھا۔ سسکتی ہوئی نیم جان سی سویرا خود بخود تائی اماں کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔

''نوروز! چپ ہو جاؤ۔'' تائی اماں کی لہجہ التجائیہ تھا۔ وہ اسے لیے سیدھا اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔ دھاڑ سے دروازہ کھولتا ہوا نوروز بھی وہیں پہنچ گیا تھا۔

''اسے اپنی اس حرکت کا جواب دینا ہو گا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں، اس سے کہ۔۔۔''

''لیکن میں آپ کو کچھ بھی پوچھنے کا حق نہیں دیتی۔'' روتی ہوئی سویرا ایک دم چیخ اٹھی تھی۔

''کون ہوتے ہیں آپ میرے؟ کیا لگتے ہیں؟ کیوں جواب دوں میں آپ کو؟ کس ناتے سے آپ مجھ سے یہ سوال جواب کر رہے ہیں؟ یہ سامنے کھڑی ہیں آپ کے جنہوں نے مجھے ماں بن کر پالا ہے۔ یہ سوال کریں گی تو میں جواب دوں گی۔ یہ سزا سنائیں گی تو میں سن لوں گی۔ یہ ماریں گی تو میں سہہ لوں گی۔ میں اس گھر کے ایک ایک فرد کے سامنے جواب دہ ہو سکتی ہوں مگر آپ کے سامنے نہیں۔ صرف آپ کے سامنے نہیں۔ آپ اپنا ہر حق کھو چکے ہیں۔ ہر مقام پر مجھے مایوس کر کے۔۔۔''
سویرا پھٹ پڑی تھی۔ نوروز دم بخود کھڑا تھا اور تائی اماں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''خدا نے تمہاری عزت بچا لی ہے، اس کا کچھ خیال کرو۔ یوں اپنے ہاتھوں اپنا تماشا مت بنواؤ۔ سارا گھر نشے کی پڑیا کھا کر نہیں سو رہا۔ کوئی آ گیا تو تمہیں منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملے گی۔''
وہ گھٹنوں میں منہ دے کر سسکنے لگی، تب وہ نوروز کی طرف پلٹیں جو کسی بت کی طرح کمرے کے وسط میں ایستادہ تھا۔

''نوروز بیٹا تم جاؤ اپنے کمرے میں۔'' اس کا بازو تھام کر انہوں نے بہت نرمی سے کہا۔ وہ گم صم سا دھندلائی آنکھوں سے انہیں دیکھے گیا۔

''نوروز بیٹا! میری جان، اتنے پریشان مت ہو۔ کچھ نہیں ہوا۔'' وہ اس کا چہرہ تھام کر اسے تسلی دینے لگیں تب اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں۔

ایک تنہا آنسو اس کی پلکوں پر آ کر ٹھہر گیا تھا تائی اماں نے اس کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ اترتے دیکھی تو گھبرا سی گئیں۔

''نوروز!'' انہوں نے پکارا تھا اور نوروز بھربھری مٹی کی طرح زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اپنی بہت سختی سے بھنچی ہوئی مٹھیوں پر سر گرائے وہ بہت اذیت میں لگ رہا تھا۔ تائی اماں نے بے قرار سا ہو کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور وہ ان کی دونوں کلائیاں پکڑے کسی نوعمر بچے کی طرح ٹوٹ کر رو دیا تھا۔

تائی اماں کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس طرح تو وہ اپنے ماں باپ کی موت پر بھی روتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسے اپنے سینے میں بھینچتے ہوئے تائی اماں کے لیے اپنی سسکیوں کو روکنا محال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''تایا ابا کے کمرے میں میٹنگ چل رہی ہے، سمجھ میں نہیں آتا معاملہ کیا ہے؟ ایسی رازداری اس سے پہلے کبھی نہیں برتی گئی۔۔۔'' اظفر کے پیٹ میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔

''میٹنگ کے شرکاء کے نام بیان کیے جائیں، تا کہ معاملے کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔'' سدرہ بھی کھوجنے لگی۔

''تایا ابا، تائی اماں، ارسل بھائی اور چھوٹی چچی۔۔۔''

''ہائیں بڑی چچی اور وہ خاندان کے سب سے عقل مند ذہین وفطین شیری بھیا۔'' مہران نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ دونوں تو خیر بازار گئے ہوئے ہیں، تشویش کی بات تو یہ ہے کہ اس میٹنگ میں نیلو بھابھی کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔'' اظفر کی اطلاع پر نیلو بھابھی کا منہ بن گیا تھا۔

''چھوٹی عمر کی شادی کی یہی تو مصیبت ہے، بندے کا عہدہ بڑا ہو جاتا ہے لیکن شمار نا سمجھ لوگوں میں ہی ہوتا ہے۔''

''تو گویا آپ در پردہ ہمیں نا سمجھ قرار دے رہی ہیں۔'' انیقہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''در پردہ کیوں؟ وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہی ہیں۔'' مہران نے پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی۔

''اوفوہ دفع کرو اس بات کو، میں کھوج لگا کر آتا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟'' اظفر اٹھا تو معیز بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ باقی سب لوگ شدت سے اس کا انتظار کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد معیز اڑی اڑی رنگت کے ساتھ مدد، مدد پکارتا بھاگا چلا آیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' شہلا نے عجلت میں پوچھا۔

''اظفر، اظفر، پھنس گیا۔''

''اوہ نو! کیا تایا ابو نے دیکھ لیا؟'' رشنا نے خوف سے آنکھیں پھیلائیں۔

''نہیں، وہ باتیں سننے کے لیے روشن دان سے اندر جھانک رہے تھے اسی دوران میٹنگ

برخاست ہوگئی اور وہ باہر نکلنے کی کوشش میں پھنس کر رہ گئے۔'' اس اندوہناک خبر پر وہ سب ہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور جب بمشکل اسے کھینچ کھانچ کر واپس لاؤنج میں لانے میں کامیاب ہوئے تب چھوٹی چچی ہنستی مسکراتی چلی آئیں۔

''مبارک ہو بھئی سب کو۔''

''یہ کون سا موقع ہے مبارک باد دینے کا؟'' اظفر اپنی گردن سہلا رہا تھا۔

''ارے یہ ہی تو موقع ہے مبارک باد کا خصوصاً تمہارے لیے۔''

''ہائیں! کیا مطلب؟''

''بھئی ایک خوش خبری ہے تم سب لوگوں کے لیے۔'' چچی ان کا تجسس بھڑکا رہی تھیں۔

''جلدی سنائیں نا۔''

''نوروز کی شادی کے ساتھ ایک اور شادی طے پا گئی ہے۔''

''کیا؟ کس کی؟'' اس کی حیرت دیکھنے لائق تھی۔

''اظفر اور سویرا کی۔''

''ہاں۔۔۔'' سب ایک ساتھ اظفر کی طرف پلٹے جو ''نہیں'' کی آواز لگا کر صوفے پر لڑھک گیا تھا۔

''تین دن میں ایک اور شادی کی تیاری۔۔۔ کیسے ہوگا یہ سب؟'' سدرہ اور انیقہ چلا اٹھیں۔ شہلا اور رشنا، سویرا کے کمرے کی طرف بھاگی تھیں۔ مہران اور معیز اظفر کو اٹھائے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے چند روز سب کے لیے بے حد پریشانی میں گزرے تھے۔ نوجوان پارٹی ایک ساتھ دو شادیوں کی تیاری میں بے حال ہوگئی تھی بزرگ خواتین نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے سوال کرتیں۔

''ہم نے ٹھیک کیا نا؟''

سویرا اپنے کمرے تک محدود ہوگئی تھی۔ تائی اماں غیر محسوس انداز میں چوبیس گھنٹے اس کے آس پاس منڈلاتی رہتیں۔ نوروز کے کمرے کا دروازہ ان تین دنوں میں بس کبھی کبھار ہی کھلا تھا۔

جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا گیا، توں توں اس کے چہرے پہ تفکرات کے سائے مزید گہرے ہوتے گئے تھے۔ اس دن کے واقعہ کے بعد تائی اماں نے اسے ایک بار بھی بولتے نہیں سنا تھا، بس ایک گہری چپ تھی جس نے اس کے ہونٹوں پہ مہر لگا دی تھی، سب لوگ اسے چھیڑ چھیڑ کر اظفر کی مثال دیتے رہے جو اپنی شادی پر خود ہی دھمال ڈالتا پھر رہا تھا۔

''ارے ہم نے تو بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔'' وہ شیری بھیا کو چھیڑ رہا تھا جو عمر میں اس سے بڑے تھے مگر کنوارے رہ گئے تھے۔

نوروز کی رسمِ مہندی کے بعد سویرا کا نکاح اظفر سے پڑھوا دیا گیا تھا وہ نچلے کمرے سے رخصت

ہو کر اوپر والے پورشن میں اظفر کے سجے سجائے کمرے میں آبیٹھی اور اس رات اس نے اظفر کا نیا ہی روپ دیکھا تھا۔ وہ بہت بولڈ اور پراعتماد تھا۔ وہ جانتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بے حد رومانٹک بھی ہوسکتا ہے، اس کی استحقاق بھری شرارتوں اور معنی خیز جملوں نے ایک رات ہی میں اس کی ساری اداسی کو گھبراہٹ اور شرم میں بدل دیا تھا، اگلے روز نایاب بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔

نوروز اپنی ٹینشن میں اس سے ڈھنگ سے بات بھی نہ کرسکا، رونمائی کے کنگن اس کی کلائیوں میں پہنا کر جو بیڈ پر گرا تو صبح تک اپنا ہوش بھی نہ تھا، سدرہ ناشتا لے کر کمرے میں آئی تو وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ گھر بھر اس کے گرد جمع ہوگیا تھا، تائی اماں اس کا سر اپنی گود میں رکھے آیتیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ سویرا اپنے آپ میں چور بنی بارہا اس کے کمرے میں گئی اور دور سے ہی دیکھ کر واپس آگئی۔ نایاب گھبرائی گھبرائی سی پریشان بیٹھی تھی، اس کا دل بہلانے کو سدرہ اسے اپنے ساتھ لے کر باہر آگئی اور اس کی جھجک ختم کرنے کو سب کا تعارف کروانے لگی۔

''شہلا، مہران، رشنا اور معیز چھوٹے چچا کے بچے ہیں۔ چھوٹے چچا کی عارف والا میں کاٹن کی فیکٹری ہے۔ وہ زیادہ تر وہیں رہتے ہیں۔ چھوٹی چچی البتہ یہیں ہوتی ہیں۔''

پھر بڑے چچا اور بڑی چچی سے تعارف کروایا۔ وہ دونوں گاؤں میں ہوتے تھے اور ان کے بچے شیری بھیا اور انیقہ سے وہ مل چکی تھی، باقی فیملی سے وہ پہلے سے متعارف تھی کہ بچپن میں یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سو اپنائیت اور خلوص کے اس مظاہرے کے بعد نایاب کو ان سے گھل مل جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

ٹھک کی آواز سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور گرد آلود ہوا کا پہلا ہی جھونکا مٹھی بھر خاک سارے کمرے میں بکھیر گیا تھا۔ نوروز نے کتاب سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ کھلی کھڑکی سے نظر آتا آسمان بے تحاشا گرد سے اٹا ہوا تھا اور ہوا زور پکڑتی جارہی تھی۔ اس نے لمحے بھر کے لیے بڑی امید سے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا مگر چند لمحوں تک کسی کی آمد نہ ہوئی تو مجبوراً اسے خود ہی بیڈ سے اترنا پڑا تھا۔ دو تین ہفتے بدن سے چپکا رہنے والا بخار اچھی خاصی نقاہت سے نواز کر ہی واپس گیا تھا۔ ورنہ وہ اتنا سست ہرگز نہیں تھا۔ کھڑکی تک پہنچتے پہنچتے کمرے کے فرنیچر اور قالین پر گرد کی ہلکی سی تہ جم گئی تھی۔

کھڑکی بند کرنے سے قبل دونوں ہاتھ چوکھٹ پر جما کر اس نے گردن باہر نکال کر ذرا کی ذرا نیچے جھانکا جہاں ایک شور ہنگامہ مچا ہوا تھا، تائی اماں چیخ چیخ کر سست الوجود لڑکیوں کو باہر نکلنے کے لیے کہہ رہی تھیں کیونکہ شام کی چائے کے برتن ابھی تک عقبی لان میں دھرے تھے۔ نیلو بھابھی سارے لان میں بھاگ بھاگ کر اپنے بچوں کے یہاں وہاں بکھرے کھلونے جمع کررہی تھیں، رشنا اور شہلا ہوا میں رنگ برنگے دوپٹے لہرا کر نجانے کون سا کھیل کھیل رہی تھیں۔ سدرہ اور انیقہ الگنی سے کپڑے اتارنے کے لیے اوپر بھاگی چلی آرہی تھیں۔

''اف یہ آندھی بھی کس قدر اچانک۔'' جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے ٹکراتے درختوں کو دیکھتے ہوئے وہ انیقہ کی آدھی بات ہی سن پایا تھا۔

''گویا آندھی کو بھی ہارن بجاتے ہوئے ''بختیار ہاؤس'' میں داخل ہونا چاہیے۔''

اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھائی اور پردہ کھینچ کر برابر کر دیا کہ آندھی اب شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اور اسے اس لڑکی کا پورا خیال تھا جو بڑی محنت اور لگن سے ہر روز اس کمرے کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا کرتی تھی۔ اس نے باقی کھڑکیاں چیک کرنے کے بعد کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر گرل پہ جھک کر نیچے جھانکنے لگا۔ گھر کے زیادہ تر افراد اس وقت مزے سے لاؤنج میں براجمان تھے۔ ٹی وی فل والیوم میں چل رہا تھا لیکن خبرنامے کے باعث تایا ابا کے سوا کوئی بھی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

تائی اماں اور چھوٹی چچی سر جوڑے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ارسلان بھائی فائلیں سامنے رکھے کافی مصروف نظر آ رہے تھے۔ شیری بھائی اور اظفر کی اپنی میٹنگ چل رہی تھی۔ لڑکیاں غالباً سب کی سب کچن میں مصروف تھیں۔ باہر چیختی چنگھاڑتی ہوا کی وحشت کا یہاں شائبہ تک نہ تھا۔ گھر کی تعمیر ہی کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ سامنے والے برآمدے میں کھلنے والا لالکڑی کا مضبوط منقش دروازہ اور پچھلے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا تو بیرونی ماحول اندرونی ماحول پر بالکل بھی اثر انداز نہ ہوتا تھا اوپر تلے بنے ہوئے کمروں کی دو قطاریں آمنے سامنے تھیں اور درمیان میں جو وسیع جگہ بچی تھی اسے ٹی وی لاؤنج کی شکل دے دی گئی تھی۔ چھت پورے گھر پہ ایک ہی ڈالی گئی تھی سو اوپر کے کمرے سے نیچے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

وہ چند لمحے وہاں کھڑا رہنے کے بعد کمرے میں واپس چلا آیا تھا۔ بیڈ پر بیٹھنے سے قبل اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا جہاں گھپ اندھیرا تھا اور آندھی زوروں پر، وہ پنکھے کی رفتار تیز کرتا ہوا بیڈ پہ آ گیا اور ابھی ورق گردانی کرتے ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے جب کمرا ایک دم اندھیرے سے بھر گیا روشنی بجھ گئی تھی اور اس کے پاس سوائے طویل سانس لینے کے اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ کتاب ایک طرف رکھ کے وہ چپ چاپ بند ہوتے پنکھے کی سرسراہٹوں کو سننے لگا۔ جو تاریکی کی اوٹ میں چھپی خاموشی کو کاٹتی جا رہی تھیں۔ باہر ہوائیں مزید زور آور ہو گئی تھیں اور جیسے کھڑکیوں کے پٹ توڑ دینے کو بے تاب سی ہو رہی تھیں۔

تب ہی دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا تھا۔ کینڈل اسٹینڈ میں موم شمعیں روشن کیے آنے والی شہلا تھی۔

''نوروز بھائی! نیچے آئیے نا، یہاں اکیلے کیوں پڑے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ کہیں پھر سے بخار وخار تو نہیں ہو گیا؟''

وہ ایک تواتر سے بولتی کینڈل اسٹینڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھنے لگی۔

''اللہ کچھ تو بولیے نوروز بھائی! قسم سے اتنے اندھیرے میں تو مجھے ہر چیز جن بھوت یا چڑیل ہی نظر آتی ہے۔'' شہلا کے لیے ایک لمحے کی خاموشی ناقابل برداشت تھی۔

''کھانا تیار ہو گیا کیا۔۔۔؟''

''ہائیں، آپ کو ابھی سے بھوک لگنے لگی۔۔۔؟''

اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔ بھوک تو نہیں لگ رہی۔ وہ تو تم نے بولنے کو کہا تھا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا۔''

اس کے قدرے معصومانہ انداز پر وہ بے اختیار ہنس دی۔ پھر دروازہ کھول کر باہر نکلتے نکلتے پلٹی۔

''اگر آپ اکیلے بور ہو رہے ہیں تو میں نایاب کو بھجوا دوں۔۔۔؟'' اس کے لہجے میں چھپی شرارت کو محسوس کر کے نوروز نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا کمرے میں کافی حبس ہو گیا تھا۔ وہ ابھی اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا جب نایاب آ گئی۔

''کھانا لے آؤں؟''

''نہیں، لائیٹ آ جائے پھر کھا لوں گا۔'' اس کے نفی میں سر ہلانے پر وہ کھڑکیاں کھولنے کے بعد ٹیرس کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولنے لگی تھی۔ کھڑکیاں کھلنے سے کمرے میں موجود حبس تیزی سے ختم ہونے لگا تھا۔ ہوا کا زور دم توڑ چکا تھا اور اب ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بہت خوشگوار معلوم ہو رہے تھے۔

اس نے دیکھا، نایاب ٹیرس پہ نکل گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ فضا میں خشک مٹی کی مہک ابھی بھی محسوس ہو رہی تھی اس نے ٹیرس سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی جہاں اس وقت نوجوان پارٹی نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ ان سب کے درمیان گانوں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ شہلا اور انیقہ پھر بھی قدرے سُر میں تھیں لیکن اظفر، معیز اور مہران ایسی بھونڈی آواز میں گا رہے تھے کہ اس کے لیے مسکراہٹ روکنا دشوار ہو رہا تھا۔

''ارے خدا کا واسطہ ہے گدھو! اپنی ڈھیچوں ڈھیچوں کا والیم تھوڑا کم کرو۔ جس روز بھی لائیٹ بند ہوتی ہے اور تم لوگ یہ خوفناک مقابلہ منعقد کرتے ہو، اس روز صبح دفتر جاتے ہوئے مجھے محلے بھر کی شکاتیں سننا پڑتی ہیں۔''

اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر ان پہ پھٹ پڑنے والے یہ شیری بھیا تھے۔

شکوہ نہ کر گلہ نہ کر
لائیٹ بند ہے پیارے
ہم گرمی کے مارے
گاتے رہیں گے
شکوہ نہ کر۔۔۔

وہ آفت کے پرکالے کسی کو خاطر میں لانے والے نہ تھے۔

''مروتم سب۔'' ان کی پھٹی ہوئی آوازوں کے جواب میں دھاڑ سے کھڑکی بند ہوئی تھی۔

تیرے ساتھ ہی جئیں گے
تیرے ساتھ ہی مریں گے

وہ ایک بار پھر کورس میں گانے لگے تھے۔ نوروز ان کی شرارت پر مسکراتا ہوا نایاب کی طرف

پلٹا تو اسے پہلے سے اپنی طرف متوجہ پا کر ٹھٹک سا گیا۔ چند ثانیے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کی اس حرکت سے کچھ سمجھ نہ پایا تو گردن موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگا تھا۔

''نوروز! آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' وہ کچھ دیر بعد گویا ہوئی تھی۔

''آپ ان سب لوگوں کے ساتھ گھل مل کر کیوں نہیں رہتے؟''

وہ اس کی بات پر قدرے چونک سا گیا تھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے قطعی لہجے میں اس کی بات کی نفی کر دی۔

''لیکن میں نے تو محسوس کیا ہے۔ آپ ان سب کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہوتے۔ بہت الگ تھلگ محسوس ہوتے ہیں، سویرا ہے تو وہ آپ سے بات کرنے کو ترستی نظر آتی ہے۔ تائی اماں ہیں تو ان کی بے قرار نظریں آپ کے چہرے پر نجانے کیا کھوجتی رہتی ہیں، آپ تایا ابا کی بات کو ہوں، ہاں میں ٹالتے رہتے ہیں تو اس لمحے وہ بہت افسردہ سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ میں جانتی ہوں، آپ بہت کم گو انسان ہیں، بہت ریزرو رہتے ہیں لیکن اگر صرف یہ ہی بات ہے تو ان سب لوگوں کو اب تک اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اتنے بے چین سے کیوں نظر آتے ہیں؟''

وہ اپنی الجھن بیان کرنے کے بعد اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی تھی مگر وہ جوں کا توں رخ موڑے کھڑا رہا۔

''نوروز!'' نایاب نے آہستگی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے، کھانے کو کچھ لے آؤ۔'' وہ بس اتنا کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا اور نایاب کچھ دیر تک اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائی تھی۔ چونکی تو اس وقت جب تایا ابا کی گرج دار آواز کے ساتھ نیچے مکمل خاموشی چھا گئی، وہ سستی سے قدم اٹھاتی آگے بڑھی۔ ایک نظر شمع دان کے قریب بیٹھے نوروز پر ڈالی اور پھر نیچے چلی آئی، جہاں سب لوگ ''ربا میرے ربا'' اور اظفر ''ابا میرے ابا'' گنگناتے ہوئے پناہ گاہ تلاش کر رہا تھا۔

''میراثیوں کا گھر سمجھ رکھا ہے، بدبختوں نے، کوئی ادھر سے سُر لگا رہا ہے تو کوئی اُدھر سے تان اٹھا رہا ہے اللہ کا نام کبھی بھولے سے بھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔'' تایا ابا بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔

''مقابلے میں شامل افراد نوٹ فرمالیں، کل سے مقابلہ نعتوں کا ہوا کرے گا۔'' مہران نے سرگوشی کی جبکہ سدرہ سارے گھر میں اعلان کرتی پھر رہی تھی۔

''کل پچھلے لان میں میلاد منعقد کیا جائے گا، حاضرین سے شرکت کی درخواست ہے۔''

''تبرک کے طور پر کیا ملے گا۔'' انیقہ سدا کی چٹوری تھی۔

''بوندی۔۔۔ نہیں بدانہ۔۔۔ آں بوندا باندی۔'' سدرہ کے لیے انتخاب دشوار ہو رہا تھا اور ان ہی حرکتوں سے ذرا دیر بعد وہ لوگ ایک بار پھر ہنسی ٹھٹھول میں مصروف ہو گئے تھے۔

وہ رات خاصی بے چینی سے کٹی تھی۔ بجلی نہ ہونے کے باعث کمروں میں گرمی اور حبس بڑھ گیا تھا۔ جس جس کا داؤ چلا وہ اسٹور روم سے چارپائی نکال کر لان میں جا پہنچا۔ مہران کو بھی یہ خیال سوجھا تھا مگر ذرا دیر سے۔ اس کے پہنچنے تک آخری چارپائی بھی بک ہو چکی تھی اور اتفاق سے وہ چارپائی

معیز کے ہاتھ لگی تھی اس کا ٹھاٹھ سے کھلی فضا میں سونا ان دونوں کو ہی گوارا نہ تھا سو آدھی رات کو وہ بھوت بن کر اسے ڈرانے کی کوشش کرتے رہے جو کہ قطعی طور پر ناکام ہو گئی تھی اس لیے کہ محترم معیز صاحب نے آیۃ الکرسی پر ایسا اندھا اعتقاد قائم کر رکھا تھا کہ اگر ان کی جگہ کوئی اصلی والے جن بھوت بھی آجاتے تو معیز انہیں ایک آدھ زوردار پھونک اور دو چار جھانپڑ رسید کرنے کے بعد کروٹ بدلتا اور آرام سے سو جاتا ہاں ایک ترکیب کی ناکامی کے بعد نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ ایک بندہ چارپائی اٹھائے آگے آگے اور دو عدد بندے تکیے اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے البتہ چارپائی اٹھانے والا بندہ ہر پھیرے میں بدل جاتا تھا اور صبح سویرے جاگنگ کے لیے اور نماز کے لیے اٹھنے والے افراد نے عجب منظر دیکھا تھا۔

لان کے بیچوں بیچ تین افراد سبز مسلی ہوئی گھاس پر محو خواب تھے اور ان کے نزدیک ایک عدد چارپائی اپنی خستہ حالت کے ساتھ بالکل خالی پڑی تھی۔

☆☆☆

نوروز باتھ روم سے نہا کر نکلا تھا جب کسی نے عجلت میں دروازے پر دستک دی۔

''آجائیے۔'' نایاب گیلا تولیہ ٹیرس پر پھیلا رہی تھی۔ وہیں سے آواز لگائی تو ارسل بھائی کافی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''نوروز! یار تیری آف وہائٹ شرٹ کہاں ہے؟ اس بجلی نے تو سارا کام خراب کر دیا۔ پینٹ تو استری شدہ مل گئی ہے مگر شرٹ۔'' انہیں آفس سے دیر ہو رہی تھی۔

''یہیں وارڈ روب میں ہو گی ارسل بھائی! دیکھ لیجیے۔'' نوروز نے بال بناتے ہوئے کہا تو وہ فوراً وارڈ روب کھول کر کھڑے ہو گئے۔

''واہ بھائی! بڑے ٹھاٹھ ہیں۔'' انہوں نے ہینگ کیے ہوئے استری شدہ کپڑے دیکھ کر ستائش بھرے لہجے میں کہا۔

''ابھی بچوں کا جھنجھٹ نہیں ہے۔ اسی لیے اتنے مزے میں ہو۔ ذرا ہمارے کمرے میں جھانک کر دیکھو، ڈریسنگ ٹیبل ادویات اور سیرپ سے بھر رہی ہے۔ بیڈ پر بچوں کی کاپیاں، کتابیں اور بچوں کی کاٹ میں ہماری آفس فائلز، جتنے قدم اٹھاؤ، اتنی ٹھوکریں کھاؤ، بچوں کے کھلونے بکھرے ہوئے ہیں نا۔''

انہوں نے حیران کھڑی نایاب کی آنکھوں میں جھانکا اور شرٹ ہاتھ میں لیے یہ جا وہ جا، وہ یونہی ہونق بنی نوروز کی طرف پلٹی۔

''اب اتنا برا حال بھی نہیں، میں خود کئی بار گئی ہوں بھابھی کے کمرے میں۔''

''وہ مذاق کر رہے تھے۔'' اس نے جیسے اطلاع دی تھی تو وہ خفیف سی شرمندگی کے ساتھ اس سے ناشتے کے متعلق پوچھنے لگی اور ابھی باہر جانے کو پلٹی ہی تھی جب دھاڑ سے دروازہ کھلا اور اندر داخل ہوتا مہران ٹھٹک کر رک گیا۔

''اوہ سوری نیا بھابھی! میں بھول ہی گیا کہ آپ بھی۔'' اسے سامنے دیکھ کر وہ سرخ ہو گیا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکراہٹ دبائی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''نوروز بھیا! وہ کوئی استری کی ہوئی شرٹ مل جائے گی۔۔۔۔'' وہ کان کھجاتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور نوروز کے پاس اس کی مسکین سی شکل دیکھ کر اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وارڈ روب کھول کر اس کے سامنے رکھ دے۔

نایاب ناشتا لے کر آئی تو اس کے پیچھے پیچھے تایا ابا بھی چلے آئے۔

''ہوں! ناشتا کیا جا رہا ہے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔'' نوروز نے ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے مختصراً کہا تھا۔

''آپ بھی آیئے نا تایا ابا'' نایاب نے جھٹ کرسی اٹھا کر بیڈ کے سامنے رکھی اور خود جلدی سے پیالی میں دلیہ نکالنے لگی کہ تایا ابا کو ناشتے میں دلیہ بے حد پسند تھا۔

''ارے بس بس بھئی، میں تھوڑا ہی لوں گا'' انہوں نے اسے روک دیا اور پہلا چمچہ منہ میں ڈال کر تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔

''بہت لذیذ ہے بلکہ اس نے تو مجھے میرے بچپن کی یاد دلا دی ہے۔ پتا ہے ہماری بے بے اکثر ناشتے میں دلیہ ہی بنا کر دیا کرتی تھیں۔ اس وقت فریج، فریزر کا تو عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سو ہماری بے بے رات کو ہی دلیہ بنا کر مٹی کی کٹوریوں میں بھر دیا کرتی تھیں۔ صبح سویرے ہم لوگ کھڑاؤں پہنے مسجد سے بھاگے بھاگے آتے تو وہ کٹوریاں سامنے رکھے ہماری منتظر ہوتی تھیں۔ ہم اپنی انگلیوں سے ہی کھانا شروع ہو جاتے۔ ہمیں بے تابی سے کھاتا دیکھ کر وہ مسکراتی رہتیں اور ہم کھا پی کر دوبارہ بھاگ کھڑے ہوتے۔ کبھی بے بے سے پلٹ کر یہ بھی نہیں کہا کہ بے بے! تم دلیہ بہت اچھا بناتی ہو، اس میں سے تمہاری محبت کی خوشبو آتی ہے اور اگر ہم کہہ دیا کرتے تو وہ نجانے کتنی خوش ہوتیں۔''

تایا ابا کسی سوچ کی افسردگی میں کھو گئے تھے، نایاب نے دیکھا، نوروز بالکل خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا، یوں جیسے اس وقت اس سے زیادہ ضروری کام اور کوئی نہیں۔

''بعض اوقات ہم لوگ اپنے لفظوں کو صحیح وقت پر اور طریقے سے استعمال نہیں کر پاتے اور یہ ہی چیز بعد میں ہمارے لیے پچھتاوا بن جاتی ہے۔'' تایا ابا جیسے خود سے کہہ رہے تھے۔

☆☆☆

''نوروز! بچے! کیا تم اس شادی پر خوش ہو؟'' خالہ نصرت نے پوچھا تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر شہتوت کے درخت سے جھولتی چڑیوں کو دیکھنے لگا تھا۔ آج طبیعت ذرا سنبھلی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر چلا آیا۔

''ذرا دیکھو تو کیسا کملایا ہوا ہے تمہارا چہرہ، جن کے دل خوش ہوں ان کے چہرے سے نظر آ جاتا ہے۔ وہ دیکھا نہیں اظفر کو۔ خوشی کیسے پھوٹ رہی تھی اس کے چہرے سے اور میں تو کہتی ہوں اس

سویرا بجی پر بھی ظلم ہی ہوا ہے۔ خاندان میں بہتیرے نوجوان تھے۔ کاروبار کرنے والے روزگار سے وابستہ لیکن اس کو باندھ دیا اس نکھٹو کے پلے جسے ہر وقت ہنسی ٹھٹھول کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ اب دیکھو ذرا شادی کے فوراً بعد سیر سپاٹا کر کے واپس بھی آ گیا، اے نوروز! تمہاری شادی بھی تو اس کے ساتھ ہی ہوئی ہے۔ تم لوگ کہیں گھومنے نہیں گئے؟'' خالہ نصرت اسے کرید رہی تھیں۔

''خالہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ نیا نے بھی اصرار نہیں کیا تو پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔''

''نیا۔۔۔؟''

''نایاب کی بات کر رہا ہوں گھر میں سب لوگ اسے نیا ہی کہتے ہیں۔'' اس نے جیسے جھنجلا کر وضاحت کی تھی۔ پھر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اس کا وہاں بھی دل نہ لگا تو وہ چلا آیا صائمہ گھر پہ نہ تھی سو اس کا مزید ٹھہرنا ممکن بھی نہ تھا۔

☆☆☆

گرمی زوروں پر تھی، ہوا بالکل بند اور کمرے حبس زدہ۔ سدرہ کا تو جیسے سانس ہی گھٹنے لگا تھا۔ جونہی ذرا سورج ڈھلا، وہ عقبی لان میں چلی آئی۔ واٹر پمپ سے پائپ لگا کر اس نے پہلے یونہی کیاریوں میں پانی بھرا پھر ٹھنڈے ٹھار پانی سے ہاتھ منہ اور پاؤں دھونے کے بعد کملائے ہوئے درختوں، پودوں پر پانی بہانے لگی تب ہی گرمی سے بے زار انیقہ وہاں چلی آئی۔

''سدرہ پلیز! تھوڑی نظر کرم ہم پر بھی۔'' وہ تخت پر گرتے ہوئے پکاری تو سدرہ نے فوراً پائپ کا رخ اس کی طرف موڑ دیا تھا۔

''ارے، ارے نہیں۔ میں ابھی کپڑے بدل کر آئی ہوں۔'' اس نے بری طرح چیختے ہوئے کہا تو سدرہ نے ہنستے ہوئے برآمدے کے فرش پر پانی بہانا شروع کر دیا تھا۔ انیقہ نے چھت پر لگا پنکھا فل اسپیڈ میں چلا دیا تھا۔ ذرا دیر بعد قدرے ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تھا۔ انیقہ وہیں تخت پر لیٹ کر کسی ڈائجسٹ میں محو ہو گئی۔ سدرہ گرد سے اٹے درختوں پر خوب پانی برسا کر انہیں نکھارنے لگی۔ ارسل بھائی کا ٹیپو بھی نیلوفر بھابھی سے آنکھ بچا کر وہیں چلا آیا تھا اور جامن کے درخت پر لٹکتے ٹائیں، ٹائیں کرتے توتوں کو پکڑنے کی سعی کرنے لگا تھا اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر سبز گھاس پر گری جامنیں اکٹھی کرنے لگا۔ سدرہ اسے بار بار شرٹ سے ہاتھ صاف کرنے پر ٹوک رہی تھی جس پر جامن کے رنگ کا جابجا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''تم لوگ ادھر ہو میں تمہیں سارے گھر میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔''

رشنا اپنے مٹھو سمیت وہاں آ گئی تھی، گرمی اور پیاس کی شدت سے بے حال چڑیاں اپنی چونچیں کھولے ہانپ رہی تھیں۔ کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر وہ درخت کی شاخوں میں پھنسا پانی کا کٹورا ہی نکالنے لگی تھی جو اس وقت بالکل خشک ہو رہا تھا۔

''نیا کتنی اچھی ہے ناں، اتنے تھوڑے سے دنوں میں ہم سے اس طرح گھل مل گئی جیسے برسوں سے یہیں رہتی آئی ہو۔'' کیاری سے خشک پتے نکال کر باہر پھینکتے ہوئے سدرہ نے کہا تو رشنا اس کی

ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے نل کے پاس جا کر کٹورا دھونے لگی۔

''توبہ ہے۔ یہ رائٹرز بھی کتنا جھوٹ لکھتی ہیں۔'' گھنٹے بھر سے رسالے میں محو انیقہ نے سر اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔

''کیا مطلب۔۔۔؟'' پانی سے لبالب کٹورا دوبارہ شاخوں میں پھنساتے ہوئے پلٹ کر اس نے حیرت سے انیقہ کو دیکھا جو خاصی اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''ہاں نا، اب دیکھو یہ محترمہ راحت جبیں صاحبہ۔ ان کی ہر کہانی میں ساون بھی ایسے منایا جاتا ہے جیسے عید، بقرعید، جھولے ڈالے جاتے ہیں، ست رنگے دوپٹے رنگوائے جاتے ہیں اور تو اور ساون کے گیت بھی گائے جاتے ہیں۔''

''تو اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے۔ بعض زندہ دل لوگ ساون کی خوشی میں ایسا چھوٹا موٹا اہتمام کر ہی لیتے ہیں۔''

''کہاں کرتے ہیں بھئی، اتنے سال ہو گئے۔ ساون آتا ہے، جاتا ہے۔ کبھی آس پڑوس میں ایسا اہتمام ہوتے میں نے تو نہیں دیکھا زیادہ ہی ہوا تو بارش کی خوشی میں سدرہ کوئی ڈش بنا کر کھلا دیتی ہے اور بس۔'' وہ غالباً گرمی کی وجہ سے زیادہ ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔

''تو اس میں قصور کس کا ہوا؟ تم لوگوں کا۔۔۔؟'' یہ اچانک ٹپک پڑنے والا اظفر تھا۔

''نہ ہوئیں تم رائٹرز جیسی حساس اور رومینٹک ورنہ ساون اتنا روکھا پھیکا کبھی نہ گزرے۔''

''کیا مطلب۔۔۔؟'' انیقہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

''مطلب یہ کہ اگر تم لوگ بھی تھوڑی سی ہمت کر لو تو تمہارا ساون بھی ایسا ہی رنگین ہو جائے گا جیسا ان ناول، افسانوں میں۔''

''نہیں، ویسا ساون پھر بھی نہیں ہو سکتا۔'' انیقہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''وہ کیسے۔۔۔؟''

''وہ ایسے کہ ان کے ہر ناول میں ایک عدد ہیرو بھی موجود ہوتا ہے جو ساون کی پہلی بارش پر ہر حال میں ہیروئن کے گھر تک پہنچ جاتا ہے۔ درمیان میں خواہ کتنے ہی مسائل ہوں۔۔۔ ساون کی بارش اس اس کے لیے تمام راستے صاف کر دیتی ہے اب تم بتاؤ کہ باقی سب تو پورا ہو جائے گا مگر یہ ہیرو کہاں سے آئے گا۔''

''چچ، چچ۔۔۔ کاش میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں تمہاری یہ حسرت ضرور پوری کر دیتا۔'' اظفر نے اظہار افسوس کیا۔

''ویسے بائی داوے، یہ ہیرو کو کیسے معلوم ہوتا ہوگا کہ آج ساون کی پہلی بارش ہو گی۔'' رشنا ان کے قریب چلی آئی تھی۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ محکمہ موسمیات میں ملازم ہو۔'' یہ اندازہ سدرہ کا تھا۔

''افوہ، کن باتوں میں پڑ گئے تم لوگ۔ چلو ہم بھی اس دفعہ ساون منانے کا اہتمام کرتے ہیں۔'' انیقہ کا جوش و خروش پورے عروج پر تھا۔

''تو ٹھیک ہے۔ ذرا بتاؤ کہ تمہاری یہ رائٹر صاحبہ ساون کے لیے کن کن لوازمات پر زور دیتی

ہیں۔''

اظفر تیار ہوا بیٹھا تھا۔ انیقہ نے رسالے پر دوبارہ نظریں گاڑ دیں۔ رشنا بھاگ کر باقی پلٹن کو بلا لائی۔ اظفر اس مہم کا سربراہ اعلا بنا بیٹھا تھا اور ہر کسی کو اس کی استعداد کے مطابق کام سونپ رہا تھا۔ جھولا ڈالنے کا کام نیلو بھابھی کے سپرد تھا۔ ست رنگ دوپٹے رنگوانے کی ذمہ داری مہران نے بخوشی قبول کر لی تھی۔ سدرہ اور انیقہ نے پکوان تلنے تھے۔ بچوں کو جامنیں اکٹھی کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ معیز کو منڈی سے آم لے کر آنا تھا، نیا نے معصومیت کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جھولا لینے پر ہی اکتفا کر لے گی۔ سویرا نے ڈشز سے انصاف کر لینے کو ہی بہت سمجھا تھا اور سب سے اہم کام یعنی ساون کے گیت گانے کے لیے چھوٹی چچی کو چنا گیا تھا کہ ان کی آواز خاصی سریلی تھی۔

اور یہ تمام کام بانٹنے کے بعد انتظار تھا تو صرف ساون کی پہلی بارش کا۔ لڑکے ہر روز کسی جھگڑالو بزرگ پر رنگ دار پانی پھینکتے، خواتین چھت پر چڑھ کر دور دور تک بادلوں کی تلاش میں نظریں بھٹکاتیں اور پھر مایوس ہو کر پلٹ آتیں۔ بچے جامنوں کی ٹوکریاں بھرے بارش کی دعائیں مانگتے رہے۔ مگر بارش نے جی بھر کے سب کو مایوس کیا تھا لیکن پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جب ہانپتا ہوا معیز سب کے بند دروازوں پر ٹکریں مارتا پھر رہا تھا۔

''ارے وہ آ رہے ہیں۔۔۔ وہ آتے جا رہے ہیں۔۔۔ اب نکل بھی آؤ۔''

''کون آ رہے ہیں۔۔۔؟'' نیلوفر بھابھی آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلیں۔

''وہ کالے، کالے آ رہے ہیں۔''

''کون سنگھاڑے۔۔۔؟'' ان کے خیال میں صرف سنگھاڑے ہی کالے ہو سکتے تھے۔

''افوہ بھابھی! ساون کے بادل۔ اتنے سیاہ بالکل توے جیسے چیختے چنگھاڑتے ہاتھیوں کے غول کی طرح بڑھے ہی چلے آ رہے ہیں۔'' اتنا سننا تھا کہ بھابھی جھولا لے کر عقبی لان کی طرف بھاگ گئیں سارے گھر میں تھرتھلی سی مچ گئی۔

''جلدی ہاتھ ہلاؤ۔ بارش آنے سے پہلے تمام ڈشز تیار ہونی چاہئیں۔''

سدرہ اور انیقہ نے فیصلہ کیا تھا۔ معیز منڈی کی طرف بھاگ نکلا۔ بچے جامنوں کے درخت کے ساتھ لٹک گئے۔ زوردار ہوا نے ٹپاٹپ ایسی جامنیں گرائیں کہ ان کا سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ مہران ست رنگے دوپٹوں کا ڈھیر گود میں لیے سب کو آوازیں لگا رہا تھا۔

''ست رنگے دوپٹے لے لو۔ ست رنگے دوپٹے۔''

پھر کچھ وقت ہی لگا تھا، ادھر سدرہ نے ٹھک سے چولہا بند کیا ادھر نیا نے پہلا جھولا لیا اور بارش کی نوخیز بوندیں جلتی بلتی دھرتی کے پیاسے ہونٹوں کو چھو گئیں۔ بچے بارش میں نہانے کے لیے بے تاب ہوئے تو اظفر نے ان کی شرٹیں ہوا کے سپرد کیں اور خود جینز کے پائنچے چڑھا کر ان کے ساتھ بچہ ہی بن گیا۔ نیلو بھابھی نے جہازی سائز آموں کی قاشیں کاٹ کاٹ کر ڈشیں بھر دیں۔

مہران نے تخت برآمدے کے عین وسط میں کھینچ کر اردگرد کرسیاں لگا دی تھیں۔ نوجوان پارٹی کا فیصلہ تھا کہ پہلے بارش میں خوب نہائیں گے پھر سب مزے سے کھائیں گے۔ لہٰذا بزرگ خواتین و حضرات کو پہلے ہی فارغ کر دیا جائے۔ لہٰذا شہلا اور رشنا نے مل کر چکن رول، قیمہ پلاؤ، سموسے،

املی اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ تخت پر سجا دیے تھے۔ ساتھ انواع واقسام کے پھل تھے۔ چھوٹی چچی نے گھر میں لگے لیموں توڑ کر اسکنجبین کے جگ بھر دیے تھے۔

تائی اماں چائے کا فلاس بھر لائی تھیں۔ تایا ابا، ارسل بھائی اپنے کمروں سے باہر نکلے تو یہاں کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔

دھواں دھار برستی ہوئی بارش نے زمین سے آسمان تک پانی کی چادر سی تان دی تھی، مست جھومتی ہوئی ہوائیں۔ درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بے حال ہو رہے تھے۔ لڑکوں نے لان میں طوفان بدتمیزی مچایا ہوا تھا وہ بچوں کو یوں ایک دوسرے کی طرف اچھال رہے تھے جیسے ان میں ہوا بھری ہو، نیلو بھابھی زرد رنگت کے ساتھ انہیں کوسے جا رہی تھیں۔

سویرا برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ باقی سب لڑکیاں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی بارش کے اڑتے ہوئے چھینٹوں سے کھیل رہی تھیں۔ خوشیوں کے رنگ بہت نمایاں تھے۔ شیری بھیا کمرے میں بند نوروز کو بھی کھینچ کھانچ کر وہاں لے آئے تھے۔ وہ لوگ کھانے میں مشغول ہوئے تو نیا اور سدرہ بھاگ کر جھولے پہ آ گئیں۔ نیا نے جھولا سنبھالا اور سدرہ اسے ہواؤں کے حوالے کرنے لگی۔

اظفر کو نجانے کیا سوجھی تھی بھاگ کے آیا اور سدرہ کی جگہ لے لی، ایسے زور زور سے پینگیں دیں کہ جب پہلی مرتبہ نیا اوپر۔ بہت اوپر گئی تو اس کا سانس تک رک گیا تھا۔ دوسری مرتبہ ایک چیخ بلند ہوئی تھی۔ نیچے سدرہ اظفر سے الجھ رہی تھی اور پھر ان سب آوازوں کے درمیان ایک ایسی آواز ابھری تھی جو پورے ماحول پر حاوی ہو گئی تھی۔ اظفر نے ایک دم نیا کو تھام کر جھولا روک دیا تھا۔ وہ ہکا بکا سی برآمدے کی سمت دیکھے گئی جہاں کا منظر اس وقت کچھ اور ہی تھا۔

وہ نوروز تھا جو سب کے بیچ بیٹھا طیش کے عالم میں بول رہا تھا اور اگلے ایک لمحے میں اس نے جیسے بے قابو ہو کر اپنے ہاتھ کو حرکت دی تھی اور ان گنت برتن زمین پر گر کر لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ نیا غیر ارادی طور پر جھولے سے اتر کر بھاگتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔

''جو لڑکی کل تک میرے لیے قطعی نامناسب تھی، وہ آج آپ کے بیٹے کے لیے مناسب ہو گئی ہے۔ کل تک اسے اس گھر میں نہ لانے کی ہزار دلیلیں تھیں۔ سینکڑوں جواز تھے تو اب یہ دلیلیں، یہ جواز بے کار کیوں ہو گئے؟ میں نے ہمیشہ آپ کا کہا مانا ہمیشہ آپ نے جو پہنایا، میں نے پہنا جو کھلایا، میں نے کھایا۔ آپ نے اپنی پسند کی لڑکی سے میری شادی کر دی، میں نے بخوشی اسے قبول کر لیا تو آپ آج یہ فیصلہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ہی نا کہ مجھ میں لڑنے کی جرأت نہ تھی اور آپ نے میری اس بزدلی سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔''

تایا ابا کے سامنے بہت گستاخی سے بولتا ہوا نوروز اپنے آپ میں نہیں لگ رہا تھا۔ سویرا سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ چیخ اٹھی تھی۔

''نوروز بھائی! آپ بہت بدتمیزی کر رہے ہیں، مت بھولیے کہ یہ ہمارے محسن ہیں۔''

''ہاں، یہ ہمارے محسن ہیں، ان کے احسانات تلے میری گردن جھکی جا رہی ہے۔ یہ محسن ہیں جب ہی تو میں ان کے سامنے کبھی سر اٹھا سکا نہ زبان کھول سکا، میری ایک ایک سانس ان کی مقروض

ہے، ان کا یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے دو یتیم بچوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی محبتوں وشفقتوں میں ہمیں حصے دار بنایا۔ ہمیں پالا، پوسا، بڑا کیا اور سب سے بڑا احسان کہ تم جیسی لڑکی کو اپنی بہو بنایا۔ ہاں ان کے احسانات بہت ہیں میری عمر کے تمام سال ان کے احسان ہیں، مگر اب، اب یہ بوجھ اٹھانا بہت دشوار ہے۔ ان لوگوں نے میری بزدلی، میری کمزوری کو میرے ہی خلاف استعمال کیا ہے۔ انہوں نے میری زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کو بیک جنبش رد کر دیا۔ وہ فیصلہ جو زندگی میں، میں نے پہلی بار صرف اپنے لیے کیا تھا۔ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ میری ذات کو چٹکیوں میں مسل دیا اور آج اسی فیصلے پر اپنی پسند کی مہر لگا رہے ہیں مگر میری جگہ کوئی اور کھڑا ہے یہ ثابت کر دیا ہے انہوں نے کہ ماں باپ بننے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے بہت فرق۔'' وہ زہر خند لہجے میں کہتا ہوا پلٹا تھا پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ ہر فرد اپنی جگہ ساکت تھا۔

چھوٹی چچی کی نگاہوں نے گیٹ تک جاتے ہوئے نوروز کو دیکھا تو وہ فوراً اپنی جگہ سے آگے بڑھیں۔ نیا کو پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی گیٹ کی طرف لپکیں۔

''اس کے دماغ میں خناس سمایا ہوا ہے، نیا! تو اُس کے ساتھ جا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں کہاں۔۔۔؟ کسی لڑکے کو بھیجیں ان کے پیچھے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔

''ابھی وہ واپس نہیں آئے گا۔ تُو اس کے ساتھ جا، وہ جہاں بھی جاتا ہے۔ تو ساتھ ہو گی تو اسے لوٹ کر یہیں آنا پڑے گا۔''

چھوٹی چچی نے اسے زبردستی باہر نکالا۔ اس نے کونے سے مڑتے ہوئے نوروز کی جھلک دیکھی تو بے تحاشا بارش میں اس کے پیچھے بھاگتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''اے اچھا ہوا جو تم سیدھے یہاں چلے آئے۔ مگر بیٹا! بات کیا ہوئی۔۔۔؟''

کوئی تیسری مرتبہ خالہ نصرت نے پوچھا تو نیا کوفت زدہ سے انداز میں پہلے انہیں اور پھر نوروز کو دیکھنے لگی جو سارا راستہ اس پر برستا رہا تھا مگر یہاں آ کر لب سیے بیٹھا تھا۔ خالہ نصرت نے چند لمحے امید بھری نگاہیں اس کے چہرے پہ جمائے رکھیں اور پھر دوبارہ سے شروع ہو گئیں۔

''ارے اس طرح منہ بنائے کیوں بیٹھے ہو؟ شکر کرو اس خوامخواہ کی چاکری سے تمہاری جان چھوٹی اب حواس ٹھکانے آئیں گے، ان کے جب گھنٹہ گھنٹہ بھر بل جمع کروانے کے لیے قطاروں میں کھڑے ہونا پڑے گا۔ چار دن کے لیے تمہاری طرح گھن چکر بننا پڑے گا، تو آپوں آپ تمہاری طرف بھاگے چلے آئیں گے۔ غضب خدا کا ان لوگوں نے تو کبھی تمہیں انسان سمجھا ہی نہیں، تمہارے مال و دولت پر عیش کر رہے ہیں۔ اور تم ہی سب سے کنگال وہ ایک ماچس کی ڈبیا جتنا، فوٹو اسٹوڈیو کھول رکھا ہے، میں پوچھتی ہوں، کیا یہ ہی تمہاری اوقات تھی۔ خود ان کے اپنے بیٹوں کو دیکھو ذرا بڑے پر خوب رقم لگا کر باہر بھجوا دیا۔ عیش کر رہا ہے وہاں، اس سے چھوٹا ہے تو وہ یہاں نوٹ چھاپ

رہا ہے۔ اب تو سنا ہے وہ اظفر بھی کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا ہے، اور وہ جو تمہارے بڑے چچا کا بیٹا ہے وہ الگ اپنی فیکٹریاں کھولے راج کر رہا ہے۔ لے دے کر ایک تم ہی رہ گئے۔ کبھی پوچھتے تو سہی کے جائیداد میں سے جو تمہارے باوا کا حصہ بنتا ہے، وہ کہاں گیا؟ ارے میں تو کہتی ہوں عدالت میں جاؤ اپنا حصہ وصول کرو تمہارے بھی عیش ہو جائیں گے۔''

خالہ نصرت کو تواتر سے بولتے سن کر مارے حیرت کے نیا کا منہ کھل گیا تھا۔ ناگواری اس کے چہرے سے صاف واضح تھی اور اسے حیرت اس بات پر تھی کہ نوروز اتنی خاموشی سے یہ سب کیسے سنتا جا رہا ہے۔ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوتی صائمہ نے اسے دیکھا تو شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

''امی! آپ خوامخواہ اسے بہکا رہی ہیں۔ بہتر ہے، اس کا دماغ مزید خراب نہ کریں۔''

''لو بھئی، نئی بات سنو، میں کیوں بہکانے لگی اسے، وہ خود سمجھدار ہے جانتا ہے سب، پوچھو نوروز سے جو میں نے ایک بات بھی جھوٹ کہی ہو۔'' خالہ تنک کر بولی تھیں۔

''بہر حال جو بات بھی ہے، تم لوگ چائے پیو اور گھر جانے کی تیاری کرو۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی تھی۔

''میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔'' نوروز کے انداز میں ہٹ دھرمی تھی۔

''وجہ۔۔۔؟''

''اس گھر میں مجھے ہمیشہ تیسرے درجے کا فرد سمجھا گیا ہے۔''

''بکواس کر رہے ہو تم یہ سراسر تمہارے دماغ کا خلل ہے یا شاید پھر امی کی باتوں کا اثر۔ میں خود وہاں آتی جاتی رہتی ہوں۔ میں نے کبھی کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی۔ گھریلو ذمہ داریاں ادا کرنے سے انسان تیسرے درجے کا فرد نہیں بن جاتا۔ ہر مہینے دو چار بل جمع کروا دینے، بچوں کے اسکول میں حاضری دینے سے تمہارے عزت و وقار میں کمی نہیں آسکتی۔ وہ تمہارے تایا ابا اپنے محکمے میں انیسویں گریڈ کے آفیسر ہیں لیکن لان کی کاٹ چھانٹ وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ بچوں کو اسکول چھوڑنا، لڑکیوں کو کالج پک اینڈ ڈراپ کرنا، ہر ماہ سودا سلف کی خریداری۔ گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت، کبھی کسی باتھ روم میں پانی نہیں آرہا۔ کبھی کسی کمرے کا فیوز خراب، کون کرتا ہے یہ سب کام؟ وہی ارسل بھائی، وہی شیری اور وہی اظفر۔ تم ایسا کون سا گرا پڑا کام کرتے تھے جو تمہیں تیسرے درجے کا فرد سمجھا جاتا ہے۔ تم ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہو۔ عالی شان کمرے میں رہتے ہو، اس گھر کی سب سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہو، میں نہیں مان سکتی کہ تمہارے ساتھ کوئی امتیازی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ گھر چھوڑنے کی اور کوئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ نہیں جو تم بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

صائمہ بہت صاف اور کھری لڑکی تھی۔ لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہ تھی۔ سو صاف صاف کہہ دیا۔ نوروز سر جھکائے کتنے ہی لمحے یونہی بیٹھا رہا۔

''تم میرے یہاں آنے پر خوش نہیں ہو۔۔۔؟'' تھوڑی دیر بعد وہ گویا ہوا تھا۔

''تم نے ایسا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس پر میں خوشی سے نہال ہو کر تمہیں تمغے پہنانے لگوں۔'' صائمہ نے سپاٹ انداز میں کہتی نیا کا ہاتھ پکڑے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

نوروز لب کاٹتے ہوئے سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

''ارے یہ تو بے وقوف ہے۔ تم اطمینان سے اسے اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہو۔ جتنے دن تمہارا دل چاہے۔'' خالہ نصرت نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں چارپائی پہ نیم دراز ہو کر چھت کی کڑیاں گننے لگا تھا۔

☆☆☆

زیست کی راہ پہ گزرے ہوئے کچھ لمحوں میں
ہم نے چاہا تھا تیرے ساتھ چلیں
تیرے ہونٹوں پہ ہنسی
آنکھ میں جگنو بن کر
دل کی دھڑکن میں سما کر
تجھے جیتا دیکھیں
تیرے خوابوں کو سجا لیں
اپنی ان آنکھوں میں
تیرے چہرے کی اداسی کو
خوشی میں بدلیں
اور کچھ رنگ بھی بھر دیں
تیرے روز و شب میں
پھر تجھے رنگ بہاروں کے چراتا دیکھیں
زیست کی راہ پہ گزرے ہوئے
کچھ لمحوں میں
ہم نے چاہا تھا

''صائمہ میری دوست تھی، بہت اچھی دوست۔ میری پوری زندگی میں وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو چاہتی تھی کہ میں اپنے دل کی بات اس سے بیان کروں۔ اپنی خوشی، اپنا غم اس کے ساتھ بانٹوں۔ میں اس کے پاس بیٹھتا تو وہ بہانوں بہانوں سے مجھے بولنے پر مجبور کرتی۔ میں اداس ہوتا تو مجھے ہنسانے کو، اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتی۔ کبھی میرا کوئی چیز کھانے کو دل چاہتا تو میں سیدھا صائمہ کے پاس آتا، کسی مہینے میرا جیب خرچ وقت سے پہلے ختم ہو جاتا تو میں ہمیشہ صائمہ کے پاس بھاگا آتا۔ ایسا نہیں کہ اس گھر سے مجھے محبت نہیں ملی، ضرور ملی، مگر میں جس پناہ کا متلاشی تھا، وہ مجھے نہیں مل سکی تھی۔ سویرا بہت چھوٹی تھی، تائی اماں اسے چوبیس گھنٹے گود میں لیے پھرتیں۔ میں بھی ایسی ہی گود چاہتا تھا جس میں منہ چھپا کر سو رہوں تو مجھے کوئی فکر، کوئی اندیشہ لاحق نہ ہو مگر میں ایسی گود سے محروم

ہی رہ گیا۔ میں اپنی ذات میں پناہ لینے کا عادی ہو چکا تھا اور ایسے میں صائمہ کا رویہ مجھے وہ محفوظ پناہ گاہ فراہم کرتا تھا یہ مجھ سے کئی سال بڑی تھی کسی ماں کی طرح میرا خیال رکھتی کسی بہن کی طرح مجھ سے لاڈ اٹھواتی اور کسی دوست کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی۔

پھر صائمہ کی شادی ہو گئی اور میں بہت رویا تھا یہ سوچ کر کہ میری دوست مجھ سے چھین جائے گی۔ میری پناہ گاہ مجھ سے دور ہو جائے گی۔

مگر پھر یوں ہوا کہ چند ماہ بعد یہ دوبارہ یہاں آ گئی اور میں بہت خوش ہوا گویا مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں پہلے کی طرح صائمہ کے پاس بھاگا چلا آتا مگر صائمہ بہت بدل گئی تھی۔ یہ ہنستے ہنستے ایک دم رونے بیٹھ جاتی۔ باتیں کرتے کرتے اپنے خیالوں میں کھو جاتی اور میں افسردہ سا واپس لوٹ جاتا اور جب تک اسے طلاق نہیں ہوئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کبھی صائمہ سے شادی کے بارے میں سوچوں گا لیکن اس دن میں نے اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔ صائمہ کی آنکھ میں آنسو دیکھنا میرے لیے کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ سو مجھے واحد حل یہ ہی نظر آیا کہ میں صائمہ سے شادی کر لوں۔ مجھے اس سے کوئی افلاطونی قسم کا عشق نہیں تھا۔ نہ ہی اسے ہمدردی کہہ سکتے ہیں۔ بس میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا، بالکل پہلے کی طرح کہ وہ ہنسے تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔

اور جب میں نے تائی اماں سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بتایا، تایا ابا نایاب کو میرے لیے مانگ چکے ہیں۔ میں بھی ان سے ضد نہیں کرتا تھا۔ ان کے کسی فیصلے سے انحراف کی مجھے کبھی جرات ہی نہیں ہوئی تھی۔ سو یہاں بھی میں بہت آسانی سے ہار گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے مجھ کو بہت ڈرا دھمکا کر رکھا ہو مگر ایک ایسی ان دیکھی دیوار تھی جو مجھے میری اپنی قائم کردہ حدود سے آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی تھی۔

سو تم میری زندگی میں چلی آئیں اور میں نے ہمیشہ کی طرح سر جھکا دیا۔ تمہیں قبول کر لیا اور اس روز تایا ابا نے کہا تھا۔

''سلیمان واپس آ رہا ہے ہمیشہ کے لیے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے آتے ہی صائمہ اور سلیمان کا نکاح کر دیا جائے گا۔''

اور یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی تھی۔ صائمہ کو اس گھر میں آنا ہی تھا تو میرے حوالے سے بھی آ سکتی تھی۔ مگر ان سب لوگوں نے یہ بات ثابت کر دی وہ اپنے فیصلے مجھ پر ٹھونس کر ہمیشہ کے لئے مجھ پر حاوی رہنا چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے انہیں کبھی کوئی ٹھیس پہنچائی ہو پھر نجانے انہوں نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے۔'' نوروز کہتے کہتے جیسے تھک سا گیا تھا۔

نیا چپ چاپ بیٹھی تھی یہ سب باتیں سننے کے دوران اور سننے کے بعد اس نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

تب ہی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا، وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر چونک گئے، اندر داخل ہونے والی صائمہ تھی۔ جس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی غیر معمولی تھی۔ وہ چلتی ہوئی سیدھی نوروز کے پاس آ رکی تھی، کچھ لمحے یونہی اسے گھورتی رہی۔ نوروز قدرے حیرت کے ساتھ اسے دیکھنے لگا تھا۔

''تمہارے تایا ابا مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' اس اچانک انکشاف نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

''کب۔۔۔؟''

''تمہاری شادی کے فوراً بعد۔۔۔''

''وہ میرے لیے سلیمان کا پرپوزل لے کر آئے تھے اور سلیمان سے شادی کے لیے میں نے خود ہاں کی تھی۔'' وہ بہت نارمل سے انداز میں بتا رہی تھی۔ نیا کی نظروں نے بہت خاموشی سے نوروز کے چہرے کو کھوجا تھا۔

''ابھی تک امی بھی اس بات سے بے خبر ہیں۔'' صائمہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔

''تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ ابھی کچھ دیر قبل میں غیر ارادی طور پر اندر آتے ہوئے تمہاری بات سن چکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ۔ تمہیں معلوم ہے، نوروز! مجھے طلاق کیوں ہوئی تھی؟''

اس نے سوال کیا تھا مگر نوروز کے پاس گونگی چپ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

''مجھے اس لیے طلاق ہوئی تھی نوروز کہ میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔ میں ایک بانجھ عورت ہوں۔ بنجر زمین کا ایک ایسا ٹکڑا جس پر لاکھ بارش برساؤ، پھول نہیں اگتے۔ میرا وجود ایک صحرا ہے نوروز! ریت ہی ریت بھری ہے میرے اندر۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

نیا کا دل کٹ کر رہ گیا تھا اور نوروز نے کسی گہرے صدمے سے چور ہو کر آنکھیں میچ لی تھیں۔

''ہر انسان اپنی نسل آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ فاروق کی بھی یہی خواہش تھی کہ اس دنیا میں اس کا کوئی وارث ہو مگر ڈاکٹری رپورٹ نے بہت جلد ثابت کر دیا تھا کہ میں اسے کبھی یہ خوشی نہیں دے سکتی، کبھی بھی نہیں۔'' صائمہ کی آنکھوں میں آنسو ایک لکیر کی صورت بہنے لگے تھے۔

''اس بات کی خبر میری ماں کے بعد صرف تمہارے تایا ابا کو تھی۔ فاروق سے علیحدگی کے بعد ان کی پوری کوشش رہی تھی کہ وہ مجھ میں اور فاروق میں مصالحت کروا سکیں۔ تب مجبوراً انہیں یہ بات بتانی پڑی۔ یہ جرم میرا نہیں، یہ گناہ میں نے نہیں کیا مگر میں سب سے چھپتی پھر رہی تھی۔ میں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی، لوگوں کی ترحم بھری نظریں، نام نہاد ہمدردیاں، ان سب کا سامنا کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا، میں اپنی زندگی سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ امی نے ہزار بار چاہا کہ مجھے ایک بار پھر کسی کے پلے باندھ کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیں۔ مگر میرے لیے اب یہ ناممکن تھا میں اپنی قسمت کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کر چکی تھی تب تمہارے تایا ابا چلے آئے، انہوں نے کہا تھا۔

''میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا، بس ایک آپشن دے کر جا رہا ہوں۔ اس پر غور ضرور کرنا، سلیمان کے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری سونی گود بھی بھر جائے گی اور سلیمان کا گھر بھی بس جائے گا۔''

اور ہنستے کھلکھلاتے بچے کسے اچھے نہیں لگتے نوروز! مجھے تو یوں لگا جیسے میں پیاس سے مری جا رہی تھی اور کسی نے پانی سے لبالب بھرا پیالہ میرے لبوں سے لگا دیا ہو۔ میں نے تو سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی اسی وقت ہاں کر دی۔ اب بتاؤ نوروز! کیا میں نے غلط کیا یا تمہارے تایا ابا نے تمہارے

ساتھ دھوکا کیا۔۔۔؟ انہوں نے تو تمہارے لیے بہتر سوچا۔ نایاب جیسی بیوی مل گئی تمہیں۔ ان سب سے ٹکرا لے کر میرا ہاتھ تھامتے تو بیچ رستے میں تھک کر گر جاتے۔ نہ واپسی کا راستہ کھلا ملتا نہ ساتھ چلنے کا یارا رہتا، اب کم از کم ہمارے پاس چلنے کے لیے اپنی اپنی راہیں تو موجود ہیں نا؟''

صائمہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ کمرے میں اس کے سوا دو نفوس تھے اور دونوں ہی اس لمحے ساکت۔۔۔ وہ طویل سانس لیتی وہاں سے اٹھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کافی دیر بعد نیا نے سر اٹھا کر دیکھا، نوروز کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہ لگ رہا تھا۔ یہ انکشاف ہی ایسا تھا کہ خود نایاب بھی حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ ایک بہت مطمئن سی سانس لیتے ہوئے اس نے چادر اوڑھی اور اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ کمرے میں تاریکی اور خاموشی لحہ بہ لحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

گھر میں پھیلا سناٹا ایسا ہولناک تھا کہ سدرہ کو وحشت سی ہونے لگی تھی سب کے بند کمروں پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر وہ پچھلے برآمدے میں آ گئی تھی۔ وہاں انیقہ کو دیکھ کر اسے کافی تسلی ہوئی تھی۔

''میں سمجھی شاید تم بھی سو رہی ہو گی۔''

''اتنی گرمی میں نیند کہاں آتی ہے۔۔۔؟'' وہ اپنے گرد رسالوں کو ڈھیر لگائے بیٹھی تھی مگر سب کے سب بند پڑے تھے۔

''نیا کتنی یاد آتی ہے نا۔۔۔؟ میرا دل چاہتا ہے کسی روز اس سے ملنے چلیں۔''

''ہوں۔'' سدرہ نے مختصراً کہا تھا۔ اس کی نظریں آم کے درخت تلے ہلکورے لیتے جھولے پر ٹک گئی تھیں۔ نجانے کتنے دن ہو گئے تھے انہیں گئے ہوئے۔ مگر ان لمحات کو یاد کر کے اب وہ بھی افسردہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد جیسے سارے گھر کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ تایا ابا لڑکھڑاتے ہوئے جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ تائی اماں نے وہیں تخت پہ بیٹھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ باقی سب گم سم ہو گئے تھے اور سویرا کو ایسی چپ لگی تھی کہ اظفر کی ہزار باتوں کے جواب میں بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ اس دن سے یہ جھولا یونہی خالی ہلکورے لیتا رہتا تھا۔ کبھی شام کو بچے جھولنے لگتے مگر گرمی سے گھبرا کر جلد ہی بھاگ لیتے۔

صرف دو افراد کے چلے جانے سے پورے گھر میں ویرانی سی پھیل گئی تھی۔ اس دن کے بعد کئی مرتبہ بارش ہوئی تھی مگر سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے۔ وہ چاروں سوگوار انداز میں بیٹھی لگا تار برستی بارش کو دیکھتی رہیں۔

مست ہوائیں، پھلوں سے لدے درخت، پھولوں سے بھری ٹہنیاں اور زمین کی پیاس بجھاتے بارش کے چھوٹے بڑے قطرے سب کچھ وہی تھا۔ بس وہ ایک سرخوشی جو پہلی بارش پہ جسم کے روئیں روئیں میں پھوٹ رہی تھی مفقود تھی۔ اس کی جگہ اداسی تھی جو بارش کے ہر قطرے کے ساتھ

دلوں پر برس رہی تھی۔

''اور اب تو ساون بھی ختم ہونے کو آیا ہے۔ اللہ جانے کس روز آخری بارش ہو اور یہ مہینہ ہمیں اگلے سال تک کے لیے انتظار سونپ کر چلتا بنے۔''

''اسکنجبین پیو گی؟'' انیقہ کی آواز پر سدرہ چونکی۔

''ہاں۔''

''ٹھہرو، میں برف ڈال کر لاتی ہوں۔ تھوڑی گرم ہو گئی ہے۔'' انیقہ قریب پڑا جگ اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

سدرہ برآمدے کے ستون سے لپٹی بوگن ویلیا کے آتشی پھولوں کو ایک ایک کر کے زمین پہ گرتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

نیا کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔ نوروز گھر پہ نہیں تھا، سو صائمہ اسے ساتھ لے کر لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ واپسی ہوئی تو نوروز بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''خیریت تو تھی؟ اتنی دیر لگا دی تم لوگوں نے۔''

''میں نے اسے پہلی مرتبہ کسی کے لیے اتنا فکر مند ہوتے دیکھا ہے۔'' صائمہ نے سرگوشی کی تھی مگر وہ کھل کر مسکرا بھی نہ سکی تھی۔

''نوروز! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے مجھ سے سنو گے یا نیا سے۔۔۔؟'' صائمہ شوخی پر اتری ہوئی تھی، نوروز نے تھکی سی نیا کو کمرے کی طرف جاتے دیکھا اور پھر صائمہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم ہی بتا دو۔''

''تمہارے آنگن میں بہت جلد ایک پھول کھلنے والا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔''

''کیا واقعی؟'' وہ قدرے جھینپتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ صائمہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مسکراہٹ دباتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔۔؟ کیا صائمہ سچ کہہ رہی ہے۔۔۔؟''

''ہاں، اللہ نے ہم پر اپنا بڑا کرم کیا ہے۔ ورنہ صائمہ کے بارے میں جان کر تو مجھے دھڑکا سا ہی لگا رہتا تھا۔'' اس نے معصومیت سے دل کی بات کہہ دی تھی۔ نوروز نے دیکھا، وہ کافی بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔

''نایاب! تم مجھے خوش نہیں لگ رہیں۔'' وہ بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ نایاب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

''نوروز! میں یہ خوش خبری ان لوگوں کو سنانا چاہ رہی تھی جو شاید یہ خبر سن کر ہم سے بھی زیادہ

خوش ہوتے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ نوروز اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

''نوروز! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے جیسے التجا کی تھی۔ نوروز نظریں چرا گیا۔

''یہ بھی گھر ہی ہے۔'' اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

''نہیں نوروز! میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے بے تاب ہو کر اس کا بازو تھام لیا تھا۔

''یہاں بہت اجنبیت ہے۔ در و دیوار اجنبی، غیر آسمان، نا آشنا پھول پتے مجھے یہاں چین نہیں ملتا۔ نوروز! میں یہاں اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتی۔ کھا پی نہیں سکتی اور وہ خالہ نصرت کی عجیب و غریب باتیں، پتا نہیں کیسی ذہنیت ہے ان کی۔ میرے لیے تو سانس لینا مشکل ہونے لگا ہے یہاں۔'' وہ خوامخواہ ہی رونے لگی تھی۔

''تم خوامخواہ ٹینس۔۔۔''

''خوامخواہ نہیں نوروز! تم سمجھتے کیوں نہیں کہ مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے، جو مجھے صرف وہیں مل سکتا ہے، جہاں سب میرے اپنے ہیں، مجھے چاہنے والے، مجھ سے محبت کرنے والے، آخر تم یہ کیوں نہیں مان رہے کہ تم غلطی پر تھے غلط فہمی بہت معمولی سی تھی مگر تمہارا ردِعمل بہت شدید تھا اور اب تم وہاں جانے سے خوف زدہ ہو کہ کہیں وہ لوگ تمہیں دھتکار نہ دیں۔'' وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

''ان لوگوں کا سامنا کرنا کچھ ایسا آسان نہیں، اس روز میں نے جو کچھ کہا۔ اب سوچتا ہوں تو خود سے نظر نہیں ملا پاتا۔'' اس کی آواز پست تھی۔

''مجھ جیسے لوگوں کا یہ ہی تو المیہ ہوتا ہے نایاب! ہم لوگ اپنی ذات کے اندر جیتے ہیں، اپنی ذات کے اندر مر جاتے ہیں۔ دوسروں سے رویے برتنے کا سلیقہ نہیں آتا اور جب وقت گزر جاتا ہے تب ہم پچھتاتے ہیں۔'' وہ اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

''ابھی وقت نہیں گزرا ہے نوروز! ابھی تمہاری غلطی پچھتاوا بن کر تمہاری زندگی میں شامل نہیں ہوئی۔ ابھی تو تلافی کی بہت گنجائش ہے۔ ہم واپس چلتے ہیں نوروز! میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں آپ کو، آپ کی ذات میں مقیّد نہیں رہنے دوں گی۔ چلیں، ہم واپس چلتے ہیں۔'' وہ اسے آمادہ دیکھ کر منت سماجت پہ اتر آئی تھی۔

''جائیں گے نیا! ہمیں لوٹ کر وہیں تو جانا ہے بس تھوڑا انتظار اور۔۔۔''

''دیکھ لینا نوروز! یہ تھوڑا سا انتظار حسرت میں نہ بدل جائے۔'' وہ انجانے واہموں کا شکار ہو رہی تھی۔

''خدا نہ کرے۔'' نوروز کی بے ساختگی نے نیا کے دل و جان میں طمانیت سی دوڑا دی تھی۔

☆☆☆

آج بہت دنوں بعد ہوا شوخی پر اتری تھی، پھول پتے سب ترنگ میں تھے اِکا دُکا بادل بھی آسمان پر دکھائی دے رہے تھے۔ محکمہ موسمیات کی طرف سے بارش کی پیشن گوئی بھی کی گئی تھی۔ اظفر

گھر میں داخل ہوا تو انیقہ بڑی حسرت سے آسمان پر چھاتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ سدرہ تخت پر لیٹی زمین پہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''دل دکھ رہا ہے۔۔۔؟'' وہ سیدھا انیقہ کے پاس آ کر رکا تھا۔

''شاید یہ ساون کی آخری بارش ہو۔'' وہ بہت دل گرفتہ لگ رہی تھی۔

''میں سچ کہتی تھی نا، یہ رائٹرز واقعی بہت جھوٹ لکھتی ہیں، ناولوں، افسانوں میں ساون کی بارش ڈھیر ساری خوشیاں لاتی ہے۔ ایک یہ ہمارا ساون ہے، ہماری اولین بارش میں ہی دکھ کی سوغات سے جھولی بھر گیا۔'' وہ شکوہ کناں نظروں سے سرمئی بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا خیال ہے، آج تھوڑا بہت اہتمام نہ کر لیا جائے۔'' اظفر نے سرسری سے انداز میں کہا۔ مگر سدرہ اچھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''ہرگز نہیں۔ اس روز اہتمام کر کے دیکھ لیا تم نے، آخری بارش ہے کل بھادوں کا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ اسے بھی یونہی برس جانے دو ہم کسی اور کو نہیں کھونا چاہتے۔'' سدرہ کی آواز بھرّا گئی تھی۔

اظفر چلتا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔

''بے وقوف ہو تم۔ ایک دو کے چھن جانے کا غم منا رہی ہو، یہ جو اتنے سارے تمہارے آس پاس ہیں۔ ان کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ سویرا کا ہی سوچو، اس روز سے کمرے میں بند پڑی ہے۔ وہ میری بیوی ہی نہیں یار! تمہاری بہن بھی ہے، اسے بہلانے کے لیے ہی تھوڑا اہلّا گلّا کر لو اٹھو شاباش۔'' اس کے بے حد اصرار پر وہ دونوں بے دلی سے اٹھ گئی تھیں۔

''اور ویسے بھی سنا ہے، ساون کی بارش میں کھوئے ہوئے لوگ مل بھی جاتے ہیں۔'' اس کی آخری بات پر دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟'' وہ کندھے اچکا کر رخ موڑ گیا تھا۔

ذرا سی کوشش کے بعد وہ معیز اور مہران کو بھی متحرک کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ معیز کو اس کی ذمہ داری سمجھاتے ہوئے منڈی کی طرف دوڑا دیا۔ بچوں کو باقی لڑکیوں کو باہر نکالنے کا کام سونپ دیا۔ انہوں نے بیٹ اور ہاکیوں سے دروازے کھٹکھٹا کر ان کا ناک میں دم کر دیا اور انہیں اپنے کمروں سے نکلتے ہی بنی۔

نوروز اور نایاب گھر میں داخل ہوئے تو دونوں کی کیفیات مختلف تھیں۔

نایاب کی چال میں تیزی تھی، اعتماد تھا، خوشی تھی جبکہ نوروز جھجک رہا تھا۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ شرمندگی ہر آن اس کے قدموں سے لپٹی جا رہی تھی۔ گھر کا ماحول اور فضا بالکل وہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ پانیوں سے بھرے سیاہ بادل دن میں بھی رات کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ پکوان تلنے کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سامنے والے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تو ہوا کا زوردار جھونکا برآمدے کے شیڈ پہ پھیلی بوگن ویلیا کے سرخ پھولوں کا ایک ڈھیر ان پر نچھاور کر گیا تھا۔ نیا نے یوں کھلکھلا کر اس کی طرف دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''دیکھو، اس گھر کی ہوائیں بھی ہمیں کس طرح خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔''

وہ لوگ لاؤنج میں آ گئے جو اس وقت بالکل خالی تھا۔ تب ہی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی

چاپ سنائی دی تھی۔ نوروز ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ نجانے کس کا سامنا سب سے پہلے کرنا ہو گا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا تھا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے سویرا ٹھٹک کر رک گئی۔ ویران آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے تذبذب کے عالم میں اسے دیکھتی رہی تھی۔

"سنو! سویرا سے سامنا ہو تو اس سے اپنی بہن کی حیثیت سے نہیں میری بیوی کی حیثیت سے ملنا۔ اپنی بہن کو تو ہو سکتا ہے، تم کبھی معاف نہ کر سکو لیکن سویرا اظفر اپنی غلطی کا اعتراف شادی کی پہلی رات ہی میرے سامنے کر چکی ہے اور میں یہ قطعی برداشت نہیں کروں گا کہ جس غلطی کو میں بھول چکا ہوں، کوئی دوسرا اسے بار بار دہرائے۔" اظفر کی کچھ دیر پہلے کہی گئی بات اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

"سویرا! اپنے بھائی سے ملو گی نہیں؟" یہ اس کے اپنے درمیان موجود رشتے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ سویرا آگے بڑھی تھی۔ رکی تھی، ٹھٹکی تھی اور پھر بھاگ کر اس کے سینے میں سما گئی تھی۔

"نوروز بھائی! میں نے۔ میں نے آپ کو بہت مس کیا تھا۔" وہ بھل بھل آنسو بہانے لگی تھی۔

"ہاں، مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھے مس کیا ہو گا۔ بہنوں کے جذبات میں کھوٹ نہیں ہوتا۔"

"آپ پہلے تایا ابا سے مل لیں، آپ کے جانے کے بعد سے وہ بہت دکھی ہیں۔" سویرا نے کہا تو وہ تایا ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"تم کل ہی وہاں چلی جانا۔ یہ اس کی ماں کی جائیداد کے کاغذات ہیں جو چھ سالہ مقدمے کے بعد میں اس کے سوتیلے بھائیوں سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور یہ فائل ان تمام شیئرز پر مشتمل ہے جو مختلف کمپنیوں میں، میں نے اس کے نام سے خرید رکھے تھے۔ اسی میں اس کے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات بھی درج ہیں۔ اگر وہ کبھی کاروبار کے معاملے میں سنجیدگی ظاہر کرتا تو یہ سب باتیں میں خود اسے سمجھاتا مگر اب تم یہ فائلیں اسے دے دینا۔ وہ ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا اور میں اسے مجبور نہیں کروں گا۔"

تایا ابا کی آواز بھاری پڑ گئی تھی۔ باہر دروازے پر کھڑے نوروز کا دل ڈوب ڈوب گیا۔

"آپ تو خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں میں خود اسے جا کر لے آؤں گی بچہ اگر کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو تیار ہو تو کیا ہم اسے لگانے دیں۔ ہرگز نہیں میں اسے سمجھاؤں گی۔ وہ سمجھ جائے گا۔ جانتی ہوں اسے اچھی طرح سویرا کے معاملے کی وجہ سے پریشان تھا اوپر سے بیماری نے چڑچڑا کر رکھا تھا اسی لیے اول فول بکنے لگا تھا۔"

تائی اماں اس کی صفائیاں پیش کر رہی تھیں۔

"ان فرشتہ صفت لوگوں کا دل دکھایا تم نے تف ہے تم پر۔" اس نے خود پر لعنت بھیجی عین اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ رہی چند لمحے تک سامنے خاموشی چھائی رہی پھر تایا ابا کی آواز ابھری۔

"اندر آ جاؤ۔" اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ اسے تایا ابا کے ہونٹوں پر مبہم سی

مسکراہٹ کا شائبہ ہوا تھا۔

"سنبھالو اسے۔۔۔ آ گیا ہے تمہارا شہزادہ۔ جی تو چاہتا ہے، کان سے پکڑ کر دو جوتے لگاؤں۔ لیکن شادی شدہ ہو گیا ہے، اس لیے لحاظ کر گیا ہوں۔" تایا ابا کی آواز خوشی کے تمام رنگوں سے ہم آہنگ تھی۔ اس کی آنکھ میں آنسو چلے آئے۔

"تایا ابا! میں۔"

"بس، بس۔۔۔ محبت اور خلوص کی پہچان کرنا سیکھو برخوردار! یہ جذبے اتنے سستے نہیں کہ جب دل چاہا، ٹھوکر مار کر چلتے بنے۔" وہ کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے تھے۔

"سوری تایا ابا۔" وہ پیچھے سے جا کر کسی بچے کی طرح ان سے لپٹ گیا تھا۔

"آؤ ادھر دیکھو ذرا، یہ سب لوگ تمہارے بغیر کتنے اداس ہیں۔" انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے برابر لا کھڑا کیا۔ عقبی لان کا منظر واضح تھا، خالی جھولا۔ آم کے پیڑ کے نیچے بارش کی کن من سے بے نیاز اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی سدرہ۔ پریشان گم سم سے معیز اور مہران نہ کوئی اچھل کود نہ کوئی شور ہنگامہ۔

"جاؤ بیٹا! جا کر ان سب لوگوں کو ان کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹا دو۔"

تائی اماں نے آ کر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر کی طرف پلٹا۔ سویرا اور نیا ابھی تک اس کی واپسی کا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھا تو پہلے ہی عقبی لان کی طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ذرا سی دیر میں لان عجیب و غریب چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ عین اسی لمحے چھپاک کی آواز سنائی دی۔ وہ ہونق سا بنا کھڑا تھا اور رنگ دار پانی اس کے کپڑوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ اظفر اس کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔

"تم گدھے! الو۔"

"اور، اور۔" اظفر ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ عین اسی وقت بادل گرجا تھا اور ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی تھی کہ معیز اور مہران چیخ اٹھے تھے۔

"نوروز بھائی کی گالیوں نے کام کر دکھایا۔" وہ لوگ اسے کھینچ کھانچ کر بارش میں لے گئے تھے۔ اوپر کھڑکی میں کھڑے تایا ابا اور تائی اماں اپنے آنگن میں ابھرتی ان کی چہکاریں سن رہے تھے اور ان خوشیوں کو بری نظر سے محفوظ رہنے کی دعا کر رہے تھے۔

لان کا منظر بہت مسحور کن تھا۔ دھواں دھار برستی ہوئی بارش اٹھکیلیاں کرتے بچے۔ آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا جھولا، سارے لان میں رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ شہلا اور سویرا، اظفر کے ساتھ آم کھانے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ خود کو ہارتے پایا تو آموں کی ساری گٹھلیاں اس کی گود میں پھینک کر وہ بارش میں آ کر کِکلی ڈالنے لگیں۔

تائی اماں گیس کا چھوٹا سا چولہا اٹھا کر برآمدے میں لے آئیں اور بارش کی ہلکی پھوار کا مزا لیتے ہوئے پوڑے تلنے لگیں۔ چھوٹی چچی اپنے سُر درست کر چکی تھیں۔ پوڑے تلتے ہوئے وہ بڑی موج میں گا رہی تھیں۔

ساون برسے
ساون برسے
رستوں پر کہرا لہرائے
مینا، مور، پپیہا گائے
مست پون کے جھونکے آئیں
تجھ بن سنگی، میں بے رنگی
کیسے نکلوں گھر سے
ساون برسے

ساون میں بھیگے خوشیوں کے تمام رنگ مکمل تھے۔

☆☆☆☆☆☆